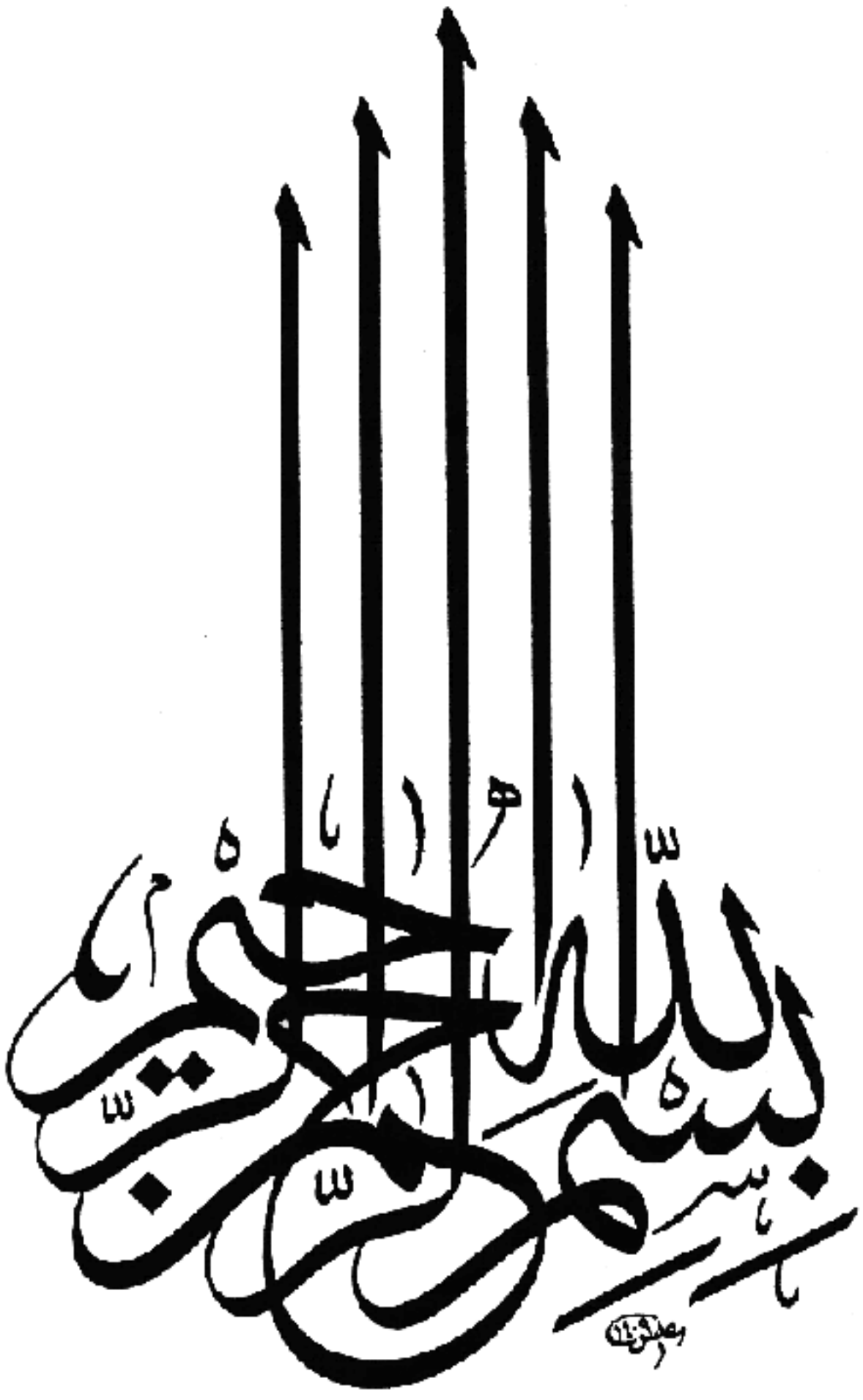

بسم الله الرحمن الرحيم

اُردو مضمون نگاری کا ارتقاء

(۱۹۰۰ء تا ۱۹۴۷ء)

مقالہ نگار:

صفیہ مشتاق

نگران مقالہ:

ڈاکٹر محمد ہارون قادر

شعبۂ اُردو

جی سی یونیورسٹی، لاہور

اُردو مضمون نگاری کا ارتقاء

(۱۹۰۰ء تا ۱۹۴۷ء)



نام: صفیہ مشتاق

رجسٹریشن نمبر

4	8		G	C	U		PhD		U	R	D	U	-	0	6

شعبۂ اُردو

جی سی یونیورسٹی، لاہور

اُردو مضمون نگاری کا ارتقاء

(۱۹۰۰ء تا ۱۹۴۷ء)

یہ مقالہ پی ایچ۔ڈی کی تکمیل کے سلسلے میں جی سی یونیورسٹی، لاہور کو سند عطا کیے جانے کے لیے پیش کیا گیا۔

پی ایچ۔ڈی

مضمون

اُردو

نام: صفیہ مشتاق

رجسٹریشن نمبر

4	8	■	G	C	U	■	PhD	■	U	R	D	U	-	0	6

شعبۂ اُردو

جی سی یونیورسٹی، لاہور

تصدیق برائے تکمیل مقالہ

تصدیق کی جاتی ہے کہ زیرِ نظر مقالہ بعنوان:

''اُردو مضمون نگاری کا ارتقاء (۱۹۰۰ء تا ۱۹۴۷ء)''

صفیہ مشتاق رجسٹریشن نمبر 48-Ph.D-GCU-URDU-06 نے پی ایچ۔ ڈی کی سند حصول لئے میری زیرِ نگرانی مکمل کیا۔

تاریخ:----------

نگران مقالہ

ڈاکٹر محمد ہارون قادر

شعبۂ اُردو

جی سی یونیورسٹی، لاہور

بتوسط:

ڈاکٹر شفیق عجمی

صدر شعبۂ اُردو

جی سی یونیورسٹی، لاہور

کنٹرولر امتحانات

جی سی یونیورسٹی، لاہور

اقرار نامہ

میں صفیہ مشتاق رجسٹریشن نمبر 48-Ph.D-GCU-URDU-06 اس بات کا اقرار کرتی ہوں کہ مقالہ میں پیش کیا جانے والا مواد بعنوان:

''اُردو مضمون نگاری کا ارتقاء (۱۹۰۰ء تا ۱۹۴۷ء)''

میری ذاتی کاوش ہے اور یہ کام پاکستان یا پاکستان سے باہر کسی بھی تحقیقی یا تعلیمی ادارے کی طرف سے شائع، طبع یا پیش نہیں کیا گیا۔

دستخط مقالہ نگار

تاریخ:----------

صفیہ مشتاق

انتساب

اپنی پیاری استانی جی،

پروفیسر ڈاکٹر تبسم کاشمیری، پروفیسر ڈاکٹر سلیم اختر

اور

مجھے تعلیم دینے والی دیگر تمام معلمات و معلموں

کے نام

فہرست

اردو مضمون نگاری کا ارتقاء

(۱۹۰۰ء تا ۱۹۴۷ء)

		صفحہ نمبر
	دیباچہ	الف تا ہ
باب اوّل:	اُردو میں مضمون نگاری کا آغاز	۱تا۳۱
باب دوم:	اُردو میں مضمون نگاری کی ابتدائی روایت	۳۲تا۶۴
باب سوم:	مضمون نگاری ۱۸۵۷ء سے ۱۸۹۹ء تک	۶۵تا۹۳
باب چہارم:	رسائل میں مضمون نگاری کا ارتقاء ۱۹۰۰ء سے ۱۹۳۶ء تک (موضوعات، مواد اور اسالیب کا مجموعی جائزہ)	۹۴تا۱۸۹
باب پنجم:	اُردو مضمون نگاری ۱۹۳۶ء تا ۱۹۴۷ء (جدید ادبی تحریکوں کے تناظر میں)	۱۹۰تا۲۳۶
باب ششم:	اُردو مضمون نگاری کے اہم اسالیب	۲۳۷ تا ۲۶۶
باب ہفتم:	اُردو مضمون نگاری کا مجموعی جائزہ	۲۶۷ تا ۲۷۹
ضمیمہ:	چند عکس ہائے سرورق (رسائل)	۲۸۰ تا
	کتابیات	تا

دیباچہ

تحقیق ایک مشکل مرحلہ ضرور ہے لیکن ناممکن نہیں ہے جو محققین تحقیق کرتے ہیں وہ جاں فشانی کے بعد گوہر نایاب ڈھونڈ لاتے ہیں۔ میرے مقالے کا موضوع ''اردو مضمون نگاری کا ارتقاء (۱۹۰۰ء تا ۱۹۴۷ء)'' ہے۔ زیرِنظر موضوع پر مواد تشنۂ تکمیل تھا جس پر یکسوئی سے تحقیق کی ازحد ضرورت تھی۔ اس لیے میں نے اس موضوع پر کام کرنے کا ارادہ کیا اور تحقیق کے جملہ اصول وضوابط بروئے کار لاتے ہوئے ممکنہ حد تک کامیاب ہونے کی بھر پور کوشش بھی کی ہے، لیکن اس موضوع پر مزید تحقیق کی گنجائش موجود ہے۔ کیونکہ یہ بات مسلمہ ہے کہ تحقیق میں کوئی بھی بات حرفِ آخر نہیں ہوتی۔ میرے مقالے کے موضوع کا انتخاب سابق چیر پرسن شعبہ اردو / پنجابی پروفیسر ڈاکٹر سہیل احمد خان نے کیا تھا۔ (اللہ انہیں جنت نصیب کرے۔ آمین)

زیرنظر مقالہ سات ابواب پر مشتمل ہے:

پہلے باب کا عنوان ''اردو میں مضمون نگاری کا آغاز'' ہے۔ اس باب میں مضمون نگاری کی تعریف اور اقسام پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

دوسرے باب کا عنوان ''اردو میں مضمون نگاری کی ابتدائی روایت'' ہے۔ اس باب میں دہلی کالج کے حوالے سے مضمون نگاری کا جائزہ لیا گیا ہے۔ دہلی کالج سے مضمون نگاری کا آغاز ہوا۔ ماسٹر رام چندر کے رسائل ''محبّ ہند'' اور ''فوائد الناظرین'' میں اس موضوع پر تذکرہ موجود ہے اور سرسری طور پر عہد سرسید پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ نیز ''انجمن پنجاب'' کے حوالے سے بھی جدید غزل اور نظم کے آغاز پر جو مضامین لکھے گئے ہیں ان کا جائزہ لیا ہے۔ اس ضمن میں مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا الطاف حسین حالی

کے مضامین کے ذریعے جدید غزل کے اصول وقواعد پر بات کی ہے۔

تیسرا باب ''مضمون نگاری ۱۸۵۷ء سے ۱۸۹۹ء تک'' میں سرسید احمد خان اور ان کے رفقائے کار کے کارہائے نمایاں پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔اس دور میں سرسید احمد خان کے ساتھ ساتھ دیگر مضمون نگاروں کی تخلیقات کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ساتھ ہی ''اودھ پنچ'' کے ذریعے ''ظرافت کا جو شعور عوام میں جاگا'' اس پر بحث کی گئی ہے۔

باب چہارم ''رسائل میں مضمون نگاری کا ارتقاء ۱۹۰۰ء سے ۱۹۳۶ء تک'' (موضوعات، مواد اور اسالیب کا مجموعی جائزہ) ہے۔اس باب میں انیسویں صدی کے رسائل کا جائزہ لیا گیا ہے۔اس دور میں رسائل کی ابتدا نے اردو ادب میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ذرائع ابلاغ کے اس حصے نے ملک کے طراف و اکناف میں لوگوں تک خبریں پہنچائیں۔ان میں سے کئی ایک رسائل رجحان ساز رسائل تھے۔ان رسائل کے ذریعے مختلف ادبی تحریکوں نے جنم لیا جن میں رومانوی تحریک، ترقی پسند تحریک اہم تحریکیں تھیں۔اس کے علاوہ کچھ رسائل میں دینی و مذہبی بحث و مباحث نظر آتے ہیں۔کچھ رسائل صرف تحقیق کے در وا کرتے ہیں جب کہ کچھ تنقید کے ذریعے ادبی فن پاروں کی قدر متعین کرنے میں کوشاں رہے۔بہرحال یہ بات طے ہے کہ ان تمام رسائل نے اردو زبان کی ترویج و تحفظ کے لیے بہت جدوجہد کی اور اس مقصد میں کامیاب ہوئے۔

باب پنجم ''اردو مضمون نگاری ۱۹۳۶ء تا ۱۹۴۷ء'' (جدید ادبی تحریکوں کے تناظر میں) ہے اس باب میں درجِ بالا تحریکوں کے حوالے سے تفصیلی بات کی ہے۔

باب ششم ''اردو مضمون نگاری کے اہم اسالیب'' ہے۔اس باب میں زبان کی ساخت اور زبان کے اسلوب کے حوالے سے بات کی گئی ہے۔اردو زبان نے کتنے اسلوبیات کی نشو و نما کی اور اسلوب کی کون کون سی اقسام ہیں اور ان اقسام کے تحت مضمون نگاری کے کون کون سے رجحانات سامنے آئے ان پر بحث کی گئی ہے۔

ساتواں باب ''اردو مضمون نگاری کا مجموعی جائزہ'' ہے۔اس باب میں ان سب ابواب کو پیش نگاہ رکھتے ہوئے تجزیہ کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی رائے بھی دی گئی ہے۔

عکس ہائے سرورق (رسائل) ضمیمہ میں لگائے گیے ہیں ۔مقالے کے آخر میں کتابیات درج ہیں۔زیرنظر مقالے میں جن کتب و رسائل اوردیگر مآخذ کو حوالے کا درجہ حاصل ہے انہیں کتابیات کے ضمن میں ترتیب سے پیش کردیا گیا ہے، یوں یہ مقالہ پایۂ تکمیل کو پہنچا۔

مقالے کے لکھنے اورمواد کی فراہمی کے لیے بہت سے علم دوست خواتین وحضرات سے میرا رابطہ رہا اورانہوں نے اپنی بھرپور مدد و تعاون سے مجھے شکریے کا موقع فراہم کیا۔سب سے پہلے احسان مندی کے پلڑے میں اپنی پیاری بہن ''صابرہ باجی'' کا شکریہ ادا کرتی ہوں جنہوں نے اپنی بیماری کو پس پشت ڈال کر میرے لیے وقت فراہم کیا اور میری جگہ میری گھریلو ذمے داریوں کو نبھاتی رہیں۔ظہور بھائی کا مہربان و شفقت بھرا تعاون بھی میرے حوصلے کو بڑھاتا رہا۔اپنی پیاری عائشہ باجی کی شکرگزار ہوں کہ وہ اسلام آباد سے فون کرکر کے مجھے کام کرنے کا حوصلہ دیتی رہیں اور دعائیں بھی کرتی رہیں۔میں اپنی بھابی اورتمام خاندان والوں کی بھی شکرگزار ہوں کہ ان کی مدد اورتعاون نے مجھے بہت حوصلہ اور ہمت بخشی۔اپنی بھانجی فرزانہ خان کا ''اسلام آباد آرکائیز'' سے بڑی محنت سے مواد فراہم کرنے پر شکرگزار ہوں۔اپنی پیاری استانی جی جنہوں نے مجھے کلام پاک پڑھایا۔(۸رفروری ۲۰۱۰ء میں اس جہان فانی سے ۸۳ برس کی عمر میں کوچ کرگئیں) ان کی دعائیں آج تک اس مقالے کی تیاری میں میرے لیے سائبان بنیں رہیں۔

پروین باجی، ریحانہ باجی، نزہت اورفرح ناز سمیت اپنے کالج کی تمام سہیلیوں اور گورنمنٹ کالج برائے خواتین (کوپر روڈ) لاہور کے عملے کی شکرگزار ہوں کہ انہوں نے ہرقدم پر میرا حوصلہ بڑھایا اور مجھے دعاؤں میں یاد رکھا۔

''عبدالحمید کھوکھر لائبریری'' کے جناب ضیاء اللہ کھوکھر کی شفقت بھری مدد بھی شامل حال رہی۔ بیدل لائبریری کراچی کے جناب زبیر اور جناب امان نے بھی عکس ہائے سرورق (رسائل) اورمواد کی

فراہمی کو یقینی بنا کر مجھے تہہ دل سے شکریہ کا موقع فراہم کیا۔ ہارون عثمانی صاحب نے پنجاب یونیورسٹی کی مین لائبریری کے عملے سمیت میری بہت مدد کی۔ جناب حنیف شاہد کی بھی تہہ دل سے شکرگزار ہوں کہ انہوں نے انجمن پنجاب کے رسائل مہیا کرکے میرے کام میں تحقیق کے کئی پہلو وا کیے۔

دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری، جی سی یونیورسٹی لائبریری، قائداعظم لائبریری، ایوانِ اقبال لائبریری، عجائب گھر لائبریری، اورینٹل کالج لائبریری، اسلامیہ کالج لائبریری کے عملے کی شکرگزار ہوں کہ وہاں میں نے بڑی سہولت سے کام کیا۔

پروفیسر ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے میرے خاکے کی نوک پلک سنواری اور ہر لمحہ مجھے اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا۔ پروفیسر ڈاکٹر سلیم اختر نے بڑے تحمل سے میری ہر بات سنی اور میرا حوصلہ بڑھانے کے ساتھ ساتھ بڑے خلوص سے بھرپور راہنمائی بھی کی۔ کمپوزنگ کرنے پر محمد اسماعیل بھائی کی بھی شکرگزار ہوں۔

ڈاکٹر محمد ہارون قادر اس مقالے کی تکمیل کے لیے میرے نگران مقرر ہوئے۔ میری درخواست پر انہوں نے اس ذمے داری کو قبول کیا۔ انہوں نے ہر مقام اور ہر لمحہ پر میری را ہنمائی کی، میں ان کے مشفقانہ رویے پر بہت شکرگزار ہوں۔ ڈاکٹر شفیق عجمی صاحب، چیئرپرسن شعبہ اُردو/ پنجابی کی بھی شکرگزار ہوں کہ انہوں نے میرے مقالے پر نظر ثانی کرتے ہوئے مفید مشوروں سے نوازا۔

مقالے کی تیاری میں مہربان اور ہمدرد ساتھیوں کا تعاون ہی کسی مقالے کی کامیابی کا ضامن ہوا کرتا ہے۔ میرے والدین کو رب العزت جنت الفردوس میں جگہ دے، ان کے لیے صرف اتنا کہوں گی۔

تربیت سے میں تیری انجم کا ہم قسمت ہوا
گھر میرے اجداد کا سرمایہ عزت ہوا

آخر میں صرف اتنا عرض کروں گی کہ رب العزت کے لطف و کرم اور نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ کی نظر عنایت کے طفیل ہی اس مقالے کو مکمل کرنے کے قابل ہو سکی۔

تمام خواتین و حضرات جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے اگرچہ میرے شکریے کے حق دار ہیں لیکن میں اپنے تئیں ان کی محبتوں اور شفقتوں کی مقروض ہوں۔ سبھوں نے مقالے کے حوالے سے میرے راستے

میں آسانیاں پیدا کر دیں،تو پھر میں صرف شکریہ کیسے ادا کر دوں؟ میں تو ہمیشہ سر سے پاؤں تک ان کی احسان مند اور مقروض رہوں گی۔

صفیہ مشتاق

اسسٹنٹ پروفیسر اُردو

گورنمنٹ کالج برائے خواتین (کوپر روڈ)، لاہور

باب اوّل

اُردو میں مضمون نگاری کا آغاز

اُردو میں مضمون نگاری کا آغاز

مضمون نگاری کا آغاز فرانسیسی مضمون نگار مونٹین کے تاثراتی مضامین سے ہوتا ہے لیکن موجودہ دور میں مضمون نگاری ایک صنف کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ شروع شروع میں مضمون میں صرف ایک ہی موضوع پر بات کی جاتی تھی۔ مضمون نگار کو مضمون لکھنے کی ضرورت اس لیے محسوس ہوتی ہے کہ وہ اپنے خیالات، اپنی فکر و سوچ اور اپنے مافی الضمیر سے قارئین ادب کو آگاہی دینے کے ساتھ ساتھ اُن میں سنجیدہ اور ہلکے پھلکے مضامین لکھنے کی روایت کو قائم کریں۔ اس ضمن میں مضمون کی تعریف کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ The Encyclopedia of America میں مضمون کی تعریف یوں کی گئی ہے:

"The essay as a literacy genre is very broad, covering many subforms a wide range of subject, and a variety of styles. The essay and artistically wrought and imaginatively developed worke of nonfiction many reveal an authors prosonality, express his sepeculations of life or events, or make a formal statement about his attitude to words a precise objective subject." (1)

جبکہ A.C. Benson مضمون نگاری کی تعریف کرتے ہوئے اپنے مضمون "The art of The essay" میں رقمطراز ہے:۔

"An essay is thing which someone does himself, and the point of the essay is not the subject, for any subject will suffice, but the charm of the personality."(2)

مضامین میں قلم کار اپنے ذاتی تاثرات کے ساتھ ساتھ زندگی کی پیچیدہ گتھیوں کو بھی سلجھاتے نظر آتے ہیں۔مونٹین Montaigne جو مضمون نگاری کا موجد ہے۔ان کے مضامین میں بھی زندگی کی پرکھ ملتی ہے اوریہ مضمو کسی ایک ہی موضوع پر مونٹین کے خیالات کی عکاسی کرتے ہیں۔

اُردو مضمون نگاری کی کوئی لگی بندھی تعریف موجود نہیں اورنہ ہی کوئی ایسی روایتِ مضمون ہے کہ جس سے مضمون نگاری کے مفہوم پر روشنی ڈالی جائے اس کے لیے ہمیں پرانے مضمون نگاروں کی طرف ہی رجوع کرنا ہوگا اُن کے مطالعہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اُردو میں مضمون نگاری کا آغازیوں تو سائنسی وعلمی مضامین سے ہوا، لیکن ہر دور میں مضمون کے موضوعات تبدیل ہوتے رہے اور آج مضامین کا دامن موضوعات کے حوالے سے وسیع ہے۔ ڈاکٹر طیبہ خاتون ''اُردو میں ادبی نثر کی تاریخ'' میں مضمون نگاری کے حوالے سے لکھتی ہیں:

> ''مضمون نگاری میں رفتہ رفتہ ارتقا ہوا اور موضوعات کی وسعت کی بنا پر مختلف ادوار میں مختلف صورتیں اختیار کی گئیں۔''[۳]

اُردو مضمون نگاری کے حوالے سے مضمون نگاری کا جائزہ لینے سے قبل ہم اس بات پر غور کریں گے کہ مضمون نگاری کے کتنے موضوعات ہیں اور اِن کی کتنی اقسام ہیں۔ان میں سائنسی مضمون، علمی و اصلاحی مضمون، معاشرتی و سیاسی مضمون، تاریخی و لسانی مضمون، مزاحیہ مضمون، تحقیقی و تنقیدی مضمون، توضیحی مضمون وغیرہ آتے ہیں۔

اُردو مضمون نگاری کا آغاز دہلی کالج کے رسالے ''قران السعدین'' سے ہوا۔ اس رسالے کا اجرا ۱۸۴۵ء میں دہلی کالج کے پرنسپل ڈاکٹر الواس اشپرنگر Alios Sprenger کی سربراہی میں ہوا۔ دہلی کالج کے طلبا کو ایک موضوع دیا جاتا تھا اورطلبا اپنی ذہنی استعداد کے مطابق اظہار خیال کیا کرتے تھے۔ یہ ہفتہ وار رسالہ خاصی علمی نوعیت کا حامل تھا۔ ابتدامیں دہلی کالج کے مضمون نگاروں نے سائنسی و تاریخی مضمون نگاری سے نئے نئے مضامین اور نئے نئے موضوعات کا احاطہ کیا اور یوں اہل علم و اہل قلم نے نئے مضامین لکھ کر اُردو ادب میں مضمون نگاری کے ابتدائی دور کا آغاز کیا اوریوں جدید علوم وفنون سے ہندوستان کے باسی متعارف ہونے لگے۔گارسیں دتا سی ''قران السعدین'' کے حوالے سے لکھتا ہے:

> ''ایک بالتصویر اخبار ہے۔جس میں سائنس ادب اورسیاست سے بحث ہوتی ہے۔
> اس کا مقصد اپنے ہم وطنوں میں مغربی خیالات کی اشاعت ہے۔ ہفتہ میں ایک بار

ہی شائع ہوتا ہے۔"[۳]

ماسٹر رام چندر کا نام سائنسی، ادبی و سماجی مضامین کے حوالے سے ایک اہم اور نمایاں نام ہے۔ ماسٹر رام چندر دہلی کالج کے اُستاد تھے کے رسالے "محبِ ہند" اور "فوائد الناظرین" میں سماجی و معاشرتی مضامین کے ساتھ ساتھ سائنسی علوم پر بھی مضامین منظر عام پر آتے ہیں۔ مطالعہ و مشاہدہ مضمون نگار کو سائنٹفک ماحول عطا کرتا ہے۔ اوروہ ٹھوس شواہد کو یک جا کر کے اپنے مضمون کی داغ بیل ڈالتا ہے اوراپنی سمت یا Foucus کی بھی نشان دہی کرتا ہے۔ ماسٹر رام چندر کا رسالہ "فوائد الناظرین" ۱۸۴۵ء میں منظر عام پر آیا۔ جس کے ماسٹر رام چند خود بھی مدیر تھے۔ اس رسالے میں بھی سائنسی و تاریخی مضامین شائع ہوا کرتے تھے۔ خواجہ احمد فاروقی، پروفیسر قاسم علی سجن لال کے انگریزی مضمون کے ترجمے میں لکھتے ہیں:

> "یہ پندرہ روزہ سائنسی اورتاریخی اخبار تھا۔ اس میں علمی بحثیں ہوتی تھیں اورسائنس کے متعلق تصویروں کے ساتھ مضامین شائع ہوتے تھے۔ اسی اخبار میں ہندوستانی، اسلامی، مصری، شامی، رومی، یونانی اوریورپی تاریخ کے علاوہ آرٹ، آثارِ قدیمہ اورفن تعمیر کے متعلق بھی مضامین چھپتے تھے۔"[۵]

"فوائد الناظرین" کی علمی شان کو سوانحی، تاریخی، اخلاقی و اصلاحی، سائنسی، سماجی و سیاسی مضامین دوبالا کرتے تھے۔ ماسٹر رام چندر نے "خیر خواہِ ہند" کا ۱۶ ستمبر ۱۸۴۷ء کو اجرا کیا اور اکتوبر ۱۸۴۷ء کو اس کا نام تبدیل کر کے "محبِ ہند" رکھ دیا گیا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ "خیر خواہِ ہند" اخبار جو پہلے سے نکلتا تھا اور "دوبارہ خیر خواہِ ہند" کے آنے کے بعد ایک نام کے دو ادبی فن پارے ہونا ایک غلط امر تھا اس لیے اس کا نام تبدیل کردیا گیا۔ رام چندر لکھتے ہیں:

> "ہم کو معلوم ہے کہ اخبار مسمی خیر خواہ ہند مرزا پور میں جاری ہوتا ہے تو ہم کو مناسب نہیں کہ ہم اپنے رسالہ کا نام بھی خیرخواہِ ہند رکھیں۔ اس واسطہ ہم نے اس رسالہ کا نام تبدیل کیا اوربجائے خیر خواہ ہند کے محبِ ہند رکھا۔"[۶]

سائنسی مضامین لکھنے کا ایک اہم مقصد یہ بھی تھا کہ لوگوں کو جدید ایجادات اورکائنات میں روز بروز ہونے والی تبدیلیوں سے آگاہ کیا جائے۔ "فوائد الناظرین" میں فزکس، زوالوجی، باٹنی کے حوالے سے مضامین شائع ہوا کرتے تھے اوراس رسالے میں سائنسی علوم سے وابستہ مضامین بھی ملتے ہیں۔لہٰذا "قران السعدین"، "محبِ ہند" اور "فوائد الناظرین" میں شائع ہونے والے مضامین بالواسطہ تیم ورک ہیں اور ۱۸۴۵ء



تا ۱۸۴۷ء کے لگ بھگ شائع ہونے والے مضامین باوجود سائنسی، مذہبی، جغرافیائی، معاشرتی، تاریخی ہونے کے صاف، شفاف سادہ و سلیس اُردو میں لکھے نظر آتے ہیں اورآج بھی ان کا مفہوم و معنی سمجھنے میں دقت محسوس نہیں ہوتی۔'' ''اُردو میں سائنسی ادب'' میں خواجہ احمد الدین شاہد کی اس رائے میں وزن نظر آتا ہے:

> ''اُردو زبان میں سائنسی ادب کے اولین کارناموں کا مطالعہ کرنے کے بعد درپردہ حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے کہ اُردو زبان میں اس کے دورِ آغاز پر سے یہ صلاحیت موجود تھی کہ اگر وہ منطق و فلسفہ اورتصوف ومعرفت کے لاینحل اور پیچ در پیچ مسائل کی گتھیوں کو سلجھا سکتی ہے اورحسن وعشق کی رنگین داستانوں کی نظم ونثر کے پیرائے میں پیش کرسکتی ہےتو علمی وفنی اورسائنسی موضوعات سے رموزونکات کی بھی وہ آئینہ دار ہے۔''[۷]

مضمون نگاری کا خاص وصف ذہانت و متانت ہے۔ وسعت ادیب کی ذہنی اپج کی مرہون منت ہوا کرتی ہے اورمضمون نگاری کی روایت وسعت کی متقاضی ہے۔ مضمون کسی ایک ہی موضوع پر تخیل تحیر کے ساتھ ادیب کے خیالات کی ترجمانی کرتا ہے اوریوں قاری کو اپنی گرفت میں لے کر مضمون نگار کو اپنا ہم خیال بناتا۔

مضمون نگاری کی پہلی قسم مختصر نویسی یعنی"Short Essay" ہے جس کی اُردو میں ابتدا ماسٹر رام چندر کے مضامین اور''قران السعدین'' سے ہوئی۔''Short Essay'' یا مختصر مضمون پانچ یا دس صفحات پر مشتمل ہوتے ہیں ان میں غیر متعلقہ معلومات کی بھرمار سے اجتناب کیا جاتا ہے۔ تمام تر توجہ متعلقہ موضوع پر دی جاتی ہے۔ مضمون نویسی کے لیے انسان کو مشق کرنے کی ضرورت ہے، صرف لفظی طوطا مینا اُڑا دینے سے نفسِ مضمون علمی بصیرت اورحقائقِ موضوع پر روشنی نہیں پڑتی بلکہ نفسِ مضمون کے اُصول وقواعد سے بہرہ ور ہوکر ہی مضمون نگار نفسِ مضمون پر گرفت حاصل کرسکتا ہے۔ رسالہ مخزن میں ضیاء الحق اپنے مضمون ''مضمون نویسی'' میں مضمون نویسی کے حوالے سے اپنی رائے کا یوں اظہار کرتے ہیں:

> ''جب تک کسی شے کے متعلقہ قوائد وفرائض سے پوری طرح واقفیت نہ ہو اورنفس مدعا پر غوروخوض کرنے اور ترتیب کی قابلیت بہ لحاظ اُصول قواعد حاصل نہ ہو طبع آزمائی کرنا آنکھ بند کر کے رستہ چلنا ہے۔
>
> حقائق و معارف اُس وقت بیان کرسکتے ہیں جبکہ تشریح وتوضیح حقائق و معارف کے اُصول پر حاوی ہو۔ مضمون نویسی بغیر مضمون نویسی کے بے سود اور بے سلیقگی ہے اور

محض قابلیت اور علمیت کا اظہار خوش سلیقگی اور بے ترتیب اور بھدا پن ہے۔"[۸]

مضمون نگاری کا دائرہ جب آگے بڑھتا ہے تو سرسید احمد خان کا نام نمایاں نظر آتا ہے جنھوں نے رسالہ "تہذیب الاخلاق" میں دینی، سیاسی، ادبی، سائنسی، معاشرتی غرضیکہ ہر قسم کے مضامین لکھ کر اور اپنے رفقائے کار سے مضامین لکھوا کر مضمون نویسی کو وقت کی اہم ضرورت بنادیا ہے۔

مضمون نگار اپنے آپ سے جنگ بھی کرتا ہے اوراپنی تحقیقی Approach کو پروان بھی چڑھاتا ہے۔ وہ شک سے یقین کی دُنیا میں اُس وقت قدم رکھتا ہے جب مواد، اسلوب، علم و آگہی، مطالعہ، مشاہدہ تخلیقی رویہ، تخلیقی سوچ، وجدان و ذوق اور موضوع اس کی گرفت میں ہوتے ہیں۔سرسید بھی ایسی کمک ملنے پر فوراً تخلیقی مراحل سے سبکدوش ہونا جانتے تھے اوراسی لیے ذہنی چابکدستی نے کسی ذہنی دباؤ کے سرسید احمد خاں سے وہ مضامین لکھوائے کہ جس نے نہ صرف اُردو ادب کی آبیاری کی بلکہ اس دور کی نئی پود (نسل) کو شعورو آگہی بھی عطا کیا اورمحنت ولگن کی دُھن سے بھی ان کو آشنا کیا۔ اب ہم اُن مضامین میں پوشیدہ مضمون نگاری کی روح کوتلاش کرنے کی جستجو کرتے ہیں۔

سرسید احمد خاں نے جو مضامین لکھے وہ طویل مقالے بھی ہیں اورجن سے مضمون نگاری میں مقالہ نگاری کے فن کوفروغ حاصل ہوا۔سرسید احمد خاں کے تفسیری مضامین اسی زمرے میں آتے ہیں۔جبکہ فلسفیانہ مضامین میں انسانی نفسیات کا بھی مطالعہ ملتا ہے، فلسفیانہ مضامین کانشنس یا ضمیر، دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اہم مضمون ہے جونفسیات کے حوالے سے بھی اضافی ذہن کا ایک اہم جزو ہے۔سرسید احمد خاں اس مضمون کے آغاز میں لکھتے ہیں:

> "کانشنس نہایت عمدہ چیز ہے اورانسان کو برائی سے بچانے اوربھلائی کی طرف راغب کرنے کو بہت اچھا رہنما ہے۔مگر درحقیقت وہ ایک حالت انسان کی طبیعت کی ہے اوراس کی تربیت کا نتیجہ ہے۔"[۹]

سرسید کے یہ فلسفیانہ مضامین انسان کی نفسیات کی پہچان کا منہ بولتا ثبوت ہیں اور یوں انسانی و معاشرتی امراض کے شکار مسلمانوں کی اس ناگفتہ بہ حالات سے نکالنے کے لیے سرسید نے نہ صرف اُردو کے دامن کو وسیع کیا بلکہ اپنے مضامین کوعلمی متانت، دلائل وتاویل سے بھی آراستہ کیا انہوں نے "کانشنس" مضمون کے ذریعے حضرت محمد ﷺ کی ختمِ نبوت پر بڑی باریک بینی سے روشنی ڈال کر یہ ثابت کیا ہے کہ مضمون اگر حقائق پر مبنی ہوتو اس کی اہمیت دوگنی ہوا کرتی ہے اوریوں مضامین کے ذریعے ذہنوں میں اُٹھنے

والے سوالات کے جوابات سے معاشرے کے انتشار کو ختم کیا جاسکتا ہے۔ یہ مضمون اور اس طرح کے دیگر مضامین ،مضمون نگاری کے وسعت بیان کے عکاس ہیں۔

سرسید کے مضامین کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ تحقیقی مضامین کا صحیح معنوں میں ادراک سرسید کے مضامین ہی کے ذریعے ہوا ہے۔ سائنسی مضامین ہر دور کی ضرورت رہے ہیں کہ جستجو انسان کی سرشت میں شامل ہے۔سرسید کے تحقیقی مضامین بھی سائنسی تشنگی پورا کرتے ہیں۔لیکن ان مضامین میں قرآنِ مجید فرقانِ حمید کے حوالے سے بھی دُنیا کے بننے، انسان کی پیدائش، سورج کی گردش اور جدید علم طبیعات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان مضامین میں قرآنی آیات کے حوالے بھی دیے گئے ہیں۔سرسید نے کہیں کہیں اشکال کے ذریعے بھی اپنا مافی الضمیر بیان کیاہے۔سرسید احمد خاں نے مضمون نگاری میں علمی تناؤ کو بھی قدرے کم کیا ہے اور دلچسپی کو بھی برقرار رکھا ہے۔ یوں انہوں نے مضامین میں عقلی دلائل سے تعین کے رجحان کو فروغ دیا۔ تحقیق کے سوتے بھی سرسید کے مضامین سے ہی مضمون نگاری میں پھوٹتے نظر آتے ہیں۔ مختصر مضمون ''علوم جدیدہ'' میں تحقیق سے علوم جدیدہ کی وضاحت کی ہے۔ جبکہ ''ترقی علوم'' میں مسلمانوں کی علمی ترقی پر روشنی ڈالی ہے۔ جب کہ ''علاماتِ قرات'' قدرے طویل مضمون ہے۔جن میں قرات کے موضوع پر جو بھی تحقیق ہوئی وہ کسی حد تک سرسید کے تحقیقی موضوع کو مدِنظر رکھ کر ہی کی گئی۔ یہ حقیقت ہے کہ سرسید نے تحقیق کے باب میں مضمون نگاری میں جو اضافے کیے وہ آنے والے مضمون نگاروں کے لیے مشعل راہ بن گئے۔

تعلیم سرسید کا مشن تھا اورسرسید نے مضمون نگاری کے باب میں تعلیمی، تربیتی موضوعات کو احاطۂ تحریر میں لاکے علم کی توقیر کو بڑھایا۔ مسلمانوں کی جہالت کو دور کیا اور یوں مضمون نگاری کی ایک اور قسم سامنے آتی ہے۔''علمی و معاشرتی مضمون نگاری'' جن میں انسانی عقل اورعلم کے پہچان پر اس دور کے معاشرتی عروج و زوال کے مطابق کی جاتی ہے۔جس کا سرسید نے ہی آغاز کیا ہے۔مزید برآں سیاسی وملکی مضمون نگاری بھی سرسید کی فکری تحریک سے ہی اُردو میں شروع ہوتی ہے۔ سیاسی وملکی مضامین وہ ہوا کرتے ہیں جن میں حالاتِ حاضرہ پر روشنی ڈالی جاتی ہے اورحقائق کی پردہ پوشی کرنے کی بجائے حقائق کی دلائل و تاویلوں سے عکاسی کی جاتی ہے۔ ایسے مضامین کو''باغیانہ مضامین'' بھی کہا جاسکتا ہے۔سرسید احمد خان نے ''باغیانہ مضمون'' بھی پہلی بار لکھے۔ انگریز حکومت کے خلاف قلم بھی اُٹھایا ہے اور تاریخ نے ثابت کردیا کہ انگریز



سامراج کے خلاف قلم اُٹھانے والے اس دور میں باغی کہلائے سرسید نے "انڈین آبزور اور مسلمان" میں مسلمانوں کی شان میں بُرا بھلا کہنے والے مضمون نگار کا بڑا مختصر جواب علمی نذیر اور حقائق پر مبنی واقعات کی روشنی میں دے کر مسلمانوں کو حوصلہ دیا ہے۔ سرسید احمد خان لکھتے ہیں:۔

> "یہ سچ ہے کہ جو بدزبان کسی کی نسبت استعمال میں لاتا ہے وہ خود اولاً اپنے آپ کو ان سویلائزڈ ثابت کرتا ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ اس آرٹیکل کا لکھنے والا ہم کو متکبر اور متعصب بتاتا ہے حالاں کہ وہ ہم سے بھی زیادہ معلوم ہوتا ہے مگر ہم کو اس پر خیال نہیں کرنا چاہیے بلکہ جو لفظ ہمارے دشمن نے ہمارے حق میں کہیں ہوں اُن سے بھی ہم کو نصیحت پکڑنی چاہیے۔[۱۰]

سرسید احمد خاں مصلح قوم تھے۔ انہوں نے اصلاحی مضامین کی طرح بھی ڈالی اور یوں مضمون نگاری کی تعریف اس طرح بھی کی جا سکتی ہے کہ سوشل یا معاشرتی مضمون ایسے ہوتے ہیں جن کے ذریعے معاشرتی و اخلاقی گراوٹ پر اظہار خیال کیا جاتا ہے۔ ایسے مضامین میں پہلے سماجی و اخلاقی گراوٹ کا سبب بتایا جاتا ہے پھر انسانی کمزوریوں کا احاطہ کیا جاتا ہے جن میں نمایاں کمزوریاں تعصب، حسد، بے انصافی، دھوکہ دہی جہالت کو گردانا جاتا ہے۔ پھر ان کا تدراک، تحمل و برداشت، حوصلہ اور تعلیم و تربیت سے کر کے عوام الناس کو اعتماد کا درس دیا جاتا ہے۔ یہ مضامین سلجھے لہجے، متین خیالات اور سادہ اسلوب میں لکھے جاتے ہیں تا کہ عوام کے دل میں گھر کر سکیں اور ذہن کو روشن کر کے مددگار و معاون ثابت ہو۔ اس طرح سرسید کے مضامین نے مضمون نگاری کو اس صف میں لا کھڑا کیا جہاں یہ فکری مضامین انقلاب لانے کا سبب بھی بنے اور یوں مسلمانوں نے جاہلیت کا لبادہ اُتار پھینکا۔ یوں تحریکِ آزادی پروان چڑھی اور وجودِ پاکستان عمل میں آیا۔ "تہذیب الاخلاق" کے اجرا کے موقع پر سرسید خود فرماتے ہیں:

> "اس پرچ کے اجراء سے مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو کامل درجہ کی سویلزیشن یعنی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جائے۔ تا کہ جس حقارت سے ان سویلائزڈ یعنی مہذب قومیں اُن کو دیکھتی ہیں وہ رفع ہو اور وہ بھی دُنیا میں معزز و مہذب قوم کہلا دیں۔"[۱۱]

سرسید کے ان مضامین نے اُردو نثر کو سیدھا سادا اسلوب دینے کے ساتھ ساتھ قوم میں اجتماعی شعور کو موضوعِ بحث بنانے کی بنیاد رکھی ہے۔ ناظمہ نقوی سرسید کی مضمون نگاری کے حوالے سے لکھتی ہیں:

> "اُردو کو اپنے افکار و علوم کے اظہار کا ذریعہ بنا کر ایسے ایسے علمی، اخلاقی، قومی اور

معاشرتی موضوعات پر جدید مضمون نگاری کی بنیادیں اُٹھائیں جس کے ذریعے.....

اُردو کا دامن خالی تھا اس کا ذریعہ تہذیب اخلاق بنا۔"۱۲

رسالہ "تہذیب اخلاق" کے مضامین نے جہاں علمی، نفسیاتی، سائنسی، تحقیقی، فلسفیانہ، مذہبی، معاشرتی، سماجی، سیاسی مضامین کا ڈول ڈالا وہاں تنقیدی مضامین کا بھی اجرا کیا اوراُردو ادب میں دورِ حاضر میں جو تنقیدی رجحان نظر آتا ہے اُسے سرسید احمدخاں نے فروغ دیا ہے۔سرسید نے مضامین کو ایسی وسعت عطا کی کہ اس دور میں حالی، شبلی، آزاد، مولوی ذکاء اللہ، وقار الملک دیگر احباب نے بھی مضامین لکھے اوران مضامین نے مسلمانوں کو جوش و جذبات کے تلاطم سے نکال کر عقل و دانش کی وہ راہ دکھائی کہ مسلمان اپنی عظمتِ رفتہ کی کھوج میں جُت گیے۔ حالی کی نثر نگاری کے حوالے سے اگر اُن کے مضامین پر بات کریں تو "مضامینِ حالی" کلیاتِ نثر حالی جلداول، جلد دوم کو شیخ محمد اسماعیل پانی پتی نے مرتب کیا۔ ان کا تفصیلی جائزہ باب سوم میں لیں گے یہاں حالی کی مضمون نگاری کے حوالے سے یہ بحث کی جائے گی کہ حالی نے کس طرح کے مضامین لکھے۔مولانا اسماعیل پانی پتی نے کلیاتِ نثر حالی جلد اول میں حالی سے مضامین کی اقسام مندرجہ ذیل بتائی ہیں مذہبی مضامین، اصلاحی مضامین، تاریخی مضامین، سوانحی مضامین، سرسید کے متعلق مضامین، علی گڑھ کالج پر لکھے گئے مضامین اورمتفرق مضامین۔

اصلاحی مضامین عوام الناس کے کردار کی کمزوریوں، اخلاقی رویوں اور روایات و اقدار کی پاسداری نہ کرنے پر لکھے گئے ہیں جبکہ علمی مضامین دینِ اسلام سے متعلق مضامین پر ہیں۔ تاریخی و سوانحی و متفرق مضامین اصلاحی، علمی و ادبی نوعیت کے ہیں اورسرسید پر لکھے گئے مضامین دراصل خدماتِ سرسید کا اعتراف ہیں۔ حالی کے مضامین کا مطالعہ کریں تو حالی کے مضامین کا انداز بہت حد تک سرسید کے اندازِ فکر سے ملتاجلتا ہے۔ علمیت اور موضوع سے بھرپور واقفیت کے باوجود حالی کے یہ مضامین سادگی اورسلاست سے بھرپور مضامین ہیں اورجذبہ وشوق کے ساتھ ساتھ خلوص کی صداقت ان کے مضامین میں نمایاں نظر آتی ہے۔فکر کی گہرائی کے ساتھ ساتھ حالی مصلح قوم بن کر ان مضامین میں جھلکتے ہیں۔ اپنے ایک مضمون "کیا مسلمان ترقی کرسکتے ہیں؟" میں لکھتے ہیں۔

> "بہرحال یہ تمام سوانح جواُوپر ذکر کیے گئے، ہم کوترقی سے مایوس کرنے والے نہیں ہیں۔ البتہ صرف ایک بات ایسی ہے جو تمام منصوبوں اورارادوں کو خاک میں ملا دیتی ہے اوروہ ترقی کی طرف سے مایوسی اورناأمیدی ہے۔ جوقوم عام تعصب

اورجہالت میں مبتلا ہوتی ہے، وہ ہمیشہ چند ایسے روشن ضمیر آدمیوں کی اہمیت اورکوشش سے دوبالا ہوتی ہے جو تعلیم کی بدولت تعصب اور جہالت کی اندھیری کوٹھری سے باہر نکل آتے ہیں، اورقوم کی ابتر حالت دیکھ کر ان کے دل میں بے اختیار ایک ولولہ اُٹھتا ہے، اورقومی اصلاح وترقی کی طرف دل و جان سے متوجہ ہوجاتے ہیں۔"[۱۳]

اس نثر پارے کے نمونے سے احساس ہوتا ہے کہ مولانا الطاف حسین حالؔی کے ہاں جوش و جذبے و تخیل پر اصلاحِ قوم کا جذبہ کارفرما آگیا ہے اور یہ ہی اصلاحِ قوم کا جذبہ اُن کی تحریر کا خاصہ ہے۔ حالؔی کے ہاں جوش کی صداقت سے ہمیں انکار نہیں لیکن حالؔی کا اصلاحِ قوم کا احساس تحریر کے تخیل و جوش سے زیادہ افضل نظر آتا ہے اس لیے نثر کی غنایت اور بلاغت کی جگہ سلیس نثر میں حالؔی نے اپنا مافی الضمیر بیان کرکے اپنے خاص و عام، جاہل و عاقل قارئین تک پہنچایا اوریہ لہجہ اور یہ احساس ہمیں حالؔی کے مضامین میں ہر جگہ نظر آتا ہے گویا حالؔی نے نیچرل اسلوب کا آغاز سرسید کے تتبع میں کیا اور پیامبر بن کرقوم کی زبوں حالی کا بار بار ذکر کیا البتہ اک دردمندی اورسوز مندی پر اُن کا لہجہ کہیں کہیں خشک اوراکتاہٹ سے بھرپور بھی ہو جاتا ہے۔ لیکن حالی اس کی قطعی پروانہیں کرتے کیونکہ مسلمان، قوم کی اصلاح، قوم کی ترقی، قوم کی بیداری اُن کا اصل نصب العین ہے نا کہ حالؔی کے نزدیک زبان دانی کا شوق اہم ہے۔

مولانا محمد حسین آزاد وہ نثر نگار ہیں جن کی نثر میں حسن و جمال نظر آتا ہے اوران کی مرصع سازی نے اُردو زبان کو وسیلہ اظہار کے ساتھ ساتھ نزاکت و لطافت عطا کی ہے۔ خیال کی دلکشی اور زبان کی مٹھاس آزاد کی "نیرنگ خیال" میں نظر آتی ہے اوراعلیٰ تخیل کی کارفرمائی نے ان مضامین کو زندہ جاوید کردیا ہے۔

مولانا آزاد نے مضمون نگاری میں روحانی و جمالیاتی حسن کو اس طرح سمو دیا ہے کہ مضمون نگاری میں باقاعدہ انشا پردازی کا آغاز ہوگیا۔ انشا پردازی سے مزین مضامین وہ مضامین جانے جاتے ہیں جن میں انشا پردازی کو فوقیت دی جاتی ہے اور مضامین جو نثر کو تشبیہات و استعارات یوں کہہ لیجئے کہ علم بیان اور علم بدیع سے رنگین بنا دیں لیکن تخیل اعلیٰ کی کارفرمائی بھی جہاں کڑی شرط ہو اور زبان کی جدت کے ساتھ ساتھ مصنف اپنے مافی الضمیر بھی بھرپور انداز میں بیان کر سکے انشا پرداز مضمون کہلاتے ہیں۔ "نیرنگ خیال" میں شامل مولانا آزاد کے مضمون "علوم کی بدنصیبی" کا یہ ٹکڑا ملاحظہ ہو:

"تمام صاحب جواہر اور کل اہل کمال ہمیشہ ان نالائقوں اور غلط نما باکمالوں کے ہاتھ سے نالاں ہیں۔ جو فلک کی سفلہ پروری یا قسمت کی یاوری سے ہوائے مراد کے بلون میں بیٹھے ہیں اور ترقیوں کے آسمان پر سیر کرتے پھرتے ہیں۔ اس معاملے میں اہل علوم سے زیادہ کوئی واجب الرحم نہیں۔ صدیوں کے بعد تو کوئی صاحب صنعت پیدا ہوتا ہے۔ پھر اگرچہ ہر شخص کے کام کی ترقی خاص و عام کی قدردانی پر منحصر ہے۔ لیکن بنیاد اسکی حکام یا اہل دول کی بدولت قائم ہوتی ہے۔ اسی واسطے اُس کی رونق بازار کی عمر بہت تھوڑی ہوتی اور ان خرابیوں کا بیان کرنا حد قلم سے باہر ہے۔ اول تو اہل کمال ہمیشہ کم اور بے کمال انبوہ در انبوہ ہیں۔"[۱۴]

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار "نیرنگ خیال" مرتب کرتے وقت "نیرنگ خیال" کے مقام و مرتبے پر یوں تبصرہ کرتے ہیں:

"نیرنگ خیال میں آزاد کا مقصد اخلاق آموزی اور نئی نسل کے نوجوانوں کی زندگی کی حکمتوں کا درس دینا تھا لیکن انہوں نے سرسید احمد خاں کی طرح براہ راست پند آموزی کا طریق اختیار نہیں کیا بلکہ ایک ادیب کی طرح زندگی کے ایسے دلچسپ اور خوشگوار مرقع پیش کیے کہ جن سے بالواسطہ حکمت و اخلاق کا سبق ملتا ہے۔"[۱۵]

مولانا آزاد نے پہلی بار اپنی شوخ تحریروں سے اُردو ادب کو مالا مال کیا۔ انگریزی خیالات کا تڑکا آزاد کی تحریروں میں نظر آتا ہے یوں مولانا آزاد نے اُردو کی شان کو جہاں نظم میں دوبالا کیا تو وہاں نثر نگاری میں بھی گلکاریاں کر کے اپنی علمی ادبی بصیرت کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ ذکاوت و ذہانت مولانا آزاد کا خاصہ تھی اس لیے ان کے نثری مضامین صداقت کے پھیلاؤ اور علم کی ترسیل کا باعث بنے لیکن مولانا نے اس کے لیے جو زبان استعمال کی وہ تخیلاتی زبان تھی۔

مولانا شبلی نعمانی نے بھی اپنے مقالات میں کہیں کہیں پر جوش اور مترنم لہجہ استعمال کیا ہے۔ رومانوی مضمون نگاری کا آغاز مولانا شبلی کی نثر سے ہوتا ہے۔ رومانوی مضمون نگاری میں تخیل کی کارفرمائی ہوتی ہے اور جوش و جذبات سے بھرپور نثری رومانویت مضامین کا خاصہ ہوتی ہے۔ خیالات کے بہاؤ میں عقل و دلیل کی بجائے مترنم لہجہ ہوا کرتا ہے۔ فقروں میں غنایت ہونے کے ساتھ ساتھ ایک سحر انگیز نثر ہمارے سامنے آتی ہے۔ مولانا شبلی کی نثر دل پذیر بھی ہے اور خوش گوار بھی۔ مولانا شبلی کے مقالات میں نفاست اور لطافت بھی نظر آتی ہے۔ مولانا شبلی کی نثر میں رومانوی بالیدگی ملتی ہے اور شعریت مصنوعی نہیں لگتی بلکہ مولانا

شبلی کی تخلیقی قوت نے ان کے مقالات کے نثر پاروں میں شعریئت کو اس طرح جذب کیا ہے کہ علمی بصیرت اورباطنی بصارت یکجا ہوگئی ہیں۔ البتہ مولانا شبلی کے ہاں یہ نقص بدرجہ اتم پایا جاتا ہے کہ اُن کی نثر غیر متوازن اورمنتشر بھی ہوجاتی ہے۔اپنے مضمون ''نظم القران وجہرۃ الباغت'' میں لکھتے ہیں:

> ''حسن کلام کی بھی یہی حالت ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک عمدہ اور پر اثر مضمون نحوصرف کی معمولی پابندیوں میں مقیدرہ کرادا نہیں ہوسکتا، اس حالت میں الفاظ ومضمون کا حجاب بن جاتے ہیں۔اوراس وجہ سے مضمون اس حجاب کو چاک کر کے دل میں اُترتا ہے۔اس کی یہ مثال ہے کہ کوئی بادشاہ ضرورت کے وقت آداب سلطنت چھوڑ کر خود سفیر بن کر جائے اوراپنا پیغام خود پہنچا آئے۔ اس بیان سے ثابت ہوا کہ حسن کلام الفاظ کا پابند نہیں اور یہ بلیغ دراصل مضمون ہوتا ہے نہ الفاظ لغت میں بلیغ کے معنی پہنچنے والے کے ہیں اورچیز دل میں پہنچتی ہے وہ دراصل معانی ہیں نہ الفاظ۔''[۱۶]

مضمون نگاری کی ایک اورقسم رومانوی مضمون نگاری ہے اُردو ادب میں سرسید کی تحریک نے خشک اورمعقولیت سے بھرپور نثر پیش کی جس کے ردعمل میں رومانوی تحریک اُبھر کر سامنے آتی ہے اورحسن وعشق، جذبات و احساسات کا بھرپور اظہار اسلوبِ بیان میں کیا جاتا ہے اس تحریک کے سرخیل مولانا عبدالحلیم شرر تھے اُن کے مضامین رسالہ ''دلگداز'' میں شائع ہوتے رہے، ان کا اندازِ تحریر رومانی ہے اور رومانوی مضمون نگاری کی باقاعدہ ابتدا شرر سے ہوتی ہے اوران کے شاعرانہ و عاشقانہ مضامین میں رومانویئت عروج پر نظر آتی ہے فقروں میں بھرپور جذبائیت جھلکتی ہے۔نثر پاروں میں جذبات کے تلاطم کے ساتھ ساتھ جوشیلا پن بھی نظر آتا ہے شرر کی نظر بھی بہکتی ہے اورتخیل بھی اکثر بے لگام ہو جاتا ہے۔''غریب کا چراغ'' کانثر پارہ ملاحظہ ہو:

> ''ہائے دیکھو کس طرح ٹمٹما کے جل رہا ہے۔اس کی روشنی یا تو پرانے جھونپڑوں کی پھونس کی چھت اورچٹائیوں اور ٹٹیوں پر پرتی ہے۔ جس بعینہٖ جس طرح ٹوٹے پھوٹے کھنڈروں میں مسلمانوں کا اقبال چمک رہا ہے۔''[۱۷]

فکری گہرائی شرر کے ہاں نظر آتی ہے اوریوں بے لگام تخیل کی طرف سے کچھ دیر کونظر ہٹ جاتی ہے۔ رومانوی تحریک کو سجاد حیدر یلدرم نے پروان چڑھایا''مخزن'' اورشیخ عبد القادر نے رومانویئت کی لہر کو فروغ دیا اور رومانویئت کا عکس جب جب قلب ونظر میں جھلکا تب تب مضامین نو نے فطرت انسانی کا احاطہ کیا اورفطرت انسانی نے موسم کی روداد بھی قلمبند کی۔ہجر ووصال کے قصے بھی چھیڑے اورحسن و جمال

کی لفریبوں کا احاطہ بھی کیا۔اس کے لیے نثارِ ادب نے جس اسلوب کا انتخاب کیا وہ تشبیہ و استعارے سے مزین اسلوب تھا۔

Cynthia Ozick رومانوی مضمون نگاری کے حوالے سے لکھتا ہے:

"An esssay is thing of the imagination. If there is information in an essay, it is by the by, and if there is an opinion in it, you need not trust if for the long run. a genuine essay has no educational, polemical, or sociopolitical use; it is the movement of a free mind at play. Thought it is written in prose, it is closer in kind to poetry than to any other form like a poem, a genuine essay in made out of language and character and mood temperament and pluck and chance."[۱۸]

اُردو میں شرر کے بعد یلدرم، شیخ عبد القادر، عبد العزیز فلک پیا، ابو الکلام آزاد، سجاد انصاری، حسن نظامی، میاں بشیر احمد، خلیقی دہلوی، حجاب امتیاز علی، امتیاز علی تاج، نیاز فتح پوری، مجنوں گورکھپوری، فراق گورکھپوری، عبد الماجد دریا آبادی وغیرہ رومانوی نثار و نقاد کے روپ میں جلوہ گر ہوئے۔ ''رومانوی مضامین'' کی بنیاد ذاتی تجربات کی تخیل کی جولانیوں اور فکر نو کی آمیزش سے اُٹھائی جاتی ہے زبان کو حسن رنگینی عطا کی جاتی ہے۔ اظہاریئت میں مسرت و انبساط کا پہلو نمایاں ہتا ہے۔ نصیحت سے گریز کیا جاتا ہے۔ عقل و دانش سے ہاتھ اُٹھایا جاتا ہے۔ فہم و فراست سے منہ موڑا جاتا ہے اور کاغذی پیرہن تراشے جاتے ہیں۔ لفظوں کے طوطا مینا اُڑائے جاتے ہیں۔ ہر جملے اور ہر موضوع میں جذبات، جوش سرائیت کرتا ہے۔ سرشاری اور سحر کی کیفیت مضامین کا خاصہ ہوتی ہیں۔ ابو الکلام آزاد کا ''الہلال'' صحافت اُردو کا روشن باب تھا۔ اوراس کے ذریعے سیاسی تغیرات و انقلاب رونما ہوئے۔ ڈاکٹر محمد حسن، ابو الکلام آزاد کی نثر کے حوالے سے رقمطراز ہیں:

> ''ابو الکلام آزاد کی نثر رومانوی انانیت، تخیل کی فراوانی اور شدت جذبات کا اعلیٰ ترین فطر ہے اوران کی بلند و بالا شخصیت شبلی کی طرح آسمانوں سے نیچے نہیں اُترتی۔ ان کے لہجے میں انفرادیت کی وہ کھنک ہے جو اس دور کے کسی اور نثر نگار کے ہاں

نہیں ملتی۔ ابوالکلام آزاد نے جس عظمت اور جرات اعتماد کے ساتھ "میں" کا لفظ استعمال کیا ہے ابوالکلام کی انفرادیت اس دور کی عظیم ترین تخلیقات میں شامل کی جاسکتی ہے۔"[۱۹]

ابو الکلام آزاد کی تحریر میں حیات آفرینی، تخیل، ہمہ گیر وسعت اور نثری آرائش و زیبائش نظر آتی ہے۔ نثر میں لفظوں سے تصویر کشی کرتے ہیں۔ علمیت اور خطابت انکی نثر کا خاصہ ہے۔ یہ نثر پارہ ان کی تحریروں کی شوخی، رومانویئت کا عکاس ہے۔

"آفتاب کو ہمیشہ اس کی کرنوں میں دیکھا جاتا ہے اور دھوئیں کو دیکھ کر مسافر پالیتا ہے کہ آگ جل رہی ہے اس طرح خدا کا جلال بھی ہمیشہ اپنی نشانیوں اور آیتوں کے اندر سے دیکھا گیا ہے اور ہمیشہ اس نے اپنے آفتاب جمال کی چمک بدلیوں کے نقاب میں دکھلائی ہے۔"[۲۰]

جوش ملیح آبادی کی نثر میں بھی رومانی اسلوب کی رنگ آمیزی نظر آتی ہے اور رومانوی مضمون نگاری کے صنف کو اُردو ادب میں جوش نے پروان چڑھانے میں اپنے صوتی آہنگ اور تخلیقی راست بازی کے ساتھ ساتھ جوش و جذبہ سے بھی کام لیا ہے۔ جوش کے ہاں الفاظ دست بستہ نظر آتے ہیں۔ جوش اپنے مضمون اُردو ادبیات میں انقلاب کی ضرورت میں لکھتے ہیں:

"انسان سب کچھ ہوسکتا ہے لیکن خاموش و بے عمل کبھی نہیں ہوسکتا۔ حرکت اس کی زندگی ہے اور سکون موت، وہ تو روزِ ازل کی صبح صادق سے "حالیا غلغلہ در گنبدِ افلاک انداز" کے وہ ہی ترانے گا رہا ہے اور جب تک موت اُسے بظاہر خاموش نہ کر دیگی وہ ہی ترانے گاتا رہے گا۔ بظاہر میں اس کے لیے کہتا ہوں کہ کون کہہ سکتا ہے خود موت بھی خواب ہے کہ بیداری سے اور جبکہ سکون و اضمحلال اور جمود و تعطل انسان کے واسطے ناممکنات میں سے ہے تو قرین دانشوری یہی ہے یا یوں کہیے کہ ہم اس پر مجبور ہیں کہ انسان کو معروف و مشغول ہی رہنے کا مشورہ دیں کیونکہ یہ مشورہ تو خود عین فطرت ہے۔"[۲۱]

سجاد حیدر یلدرم کے مضامین نے رومانیت کی تحریک کو فروغ دینے میں مخزن و دیگر رسائل میں لکھا ہے یوں سرسید تحریک کی خشک اور معقولیت سے بھرپور نثر کے ردعمل سے رومانوی تحریک اُبھر کر سامنے آتی ہے حسن و عشق، جذبات و احساسات کا بھرپور اظہار اسلوب و بیان میں کیا جاتا ہے۔ اس تحریک کے سرخیل تو

جیسا کہ پہلے بھی لکھ چکے ہیں شرر تھے لیکن اس تحریک کو سجاد حیدر یلدرم نے پروان چڑھایا۔ مخزن اور شیخ عبد القادر نے رومانیت کی لہر کو فروغ دیا۔ رومانیت کا عکس جب قلب نظر میں جھلکتا ہے تو پھر مضامین نو فطرت انسانی موسم کی روداد بھی قلمبند کرتا ہے۔ ہجر و وصال کے قصے بھی چھیڑتا ہے اور حسن و جمال کی لفریبوں کا احاطہ بھی کرتا ہے۔ اس کے لیے جس اسلوب کا لکھاری انتخاب کرتا ہے وہ تشبیہ و استعارے سے مزین ہوتا ہے۔ رومانوی مضامین میں رومانوی مضمون نگار ذاتی تجربات کو تخیل کی جولانی اور فکرِ نو کی آفرینش سے پروان چڑھاتا ہے زبان کو حسن رنگینی عطا کرتا ہے۔ رومانوی مضمون نگار اسلوب کی دلکشی پر زور دیتا ہے اور خیالات میں جذباتی بہاؤ کی شدت نظر آتی ہے۔ مضمون نگار کے موضوعات متحرک، پرجوش اور مترنم ہوتے ہیں۔ یلدرم کا یہ موضوع اپنے اندر کتنی غنائیت رکھتا ہے جو زاہدہ خاتون شیروانیہ کے انتقال پر مختصر اظہارِ خیال ہے:

> "وہ عندلیب خوش الحان جس کے عرفان پاس نغمے اس کی قفس کی تیلوں سے نکل نکل کر ایک عالم کو مسحور کر رہے تھے۔ یکایک خاموش ہوگئی۔ نغمے فضا میں متلاطم ہیں مگر عندلیب ہمیشہ کے لیے ساکت۔"[۲۴]

سر عبد القادر کے مضامین جو رسالہ مخزن میں شائع ہوئے رومانویت کی تحریک کو پروان چڑھانے میں معاون ثابت ہوئے اور رسالہ مخزن نے رومانوی تحریک کو اصل معنی میں متعارف کرایا۔ مخزن میں لکھے گئے مضامین تنقیدی ہو یا ادبی، ہلکے پھلکے مضامین کے زمرے میں آتے ہیں۔ مخزن کو سر عبد القادر نے یورپ کی رومانوی تحریک سے متاثر ہو کر اپریل ۱۹۰۱ء میں جاری کیا۔ سر عبد القادر کی تحریروں میں عقلیت و مادیت کی جگہ سحر انگیزی اور لوچ کے ساتھ ساتھ، احساس تفاخر بھی ملتا ہے۔ جدید نثری آہنگ کی داغ بیل تو یلدرم نے ڈالی لیکن عبدالقادر نے اپنے لہو سے اس کو سینچا ہے۔ "پٹنہ اور خان بہادر مولانا شاد" مضمون کا نثر پارہ ملاحظہ ہو:

> "ان مقامات میں جو تاریخی شہرت رکھتے ہیں، پٹنہ (عظیم آباد) بھی ہندوستان کے قابل ذکر شہروں میں ہے گو اس کی بہار خزاں سے مبدل ہوچکی ہے مگر اس خزاں میں بھی ایک ایسی ادا اس شہر میں پائی جاتی ہے۔ جو نہایت دل فریب ہے اور یہاں کے لوگ آج تک اس کے قدیم علمی مذاق کی یاد دلاتے ہیں۔ یہاں کے نامور شاعر مولانا شاد قدرتی طور پر اپنے وطن کے دلدادہ ہیں، اور ان کے کلام میں جابجا ایسی بے ساختہ توصیف پائی جاتی ہے جو دل نشین ہے۔ "مخزن" کے دربار غیر میں ایک اُردو نظم جناب موصوف کی بھیجی تھی جس میں شاعر کے دل پر درد سے پٹنہ کی قدیم بزرگی کی داستان اور اس کے زوال کا افسوس ناک قصہ درج تھا جس کو بے چشم پر

آب پڑھنا مشکل تھا۔"۲۳

عبد العزیز فلک پیا بھی رومانوی مضامین کے عکاس ہیں۔ ان کے تخیلاتی فضا میں ترنم و آہنگ کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ اُن کے مضمون "مروجہ اُردو شاعری" کا نثر پارہ ملاحظہ ہو:

"اول اول جب زلف وگیسو کے حملے سے فریاد اُٹھی تو اتفاقیہ طور پر قومی تابوت کی تیاری تھی۔ اس وقت کے شہر بانوں نے میلوں سجا کفن پیش کردیا مگر اب تو وہ موقع بھی نہیں۔ اس مردے کی ہڈیاں تک گل چکیں۔ اصلی نہ نقلی کسی قسم کے آنسوؤں کی گنجائش نہیں۔"۲۴

لفظوں کا حسن عبارت کو جمالیاتی پیرہن پہناتا ہے تو مضمون جمالیاتی مضمون نگاری کے زمرے میں آتا ہے اور جس ادبِ لطیف پر ثقیل لفظوں کی حکمرانی نہیں ہوتی بلکہ سبک، زم اور لطیف اندازِ تحریر قاری کو مسرت و حظ پہنچانے کے ساتھ ساتھ مسرت و تازگی عطا کرتے ہیں اور کبھی کبھی لفظی حسن میں پوشیدہ مقصد بھی قاری کو ذہنی ترفع عطا کرتا ہے۔

سجاد انصاری ادب برائے ادب کے قائل ہیں۔ ادب لطیف لکھنے والے جدید گروہ سے تعلق رکھنے والے سجاد انصاری مغربی اثرات کے زیر اثر مترنم و پر کیف اندازِ تحریر کے مالک ہیں لیکن فلسفہ ان کے خیالات میں متحرک نظر آتا ہے ان کے مضامین میں عورت اور عورت سے متعلق نازک احساسات اور جذبات کا فکری ولطیف موضوع زیر بحث رہا ہے۔ "نثرِ خیال" ان کا مختصر تخلیقی سرمایہ ہے۔ جو مضامین چند، غزلوں، نظموں اور "روزِ جزا" ڈرامے پر مشتمل ہے۔

رومانوی مضمون نگاری کے حوالے سے مطالعہ کریں تو کہ مضمون نگاری کی یہ قسم لطیف ادب کی عکاس ہے اور لطیف ادب کے نثر نگاروں نے اپنی انفرادیت برقرار رکھی اور مغرب و مشرق کے علوم سے بھی استفادہ کرتے ہوئے فرسودہ روایات سے بغاوت بھی کی۔ ادب برائے ادب میں خیال کی رنگینی و لطافت تخیلاتی دنیا کی سیر کراتی ہے۔ رومانوی مضمون نگاری کا ایک اور نام خلیقی دہلوی کا ہے۔ جنہوں نے رومانوی نثر کا شاہکار فن پارہ "ادبستان" تخلیق کیا لیکن خلیقی دہلوی کی رومانیت یلدرم کی رومانیت کی طرح مغرب کے اثر میں ڈوبی نظر نہیں آتی۔ "ادبستان" کی رومانیت کا انداز خالص مشرقی ہے۔ خلیقی کا اندازِ تحریر ملاحظہ ہو۔ "تخیل" مضمون میں لکھتے ہیں۔

"تمام ایسے رنگین اشعار جو ذوق کو لذت دیں ایسے نازک اور حسین رخسار۔ جو

نگاہوں کو طراوت بخشیں، اے حسن و محبت سے سرشار حسن تخیل! تیری تانیں ایک خوش
شاعر کے لیے ان سے بھی زیادہ محبوب ہیں۔"۲۵

رومانوی مضامین میں حجاب امتیاز علی تاج کے ہاں نوخیز لڑکی کے جذبات سے بھرپور انشائیہ ملتے ہیں جن میں تخیل کی جولانی بھی ہے اور فکر و احساس کی ترجمانی بھی۔ شاعرانہ نثر میں زندگی کے رموز نکات بھی بیان کیے ہیں۔ اور مصائب و آلام کی گتھیاں بھی سلجھاتی ہیں۔ حجاب امتیاز علی تاج کا نثر پارہ "ادبِ زریں" سے ملاحظہ کیجیے:

"آسمان پر ہوا شور مچا رہی ہے اور زمین پر ہر وقت ایک ہلچل مچی رہتی ہے۔ میرے اطراف کیسی تکلیف دہ شورش ہے! اُف! جنگلوں میں درندے اپنی خوراک کے لیے سرگرداں ہیں اور سمندر میں مچھلیاں اس کشمکش میں اُلجھی ہوتی ہیں۔ اُف! میرے اطراف کیسی تکلیف دہ شورش ہے! پر میں ان سب سے علیحدہ زندگی کے راستے پر خاموش کھڑی ہوں!"۲۶

رومانوی تنقیدی مضامین ایسے مضامین ہوتے ہیں جن میں اندازِ تحریر تاثراتی ہوا کرتا ہے اور یہ جذباتی نثر سے بھی مزین ہوا کرتے ہیں۔ ایسے مضامین لکھنے والوں پر جانبداری کا الزام بھی لگایا جاتا ہے ان میں کہیں خطیبانہ انداز ہوتا ہے کہیں جملوں کی کاٹ نظر آتی ہے اور کہیں تخیلاتی الفاظ اور پرشکوہ آہنگ نمایاں ہوتا ہے۔ دلی لگاؤ سے وابستہ خیالات و احساسات کسی بھی نقاد کی دلچسپی اور تجسس کو ظاہر کرتا ہے۔ نیاز فتح پوری، مجنوں گورکھپوری، فراق گورکھپوری، عبدالرحمٰن بجنوری کے ہاں تاثراتی تنقید کا عکس گہرا نظر آتا ہے۔

نیاز فتح پوری تاثراتی تنقید کے زمرے میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ان کے ہاں جمالیاتی تنقید میں جمالیاتی اقدار کی تلاش اہم ہے لیکن جمالیاتی رنگ نیاز کی اوائل کی تحریروں میں نظر آتا ہے۔ نیاز کے مضامین میں فطرت اور فطرتِ سلیم نمایاں ہیں اسلوب میں ادبیت کی شمولیت نے نیاز پر رومانیت کی چھاپ لگا دی ہے مثلاً ان کے مضمون "اُردو شاعری پر تاریخی تبصرہ" کا لب و لہجہ کہیں کہیں لفظیات سے بھرپور نظر آتا ہے لکھتے ہیں:

"اُردو شاعری کتنی ہی جدید فتوحات حاصل کر لے لیکن وہ اس مملکت میں کوئی فاتحانہ قدم نہیں رکھ سکتی جو میر کے قبضہ میں آچکی ہے۔ زبان کی حلاوت، عاشقانہ فداوگی، والہانہ ربودگی، خستگی و برشتگی کون سی چیز ہے جو اُن کی غزلوں میں نہیں پائی جاتی ہے۔"۲۷

مجنوں گورکھپوری نے نیاز نے زیرِ اثر تاثراتی مضامین لکھنے شروع کیے اگر چہ بعد میں ان کے ہاں ترقی پسند تحریک کا اثر بھی نمایاں ہوجاتا ہے لیکن ''ادب اورزندگی'' اور ''تنقیدی حاشیے'' میں تاثراتی رنگ جھلکتا ہے اُن کے مضامین کا اسلوب رومانوی نظر آتا ہے۔اپنے مضمون ''مصحفی اوران کی شاعری'' میں لکھتے ہیں:

> ''مصحفی بھی اس ''اُجڑے دیار کے رہنے والے تھے'' جو''یورپ کے ساکنوں'' میں آپڑے تھے۔ ولی کی وضع اور اس کی سچائی اور معصومیت ان کا خمیر ہوچکی تھی۔ان کے خون میں وہی معصومانہ تغزل، وہی خلوص شعری حرکت کر رہا تھا جو میر اور درد کا ترکہ تھا لیکن کرتے کیا زمانہ کی ہوا بدل چکی تھی نیا دیس تھا اورنیا بھیس، زمانہ اورماحول دونوں خلافِ مزاج زمانہ کے ساتھ مصالحت بغیر چارہ نہیں تھا۔''[۲۸]

درجِ بالا نثر پارے میں رومانوی تنقیدی اسلوب مجنوں کے نثری لہجہ کوشعریت و آہنگ عطا کرتا ہے مزید براں یہ کہ مجنوں کے ہاں مضامین میں یکسانیت اورسنجیدگی سے فرار کا احساس بھی ملتا ہے۔

فراق گورکھپوری تنقید کا ایک معتبر نام ہے۔ جمالیاتی تنقیدانہ مضامین میں مضمون نگار ادب پاروں میں فنی حسن وقبیح کی کھوج لگاتا ہے۔فراق گورکھپوری نے بھی نیاز کا اثر قبول کیا اوراپنے معاصر مجنوں گورکھپوری کی دوستی کا حق بھی ادا کیا۔ انہوں نے قدیم شاعری کو نئی نسل سے متعارف کرایا۔ اُن کے جملوں کی بازگشت میں گھن گرج نمایاں ہے۔ خیالات علمی تناؤ کے ساتھ ساتھ تضادات کا شکار بھی نظر آتے ہیں۔ الفاظ کی نشست و برخاست ذہنی وابستگی کی عکاس ہے اورجذباتی لگاؤ ان کی تحریروں کا خاصہ ہے۔''اُردو غزل کوئی''، ''اُردو کی عشقیہ شاعری''، ''حاشیے''، ''اندازے'' ایسی کتب ہیں جواُن کی تاثراتی و جانبدارنہ تنقید کے غماز ہیں۔ وہ خود کو صاحب رائے مانتے ہیں اورہر مضمون کے آغاز و انجام کے وسطی حصہ کو بے ترتیب اور بے ربط خیالات کے حوالے کر کے اپنے منتشر تنقیدانہ رویے کا موجب بنتے ہیں۔ اُن کا جمالیاتی ناقدانہ قلم جہاں مسرت و انبساط عطا کرتا ہے وہاں قاری کے ذہن کو اُلجھا بھی دیتا ہے کہ فراق خیالات کے گورکھ دھندے میں کس طور سے نکل سکتے ہیں۔لیکن فراق کی ذہانت مضمون کو ایک منطقی انجام سے ہمکنار کر کے قاری کو مطمئن کردیتی ہے۔فراق کے مضامین سے قدیم شاعری کی خامیوں اورخوبیوں پر روشنی پڑتی ہے اورتنقیدی نظریات شعرا کے فنی مسائل کا بھی احاطہ کرتے ہیں۔ اُردو غزل پر فراق کی تنقیدانہ بصیرت اُن کے روشن خیال ناقد کی عکاس ہے۔اُردو غزل پر فراق کی چھان پھٹک اُن کے مضامین کے تحقیقی مزاج کی بھی نمائندہ ہے اورفراق سے اختلاف کے باوجود ان کے تنقیدانہ رویے سے وہ قائل ہوتے نظر آتے ہیں۔ وہ فن برائے

ادب کے ترجمان ہیں اور ان کا انداز ایک ثقافتی مظہر ہے۔ تنگ نظری اور تعصب کا فراق کی تنقید میں شائبہ تک نہیں۔ اُلجھی اور بے ربط تنقید لکھنے والے فراق کا خلوص ان کے مضامین کو علمی بصیرت اور ترفع عطا کرتا ہے۔ تقابلی تنقید کے نمونے فراق کے مضامین کی پہچان ہیں۔

عبد الماجد دریا آباد، عبد الرحمان بجنوری، مولانا صلاح الدین اور فیض احمد فیض بھی رومانوی تنقید کے علمبردار ہیں۔ عبد الماجد دریا آبادی نے ہر موضوع پر مضامین لکھے ہیں سوانح، فلسفہ، تاریخ، ادب ودیگر موضوعات پر اُن کا قلم متحرک و فعال نظر آتا ہے۔ اُن کا ادبی ذوق قاری کو سحر زدہ کرنے کے ساتھ ساتھ عبد الماجد دریا آبادی کی عصمت پرکھ اور جانکاری سے بھی متعارف کراتا ہے۔ عبد الماجد دریا آبادی مشرقی اندازِ تحریر رکھنے کے ساتھ ساتھ اپنے مضامین میں جامعیت، اختصار اور تنوع کا خاص دھیان رکھتے ہیں۔ ان کے مضامین میں نازگی اور دلکشی نظر آتی ہے اُن کا مضمون ''غالب کا ایک فرنگی شاگرد آزاد فرانسیسی'' تحقیقی مضمون ہے۔ جس میں ندرت اور نازگی نظر آتی ہے۔ اس مضمون کا نثر پارہ ملاحظہ ہو:

> ''الگزیڈر ہیڈرلی ایک فرانسیسی خاندان کے رکن تھے۔ ولادت غالباً ہندوستان ہی میں ہوئی تھی۔ سال ولادت تقریباً ۱۸۲۹ء اٹھارہ سال کی عمر سے اُردو شاعری کا شوق پیدا ہوا مشورہ سخن کے لیے کلام نواب زین العابدین خان عارف (شاگرد عزیز مرزا غالب) اور خود غالب کی خدمت میں بھیجنا شروع کیا۔ ان حضرات کا فیض توجہ کہیے، یا خود آزاد کی طباعی کہ کچھ ہی روز میں اچھی خاصی مشق کرلی اور کلام میں پختگی آگئی جو ایک غیر قوم کی فرد کے لیے بہت بڑی بات ہے۔ عمر نے وفا نہ کی۔ کل ۳۲ سال کی عمر میں ۷ جولائی ۱۸۶۱ء کو انتقال کیا۔ تاہم اس نوعمری میں کلام کا مجموعہ جس قدر ہوگیا تھا۔ وہ اوسط ضخامت کے دیوان کے لیے کافی تھا۔ چنانچہ وفات کے دو ہی برس بعد ان کے برادر کلاں تامس ہیڈرلی نے اس دیوان کو شائع کردیا۔''[۲۹]

عبدالماجد دریا آبادی نے کس قدر جامعیت اور اختصار سے آزاد فرنگی کا تعارف اس تحقیقی مضمون میں کرایا ہے۔ ان کے تحقیقی و تنقیدی مضامین فکر و نظر کے ساتھ ساتھ دلکش پیرائے اسلوب کے حامل مضامین ہیں۔ ان کے جملے جذباتی، رومانی، پر جوش اور حسین ہوتے ہیں۔

رومانی نقاد ذہنی طور پر بے فکر و آزاد ہوتا ہے۔ اس لیے جذبات نگاری اور ذاتی تخیل و تاثرات اس کی تنقید کا اہم حصہ ہوا کرتے ہیں لیکن گہرے فلسفیانہ خیالات بھی ان جذبات کے ساتھ ساتھ ناقد کی فکر کو

نئی جہت عطا کرتے ہیں۔عبد الرحمٰن بجنوری کے مضامین بھی فکر کی نئی جہت اور جذبات نگاری کی ہم آہنگی سے مربوط ہیں۔ مضامین بجنوری میں اسلوب بیان کی شگفتگی ملتی ہے لیکن جذبے کی فراوانی اور تخیل کی پُرکاری ان کے مضامین کو رومانوی مضمون نگاری کے زمرے میں لاکھڑا کرتے ہیں۔

عبد الرحمٰن بجنوری کا ناقدانہ اندازِ بیان مرصع ہے ۔جو تنقیدی اُصولوں کے خلاف ہے۔ اگر چہ اُن کے خیالات و موضوعات میں ہم آہنگی نظر آتی ہے لیکن اُن کا اسلوب اُن کے رومانوی نقاد ہونے کی چغلی کھاتا ہے۔ مبالغہ آمیز فقرے بجنوری کی تحریروں کو بوجھل و ثقیل بھی کر دیتے ہیں۔ان کی شاعرانہ انداز نقد کا یہ نثر پارہ ملاحظہ ہو:

> ''لکھنؤ میں جہاں اور چیزیں قابل دید ہیں۔ چند تصویریں بھی ہیں۔تصویریں کیا ہیں گویا شاہان وزیران اودھ کی تاریخ کے چند اوراق ہیں جو زمانے کے دستبرد سے بچ رہے ہیں، یا یوں کہئے کہ اس کارواں کے نقش پا ہیں جو اودھ کی خاک پاک سے آج نصف صدی گذاری اپنا کوچ کر کے چلا گیا ہے اور جس نے اس دنیا کو خیرباد کہہ کر اس سر زمین کو آباد کیا جہاں حیاتِ انسانی ابدی ہے۔''[۳۰]

رومانوی تنقید میں مولانا صلاح الدین احمد اپنا منفرد مقام رکھتے ہیں۔ اُن کے مضامین ''ادبی دنیا'' میں شائع ہوتے رہے اور تنقید کے مختلف پہلوؤں کو روشن کرتے رہے۔مولانا صلاح الدین کے تنقیدی مزاج میں فکر وفلسفہ کے ساتھ ساتھ اسلوب کی چاشنی اور فن کی ترجمانی ملتی ہے۔ اُن کے مضامین زندگی کا عکس دکھلاتے ہیں لیکن جمالیاتی اندازِ تحریر بھی اُن کے مضامین میں نظر آتا ہے۔موضوع کی وسعت، علم کی ترسیل اور رعنائی خیال میں ملفوف یہ مضامین نہ صرف ''ادبی دنیا'' کو مایہ ناز پرچہ بناتے ہیں جبکہ مولانا صلاح الدین کی فکری جہت کے بھی عکاس ہیں۔ان کے مضامین ادب برائے فن کے نمائندہ مضامین ہیں۔ان کے مضامین کو ''صریر خامہ'' کے نام سے تین جلدوں میں مرتب کیا گیا ہے۔جن کے نام ''تصورات اقبال، ''محمد حسین آزاد''، اُردو میں افسانوی ادب'' ہیں۔مشرقی اندازِ تنقید رکھنے کے باوجود مولانا صلاح الدین مرصع اسلوب کے حامی تھے جملوں میں حسن اُن کے نزدیک ادبی ذوق کی عکاسی کرتا ہے۔ لانجائنس کے نزدیک حسین الفاظ خیال کے لیے روشنی ہوا کرتے تھے۔مولانا صلاح الدین بھی لانجائنس کی طرح جمالیاتی ذوق کو ادب کی پہچان قرار دیتے ہیں۔ اُن کے مضامین میں تنوع، جدت کے باوجود ہمیں لفظی پیکر تراشے نظر آتے ہیں۔مولانا ادب کو زندگی کا ترجمان قرار دینے کے باوجود ادب کے ذریعے ملنے والے حظ مسرت کو اہم اور

ضروری سمجھتے ہیں۔ان کے اسلوب میں علمِ بدیع، علمِ بیان، تراکیب شعری اور تمثیلی انداز نظر آتا ہے۔

طنز و مزاح انسانی جہت حصہ کا ہے۔ جب سے انسان نے جنم لیا ہے وہ احساس ظرافت سے مانوس نظر آتا ہے۔ معاشرتی رویوں اورادبی نظریوں کی تبدیلیوں میں بھی طنز و مزاح کی اہمیت مسلم ہے۔ سرسید کی عقلی و منطقی تحریروں نے ''اودھ پنچ'' کے مصنفوں کو سرسید کی مخالفت پر مجبور کیا۔ سرسید کا رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' دسمبر ۱۸۷۰ء میں منظر عام پر آیا۔ جبکہ ''اودھ پنچ'' ۱۸۷۷ء میں منظر عام پر آتا ہے۔ جو معاشرتی انحطاط اور اخلاقی زوال پر ایک تازیانہ تھا۔ اس رسالے کے توسط سے پہلی بار اُردو مضمون نگاری میں طنزیہ و مزاحیہ مضمون نگاری کا آغاز ہوا۔ کٹیلی و طنزیہ تحریروں کے ذریعے معاشرے کی ناہمواریوں اورتنزل پذیر ماحول کی عکاسی کی گئی ہے اس رسالے کے مدیر منشی سجاد حسین تھے جنہوں نے انیسویں صدی کے آخر میں طنز وظرافت کے ذریعے مضمون نگاری کو وسعتِ موضوع عطا کی۔ ہلکے پھلکے مضامین جن میں ادبی چاشنی بھی موجود ہو، مضمون نگاری میں مزاح نگاری کا اضافہ کرتے ہیں۔فقروں کی کاٹ، زبان کی مہارت اورواقعات کی منظر کشی طنز وظرافت سے بھرپور مضامین کا خاصہ ہوتی ہیں۔ تخیل اعلیٰ کی وساطت سے اِصلاح معاشرہ کا کام لیا جاتا ہے۔ لیکن رکاکت، پھکوپن کسی بھی مزاحیہ مضمون کی ادبی حیثیت کو کم کردیتی ہے ''اودھ پنچ'' کی ظرافت بھی اکثر سطحی اور عامیانہ ہوا کرتی تھی۔

طنز و مزاح پر مبنی مضامین میں مزاح کے لبادے میں ہمدردی بھی پوشیدہ ہوتی ہے اورطنز و تشنز کے پیرہن میں اصلاح پیش نظر ہوتی ہے۔ ایسے مضامین میں مصنف کسی بھی عنوان کے تحت کسی معاشرتی اور مزاح پیدا کیا جاتا ہے۔ اخلاقی برائی پر چوٹ کرتا ہے۔ ایسے مضامین میں لفظوں اور واقعات کے تحت۔ ''اودھ پنچ'' کا مواد ظریفانہ ہونے کے باوجود اخلاقی، سماجی، سیاسی رویوں کے خلاف ایک تجزیاتی و استدلالی تحریک بھی تھا۔ اگرچہ صحت مند طنز ''اودھ پنچ'' کا اصل مدعا تھا۔ لیکن پھر بھی اس رسالے کے قہقہوں، مسکراہٹوں نے اپنے ماحول کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ رسالہ نقوش طنز و مزاح نمبر میں ڈاکٹر خورشید السلام لکھتے ہیں:

> ''اودھ پنچ'' کی ظرافت میں گہرائی اورطنز میں گہرائی کی کمی ہے لیکن ہمیں زمانہ کی پابندیوں اورمجبوریوں کو ذہن سے یکسر محو نہیں کرنا چاہیے۔''اودھ پنچ'' کی ظرافت ثقیل ہے مگر نمک سے خالی ہے۔''[۳۱]

طنز و مزاح کی یہ دولت آگے چل کر فرحت اللہ بیگ، پطرس بخاری، رشید احمد صدیقی تک پہنچتی ہے جس پر آگے باب میں بحث کریں گے۔



"میرزا الم نشرح" کے نام سے لکھنے والے مرزا فرحت اللہ بیگ نے جو مضامین لکھے وہ مزاح کی چاشنی بھی لیے ہوئے ہیں اور کہیں مضامین تحقیقی و تنقیدی بصیرت سے بھی پُر نظر آتے ہیں۔ ان کے مضامین میں دلی کی مٹتی تہذیب کا نوحہ بھی ملتا ہے۔ اُن کے مضامین درد، کسک کے ساتھ ساتھ ہلکی طنز کی آمیزش بھی ملتی ہے۔ جہاں اُن کے مضامین قاری کو ذہنی گدگدی سے ہمکنار کرتے ہیں وہاں اُن کے مضامین اپنے دور کے عوام کی اجتماعی، اخلاقی خودکشی کا عذاب اوراس عذاب کے دُکھ کے بھی علمبردار ہیں۔ دلی کی تہذیب کے تاراج ہونے کا عکس اُنہوں نے جن مضامین میں دکھایا ہے وہاں اپنے قلم سے انصاف کیا ہے۔ ریاکارانہ یا منافقانہ رویہ نہ تو اُن کے قلم نے اپنایا، نہ اُن کے تخیل نے اورنہ ہی ان کا اسلوب کسی غلو کا شکار ہوا۔ بلکہ قد آور شخصیات پر جو بھی مضامین فرحت اللہ بیگ نے لکھے وہ ان شخصیات کی تحقیقی تصویر بن کر سامنے آتے ہیں۔ ظریفانہ مضامین کا یہ اہم اُصول ہے کہ ان مضامین میں حقیقی تصویر دکھائی جائے۔ فرحت اللہ بیگ کے شخصی مضامین میں قاری جہاں قد آور شخصیات کے کارہائے نمایاں سے جانکاری حاصل کرتا ہے وہاں ان شخصیات کی کمزوریوں اور کوتاہیوں سے بھی متعارف ہو کر ہونٹوں میں دبی ہنسی کو آزادی عطا کرتا ہے اور قاری کھل کر ہنسنے پر آمادہ ہوتا ہے جس سے ایک طرف تو قاری کی ذہنی ورزش ہوتی ہے اور دوسری طرف اس کی اپنی کردار سازی بھی ہو جاتی ہے مثلاً "نذیر احمد کی کہانی کچھ میری کچھ اُن کی زبانی" میں سے یہ نثر پارہ دیکھیے:

> "پڑھاتے جاتے تھے اورکھاتے جاتے تھے مگر مجھ کو ایک حسرت ہی رہ گی کہ کبھی شریک طعام نہ ہوسکا---- خیر ان پٹھانوں کی جماعت کی تو کیا صلاح کرتے انکے لیے مولوی صاحب کا ناشتہ اونٹ کی داڑھ میں زیرہ ہو جاتا۔ البتہ ہم دونوں کی صلاح نہ کرنا غضب تھا کہتے بھی جاتے تھے "بھئی کیا مزے کا خربوزہ ہے" میاں کیا مزے کا آم ہے مگر غذا نے کبھی یہ نہ کہا بیٹا چکھ کر تو دیکھو یہ کیسا ہے۔"[۳۴]

فرحت کے مضامین میں طنز وظرافت کا عنصر دل آزاری کا سبب نہیں ہے اورنہ ہی عامیانہ پن کا احساس ملتا ہے بلکہ صحت مند طنزیہ وظریفانہ نثر پارے اُردو ادب کا وہ لازوال سرمایہ ہیں کہ جس نے اس صنف کو تنوع و وسعت عطا کی اور ہم فرحت کے مضامین کے ذریعہ ان کے مضامین کے جملوں اورلفظوں میں چھپے مزاح سے لطف اندوز ہوتے ہوئے فرحت کی ذہانت کی داد بھی دیتے ہیں۔ برجستہ اور برمحل اندازِ بیان فرحت کے مضامین کا خاصہ ہیں۔ طنزیہ مضمون نگاری کا یہ اہم نقطہ ہے کہ بات سے بات پیدا کی جائے،

فرحت کو بات سے بات پیدا کرنے کا سلیقہ بھی ہے اوراپنی زبان دانی پر فخر بھی، کیونکہ ظریفانہ مضمون کے اندازِ بیان کا جھول مضمون کی شکل کو بگاڑ دیتا ہے لیکن اس کی ترتیب، روانی اور برجستگی ظریفانہ مضمون کی عمر اور آبرو بڑھاتی ہے۔فرحت کے مضامین کی عمر بھی طویل ہے اور آبرو بھی محفوظ و مستحکم اس لیے فرحت اُردو طنز و مزاح میں اپنے مضامین کی بدولت ایک قد آور شخصیت بن کر اُبھرے ہیں۔

پطرس بخاری مزاح کی دنیا کا ایک اورمعتبر نام جس نے اس صنف کو نیا رخ عطا کیا۔ وہ اپنی طرز کے خودموجد تھے۔ ان کے ظریفانہ مضامین میں عالمانہ تدبیر حاوی تھی۔انسانی کمزوریوں کا احاطہ کرنے والے یہ مضامین انسان دوستی کا درس دیتے ہیں۔ان میں یہ بھی خاصیت ہوا کرتی ہے کہ برائی کو سبب بنا کر اسکا تدارک بھی کیا جائے۔ایسے مضامین اعلیٰ پائے کے مضامین کہلاتے ہیں۔ پطرس انسان کے ناپختہ ذہن کو بالیدگی عطا کرتے ہیں اورواقعات والفاظ سے مزاح پیدا کرتے ہیں۔ان کے مضمون ''مریدپور کا پیر'' میں الفاظ و واقعات کا حسین امتزاج ملاحظہ ہو:

> ''مثلاً آپ لکڑیوں کے ایک گٹھے کو لیجیے،لکڑیاں اکثر مہنگی ملتی ہیں وجہ یہ ہے کہ اس لیے ہندوستان میں افلاس بہت ہے۔ گویاچونکہ اکثر لوگ غریب ہیں اس لیے گویا لکڑیوں کا گٹھا، یعنی آپ دیکھئے نا کہ اگر''
>
> (بلند اورطویل قہقہہ)
>
> حضرات! اگر آپ نے عقل سے کام نہ لیا تو آپ کی قوم فنا ہوجائے گی نحوست منڈلا رہی ہے (قہقہے اور شوروغوغا) سے باہر نکالو ہم نہیں ہنستے۔''[۳۳]

سچی اورتلخ حقیقتوں کو ہلکے پھلکے مزاح کے پیرائے میں بیان کرنا پطرس ہی کا مزاج تھا۔ ذہنی بالیدگی، ذہنی ترفع اورمشرق ومغرب کی آمیزیش نے پطرس کے مضامین کو ترفع عطا کرتے ہوئے انہیں اپنی طرز کا موجد بنادیا۔ دانشور پطرس نے عوامی سطح پر اُتر کرعوامی کمزوریوں،عوامی مصائب اوراحساس کمتری کو بھانپ کر ان کی عادات و اطوار، جہالت و ذہانت، طبقاتی کشمکش، کلچر و سماج کی تنزلی اورزبان کی ناقدری جیسے اہم موضوعات پر قلم اُٹھایا۔ وہ طنز کے نشتر لگانے کے ساتھ ساتھ مزاح کا مرہم بھی لگاتے ہیں گویا مزاحیہ وطنزیہ مضمون نگار وہ مزاح نگار ہوتا ہے جو معاشرے کے ناسوروں کا آپریشن کر کے فاسد مواد بھی نکالتا ہے اورتدبیر وتعمیر سے دوا دارو کرتا بھی ہے مزاحیہ مضمون نگار ہرانسان کی ظاہری و باطنی غلط فہمیوں اورخوش فہمیوں کا ازلہ بھی کرتا ہے اوریہ خصوصیات پطرس کوطنز ومزاح کی دنیا کا بے تاج بادشاہ بنادیتی ہے۔

پطرس کا ایک لازوال شاہکار ''مرحوم کی یاد میں'' ہے میں نے یہ مضمون پہلی بار میٹرک میں پڑھا تھا آج کئی برس کے بعد بھی اس کو پڑھنے سے وہی لطف، چاشنی اور وہی مزاح نظر آیا جو پہلی بار پڑھنے سے نظر آیا تھا اور یہی ظریفانہ مضمون نگاری کا کامیاب اُصول ہے کہ تحریر جاندار، پر لطف اور بامعنی ہونے کے ساتھ ساتھ عامیانہ پن سے گریزاں بھی ہو۔ پطرس واقعی نباض شناس انسان تھے۔ وہ بہت آگے کی سوچتے تھے۔ ان کے مضامین مثلاً ''کتے''، ''میبل اور میں'' زندہ اور متحرک مضمون ہیں۔ ان کا ہر مضمون ایک نشتر ہے، ان کا ہر فقرہ ایک نصیحت، حالانکہ وہ براہِ راست نصیحت کے قائل نہیں لیکن کامیاب مزاح کا ایک اُصول یہ بھی ہے کہ اس کی نصیحت قاری پر اثر کرے لیکن قاری اسی نصیحت کو نصیحت سمجھ کر ذہنی دباؤ کا شکار نہ ہو بلکہ یہ نصیحت ذہنی ترفع کا سبب بنے اور نصیحت نہ لگے بلکہ زندگی بتانے کا فن نظر آئے۔

رشید احمد صدیقی کی آمد مزاحیہ مضمون نگاری کی دُنیا میں ایک خوشگوار آمد ہے اور ان کے مضامین ایک تازہ ولولہ اور احساس بیدار کرتے ہیں۔ وہ ناقدانہ بصارت و علمی بصیرت اور مطالعاتی طنز سے معاشرے کے ایسے موضوعات پر قلم اُٹھاتے ہیں جو انسان کی محرومیوں، کمزوریوں اور کوتاہیوں کے موضوعات ہیں۔ رشید احمد صدیقی ''اگر دنیا میں ڈاکٹر نہ ہوتے'' میں لکھتے ہیں:

> ''زکام کی ابتداء وہ نمونیا سے کریں گے اور نمونیا کو دق کا مقدمہ بتائیں گے۔ ہر بخار کو ٹائیفائڈ یا میعادی بخار کا پیش خیمہ قرار دیں گے اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے انتہائے مدت کا بھی تذکرہ کریں گے اور ضمناً مریضوں کے بھی نام بتائیں گے جو اس مرض میں اپنی معیادِ حیات ختم کر چکے ہیں۔''[۲۴]

رشید احمد صدیقی کے یہ مضامین قاری کو جو ذہنی ترفع عطا کرتے ہیں وہ قاری کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ انکی کمزوریاں اور کوتاہیاں ہی معاشرے میں بگاڑ کا اصل سبب ہیں۔

رشید احمد صدیقی کا مزاح زندگی کی منظر کشی کرنے کے ساتھ ساتھ انسانی نفسیات کا بھی نباض نظر آتا ہے۔ وہ مزاج اور ماحول پر مکمل حاوی نظر آتے ہیں۔ علمی ترفع ان کے مزاح میں تنوع کے ساتھ ساتھ خوش کن لب و لہجہ بھی عطا کرتے ہیں۔

الفاظ کی جادوگری، خیال کی شوخی اور بیان کی دلکشی نے رشید احمد صدیقی کے مزاح کو زندہ اور متحرک بنا دیا ہے اور سیاسی، ادبی، اخلاقی و معاشرتی ہر قسم کے موضوعات پر ان کا قلم نرم، سبک انداز میں رواں ہوتا ہے وہ قاری کو اپنے تخیل کی جولانیوں کی سیر بھی کراتے ہیں اور معاشرے کے مسائل کی نشاندہی بھی کرتے ہیں۔

ملا رموزی کا نام بھی ادبی ظرافت میں ایک اہم مقام رکھتا ہے۔ ان کے ہاں ظرافت میں برجستگی اور لطافت ہے۔ نکاتِ رموزی حصہ اول و حصہ دوم میں ان کے ظریفانہ مضامین ملتے ہیں۔ جن کی نثر تخیلاتی نثر کا بہترین نمونہ ہے۔ ملا رموزی "نوجوان انگریزی دان مضمون نگار" جیسے پر لطف مضمون میں لکھتے ہیں:

> "ان لوگوں کے پیش نظر خدمت میں زیادہ شہرت ہوتی ہے۔ اس لیے زبان کی صحت اور فصاحت، سلاست وغیرہ کی پابندی نہیں فرماتے۔ اس محترم طبقے کے لوگ پرانے مضامین چرا لینے سے بھی نہیں۔ مگر مضمون نگارانہ غرور اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ عینک لگا کر شام کو کسی پر فضا مقام پر ضرور جاتے ہیں۔ نصف آستیں پہن کر مضمون لکھتے ہیں۔ ان کے مضامین میں صرف شوکت لفظی ہوتی ہے اور بس۔"۲۵

قاضی عبد الغفار، سلطان حیدر جوش، حاجی لق لق، چراغ حسن حسرت، شوکت تھانوی، شفیق احمد، عبدالمجید سالک و دیگر مزاح نگاروں نے اُردو ادب میں طنز و مزاح کے سرمایہ میں اضافہ کیا ہے۔ اُردو ادب میں تاریخی مضمون کا آغاز عہد سرسید سے ہوا۔ سرسید نے "آثار الصنادید" لکھی۔ مولانا محمد حسین آزاد نے "دربار اکبری" لکھی اور شبلی نعمانی نے اپنے مورخانہ لہجے میں کتب اور مقالے لکھے۔ جبکہ مولوی ذکاء اللہ کے ہاں بھی تاریخی نثر نظر آتی ہے۔

تاریخی مضامین میں اعداد و شمار واقعات کی صداقت کے ساتھ ساتھ تحقیقی اسلوب بھی شامل ہے۔ تاریخی مضامین کی بنیاد علم پر ہوتی ہے۔ ماضی، حال، مستقبل کی تاریخ کے آئینے میں واضح شبیہ نظر آتی ہے۔ تاریخی مضامین کی اقسام ادبی، علمی اور سیاسی ہوتی ہے۔ تاریخی مضامین میں قوتِ تخیل سے احتراز کرتے ہوئے واقعات کی جزئیات کا خیال رکھا جاتا ہے۔ ان مضامین میں ترتیب واقعات درست ہونا لازمی امر ہیں یہ مضامین بڑے محتاط انداز میں بڑی چھان پھٹک کے بعد لکھے جاتے ہیں۔ انہیں دستاویزی تحقیق بھی کہتے ہیں۔ تاریخی مضامین متحرک ہونے چاہیں۔ ان مضامین میں جمود کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ اس میں تہذیب، جنگ، منظر، پس منظر، پیش منظر، عشق و محبت، معاشرت، دین و مذہب، تعصّبات، دوستی دشمنی، عبرت و شکست، آغاز و انجام، تصادم، تضاد، طبقاتی، کشمکش، اخوت و مساوات، اختلاف و رفاقت، سازشیں، علوم و فنون، مدرسے، خانقاہیں، ان تاریخی مضامین میں رقم کیے جاتے ہیں لیکن شعور کے ساتھ ساتھ حقائق کی صداقت اور دیانت تاریخی مضامین کا اہم اور مرکزی اُصول ہے۔ مرزا محمد سعید نے تاریخی وسوانحی مضامین لکھے۔ "لیڈی کرزن" پر لکھا ہوا، ان کا مضمون لیڈی کرزن کی حیات پر روشنی ڈالتا ہے۔ "تاج آگرہ" محمد سعید کا ترجمہ

ہے۔ یہ مضمون تاریخی حقائق اور اسلوب سے مزین ہے۔ ایک نثر پارہ ملاحظہ ہو:

"یہ عمارات دائمی جیتی جاگتی ممتاز محل ہے۔ جو اس فانی ممتاز محل کی یادگار ہے جس کا جسم اس میں مدفون ہے اور دریائے جمنا کے شفاف پانی پر صبح کی سپیدی میں، دوپہر کے سورج کی تیز کرنوں میں، شام کی دھندلی روشنی میں غرض ہر وقت اپنے نور کی ضیاء ڈالتی رہتی ہے لیکن جس کی فردوس و خوب صورتی چاند کی ہلکی ذرپھری روشنی میں اور بھی دوبالا ہوجاتی ہے۔"۳۶

حسن برنی کا نام بحیثیت مورخ ایک جانا مانا نام ہے۔ ان کے مقالات کے دو مجموعے "مقالات برنی" حصہ اوّل، حصہ دوم ہیں۔ جن میں تاریخی مضمون سلاطین، تاریخ برصغیر، مشاہیرِ اسلام پر مبنی ہیں۔ استدلال، منطق اور تحقیق کے ساتھ ساتھ صداقت اور تنوع ان کے مضمون کا خاصہ ہے۔ حسن برنی ایک مورخ کی حیثیت سے تخیل کی کارفرمائیوں سے گریز کرتے ہیں۔ اور متانت و بردباری سے تاریخی شواہد و عوامل اکٹھا کرکے قلم اُٹھاتے ہیں۔ حسن برنی کے مضمون "عہد فیروزی میں شاہی عید" کا نثر پارہ ملاحظہ ہو:

"جب ایک دن گھڑی چڑھ جاتا ہے۔ فیروز شاہ عیدگاہ کے لیے سوار ہوتا ہے اور سب لوگ بھی مجلس جشن کے باہر نکل آتے، کبھی بادشاہ ہاتھی پر اور کبھی گھوڑے پر سوار ہو جاتا۔ ایک چھتر سلطان کے سر پر لگا ہوتا اور دوسرا تغلق شاہ کے سر پر تغلق شاہ بادشاہ کے کچھ آگے چلتا ہے۔ باقی تمام چھتر محل جشن میں لگے رہ جاتے تھے۔"۳۷

شمس اللہ قادری کے تاریخی مضامین کی نمایاں خوبی ان کی طوالت ہے۔ نثری اسلوب مکمل تاریخی ہے اور اعداد و شمار اور تاریخی سنائن کی کھوج و جستجو کے شاہد ہیں۔ مضمون نگاری کی ایک قسم تحقیقی مضمون نگاری کی ہے۔ تحقیق عربی زبان کا لفظ ہے۔ حق اس کا مادہ ہے اور اس کے معنی صداقت کی تلاش ہے۔ تحقیق مخالف کے افکار کو علم و صداقت کی بنیاد پر رد کرنے یا افکارِ مخالف کو اعلیٰ ظرفی سے قبول کرنے کا نام ہے۔

تحقیق اصل حقائق کی جستجو ہے۔ انجان راہ گزاروں پہ سفر کرنا اور آگاہی سے متعارف ہونا تحقیق کا دائمی اصول ہے۔ تحقیق کرنے والے محقق کہلاتے ہیں اور محققین کے لیے لازم ہے کہ وہ ایسے موضوع تلاش کریں جن میں جدت اور نیاپن ہو۔ پرانے اور فرسودہ موضوعات پر تحقیقی مضامین لکھنا وقت کا ضیاع ہے۔ تحقیقی مضامین صرف اس لیے نہیں لکھے جانے چاہیں کہ دوسروں کی غلطیاں نکالی جائیں بلکہ تحقیق کا مدعا یا مقصد کسی فن پارے، شاعر یا ادیب یا مقامات و عمارات کو گمناموں سے نکال کر منظر عام پر پیش کر کے



دنیائے ادب میں اضافہ کرتا ہے۔ مثلاً ملا وجہی کی ''سب رس'' کو مولوی عبد الحق نے گمنامیوں سے نکال کر تحقیق ادب کا نایاب جوہر قرار دیا ہے۔ ۲۰۱۰ء آزاد کا صد سالہ جشن کا سال ہے۔ ایسے میں آزاد کے حوالے سے جو بھی نئی تحقیق سامنے آئی وہ تحقیق کے زمرے میں نئی دریافت کہلائے گی۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری ''ادبی تحقیق کے اُصول'' میں تحقیق کی یوں تعریف کرتے ہیں:

> ''تحقیق تو نئے حقائق اور نتائج کی دریافت کا نام ہے جس میں تصورات کی نئی تعبیر کی جاتی ہے۔''۳۸

تحقیقی مضامین کا اسلوب روایتی اسلوب سے یکسر مختلف ہوتا ہے۔ اس میں عبارت آرائی نہیں ہوسکتی ہے اور تحقیقی اصطلاحات کا حامل اسلوب ہی تحقیقی مضامین کا اسلوب ہوتا ہے، ٹھوس شواہد اور اعداد وشمار ہی تحقیقی مضامین کا سرمایہ ہیں۔ تحقیق ہوا میں گرہ نہیں باندھی تھی مثلاً جھیل سیف الملوک کا محقق جھیل کے حسن میں کھونے اور پریوں کے جھیل پر آنے کے تصورات میں گم ہونے کے بجائے جھیل کی طول و عرض، گہرائی اور اس کے سن تعمیر کے حوالے سے تحقیق کرے گا۔ تحقیقی مضامین لکھنے والا محقق کہلاتا ہے اور محقق کا مطالعہ، مشاہدہ بھرپور ہونا چاہیے۔ کھوج و دریافت میں محقق کو معتبر ذرائع کے حصول کے لیے انتھک محنت کرنا ضروری ہے۔ تحقیقی مضمون لکھنے والے میں یہ حوصلہ بھی ہونا چاہیے کہ پوری تحقیق کسی نئی تحقیقی مواد کی بنا پر ریت کی دیوار ثابت ہوسکتی ہے۔ ایسے میں محقق کو گھبرانا نہیں چاہیے بلکہ جرأت و بہادری و عقلمندی سے ایک نئے عزم اور حوصلے کے ساتھ تحقیق کی عمارات کی بنیادیں نئے سرے سے رکھنی چاہیے جیسے رشید حسن خاں نے ''فسانہ عجائب'' کے آخری نسخہ کے ملنے پر نئے سرے سے فسانہ عجائب پر کام شروع کیا۔ اُردو مضمون نگاری کے حوالے سے اگر تحقیقی مضمون نگاری کا جائزہ لیں تو حافظ محمود شیرانی، مولوی عبد الحق، مولانا شفیع محمد اور مولانا امتیاز علی خاں عرشی کے نام سرفہرست ہیں۔

حافظ محمود شیرانی نے ''پنجاب میں اُردو'' لکھ کر اعلیٰ پائے کا محقق ہونے کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ آپ کے تحقیقی کاموں سے دنیائے ادب میں معتبر اور نامعتبر تحقیقی ذرائع و شواہد کی ایک واضح صورت سامنے آتی ہے اُن کے محققانہ مضامین زیادہ تر رسالہ ''اُردو'' اور رسالہ ''اورینٹل کالج میگزین'' میں شائع ہوتے رہے۔ شیرانی کے تحقیقی مضامین متانت و جودتِ طبع کا بین ثبوت ہیں۔ ایرانی و ہندوستانی نادر نسخوں کی کھوج اور اُن پر دل جمعی سے کام کرنا شیرانی کا طرہ امتیاز رہا ہے۔ تحقیق، تنقید، تاریخ، لسانیات، تدوین غرض کہ ہر موضوع

پر حافظ شیرانی کے تحقیقی مقالات دُنیائے تحقیق کے آبرو بڑھاتے نظر آتے ہیں۔علمی حقائق کی تلاش اور شبہاتی مآخذ کی بیخ کنی اُن کی معتبر تحقیق کا مرکز ومنبع تھا۔ وہ دلائل و براہین سے اساسی نسخہ کو منظر عام پر لا کر تحقیق کے تمام شبہاتی در بند کر دیتے ہیں۔

شیرانی کی تحقیق منطقی ہونے کے ساتھ ساتھ سائنسی و میکانکی انداز بھی رکھتی ہے۔تحقیق میں شیرانی داخلی شہادتوں کو معتبر گردانتے ہوئے جستجو محنت اورکھوج کو اہم قرار دیتے ہیں۔شیرانی کے نزدیک تحقیق کسی محقق کے کام کی غلطیاں نکالنا ہی نہیں ہے بلکہ تحقیق کا اصل مدعا یہ ہے کہ دوسرے محققین کے کام کو پہلے سراہا جائے اوراس میں موجود تحقیقی مواد کی کوتاہیوں اورکمزوریوں پر نظر ڈال کر اصل تحقیقی مواد مہیا کر کے اس موضوع پر روشنی ڈالی جائے۔ یوں پہلے محقق کی تحقیق کے مثبت ومنفی کام کی نشاندہی بھی ہوجائے گی اور نئی دریافتیں اور نئے مآخذ بھی سامنے آجائیں گے۔ یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ شیرانی تحقیق میں نئے امکانات اورجستجو کے در بھی وا کرتے ہیں اور پرانی تحقیق کی تصحیح بھی کرتے ہیں۔

تحقیق میں مولوی عبد الحق کا نام ایک بڑا نام ہے آپ نے تحقیق وتدوین، خطبات، مقدمات، تنقید، تبصرے، لغت، قواعد گویا زبان وادب کے تمام دائروں میں اپنی گراں بہا خدمات کے نقوش چھوڑے ہیں۔ اورانہیں خدمات کا اعتراف میں ان کو ''بابائے اُردو'' کا خطاب بھی ملا ہے۔

اُردو ادب میں مولوی عبد الحق کے مقدمات کی بدولت ہی تحقیق کا میعار بلند ہوا ہے۔ مولوی صاحب نے پہلی بار یہ باور کرایا کہ تحقیق کا اصل کام اہم حقائق کی نشاندہی کرنا اورادب و ادیب کی رہنمائی ہے۔اس رہنمائی کا ادبی ذوق وشوق اور تنقیدی شعور سے گہرا رشتہ ہے مولوی صاحب کے ہاں اعلیٰ درجے کا تحقیقی مواد و معیار زیادہ تر اُن کے مقدمات میں نظر آتا ہے جو اُردو شعرا کے قدیم تذکروں اور بعض قدیم ترین تصانیف کے لیے لکھے گئے ہیں۔جن میں ''سب رس''،''نکات الشعراء''، ''گلشن عشق''، ''دیوانِ اثر''، ''باغ و بہار'' وغیرہ شامل ہیں۔مولوی صاحب کا تحقیقی کام ان کی محنت، دیانت، خلوص نیت، اورتحقیقی امانت پر مبنی ہے اوریہی مولانا صاحب کی تخلیقی صلاحیتوں کی آئینہ دار بھی ہے۔مقدمہ ''باغ وبہار'' کے حوالے سے مولوی صاحب کی ٹھوس دلیل ان کی تحقیقی کاوش کی چکاس ہے مولوی صاحب لکھتے ہیں:

> ''فارسی اور نوطرز مرصع'' کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ''باغ و بہار'' فارسی کتاب کا ترجمہ نہیں بلکہ اس کا مآخذ ''نوطرز مرصع'' ہے۔تعجب اس بات کا ہے کہ میرامن نے فارسی کتاب اوراس کے ترجمے کا ذکر کیا۔مگر ''نوطرز مرصع'' کا ذکر صاف اُڑا

گئے۔اب میں تینوں کتابوں سے بعض مقامات کا مقابلہ کرکے دکھاتا ہوں جس سے
میرے بیان کی پوری تصدیق ہوگی۔"۳۹

مولوی شفیع محمد کا نام بھی تحقیق ادب میں ممتاز مقام رکھتا ہے۔تفتیش، تشویش، تہذیب، ترتیب، ترسیل، تکمیل مولوی شفیع محمد کے تحقیقی کاموں کا خاصہ ہیں اور اس بناپر ان کی تحقیق اُردو ادب و تحقیق کی اعلیٰ پائے کی تخلیق بن کر اُبھرتی ہے۔مولوی صاحب کافکر رسا ذہن شب و روز کی انتھک، محنت اور چھان پھٹک کے بعد کسی فن پارے کے تحقیقی مواد کے متعلق حتمی رائے دیتا ہے۔مولوی صاحب کے مقالات کا مطالعہ کریں تو مولوی صاحب کے تحقیقی مقالات کا تحقیقی نقطہ نظر واضح، مدلل اورصداقت و ریاضت کے ساتھ ساتھ شب و روز انتھک محنت پر مشتمل ہے۔مولانا نے نہ صرف برصغیر پاک و ہند کے تحقیقی سرمایے کو کھنگالا بلکہ دنیائے ادب کے تحقیقی سرمایے کو تاریخی مواد کی جانچ پڑتال کرکے اُسے ضائع ہونے سے بچالیا۔مولانا اپنے تحقیقی "مضمون خطاطی کے نمونے" کا آغاز اس طرح کرتے ہیں:

"پانچویں صدی سے دسویں صدی ہجری تک کے نمونے جو ایک کتاب میں شائع
کیے جارہے ہیں۔اُن سے غرض یہ ہے کہ ارتقائے خطِ عربی کے مدارج معلوم ہوسکیں
اور مختلف ادوار کی خصوصیاتِ خطی کا عائر نگاہ سے مطالعہ کیا جاسکے اوراس مطالعے سے
ایسے نسخوں کی نسبت جن پر تاریخ کتابت ثبت نہ کی گئی ہو صحیح قیاس کی بنیاد قائم
ہوسکے۔"۴۰

اصل معیار تحقیق یہ ہے کہ موضوع کے ہر پہلو کا تفصیلی جائزہ مصدقہ شواہد کی بنا پر کیا جائے اور توازن و ترتیب کا بھی خاص خیال رکھا جائے۔مولانا شفیع محمد کے تحقیقی کام کی بنیاد موضوع کی صراحت و وضاحت ہے اوراس صراحت وضاحت میں اعتدال وتوازن دونوں کا اہتمام بھی کیا گیا ہے۔

مولانا امتیاز علی عرشی تحقیق میں ایک معتبر نام ہیں، فارسی، اُردو، عربی و دیگر زبانوں میں اُن کے تحقیقی مقالات ہیں عرشی کے تحقیقی مضامین اپنے مزاج اور رجحان سے نہ صرف جڑی نظر آتی ہے بلکہ ان میں تحقیق کی نئی جہات بھی ملتی ہیں اور تحقیق ادب کے لیے نئے موضوعات بھی دریافت کرتی ہے۔مولانا عرشی کا اندازِ تحقیق نہ تو مشفقانہ ہے اورنہ ہی وہ بے رحم محقق ہیں بلکہ وہ منطق و استدلال کے ساتھ ساتھ موضوع کی تشریح وتعبیر بھی کرتے جاتے ہیں۔توازن و ترتیب عرشی کی تحقیق کا خاصہ ہے مآخذ کی دستیابی باوثوق ذرائع سے کرنے کے بعد براہ راست موضوع پر گفتگو شروع کردیتے ہیں۔وہ بلا جواز بات سے گریز کرتے ہیں۔

عرشی صاحب کے مضمون ''مرزا غالب کی ایک غیر معروف فارسی مثنوی'' کا تحقیقی نثر پارہ ملاحظہ ہو:

> ''بہرحال یہ مثنوی اس لحاظ سے اہمیت رکھتی ہے کہ اس کے ذریعہ سے ہمیں ہندوستان کے ایک مشہور شاعر کے ترجمہ کوشش کا علم ہوتا ہے۔ چونکہ مطبع نول کشور سے اس کا کوئی مطبوعہ نسخہ دستیاب نہ ہوسکا اور نہ کسی کتابخانہ کی فہرست میں اس کا ذکر نظر سے گزرا، اس لیے میں نے کچھ اس دلچسپی کی بنا پر، جو مجھے میرزا صاحب کی شاعری سے ملے اور زیادہ تر اپنے دوست مالک رام صاحب کے اجرا پر جو''سید حسین'' اور''ذکر غالب'' کے ذریعہ ''غالب نوازی'' کا ثبوت دے چکے ہیں، اسی نظم کو شائع کردینا مناسب خیال کیا۔''[۱۴]

مضامین اگر زندگی کی کڑوی کسیلی اور تلخ حقیقتوں کے ترجمان ہوں تو اس طرح کے مضامین معاشرے کے اُن افراد کی نمائندگی کرنے کے لیے لکھے جاتے ہیں جن کا معاشی و سماجی استحصال کیا جاتا ہے۔جن کو نہ صرف معمولی اُجرت دی جاتی ہے بلکہ جن کے لہو کو پسینہ ہونے کے باوجود معقول اُجرت دینے کی بجائے قلیل اُجرت کے ساتھ ساتھ نسل در نسل گروی رکھ لیا جاتا ہے۔ان کی زندگی کے بنیادی حقوق بھی ادا نہیں کیے جاتے۔ایسا ادب ''مزاحمتی ادب'' کہلاتا ہے اور ایسے مضامین مزاحمتی مضامین کہلاتے ہیں جن میں فردِ واحد کے مسائل پر نظر ڈالی جاتی ہے۔ بھوک، افلاس، معاشرتی ناہمواریوں کا احاطہ کیا جاتا ہے۔ ان مضامین کی زبان تخیلاتی نہیں ہوتی اور نہ ہی ان میں حسن و عشق کے قصے بیان کیے جاتے ہیں۔ جمالیاتی اندازِ بیان سے مبرا یہ مضامین تشبیہ و استعارت سے مزین نہیں ہوتے بلکہ الفاظ مضامین تلخ حقیقتوں کے عکاس ہوا کرتے ہیں۔۱۹۳۵ء میں انجمن ترقی پسند کے مصنفین نے لندن میں ترقی پسند تحریک کی ابتدا کی جس نے روٹی کپڑا مکان انسانی مجبوریوں، ضرورتوں، اورانسانی محکومیوں اورمحرومیوں کو اپنا موضوع بنایا۔۱۹۳۵ء میں سجاد ظہیر نے چند دوستوں کے ساتھ مل کر ترقی پسند تحریک کی بنیاد ڈالی۔قمر رئیس ''ترقی پسند ادب'' میں لکھتے ہیں:

> ''ترقی پسند ادب انسانی آزادی کاادیب ہے۔ انسانی مقدر پر استحصالی قوتوں کی عملداری اور تسلط کے خلاف ادب ہے یہ جانبدارانہ ادب نہیں کہ اپنا رخ زندگی گریز رجحانات کے جانب منعطف کر کے یہ دعویٰ کر کے کہ یہ ادب اجتماعیت پسندی پر یقین نہیں رکھ سکتا کہ اس طرح فنکار کی انفرادیت مجروح ہو جاتی ہے۔ انفرادیت کا تانا بانا تاریخ کی پر اسرار قوتوں کی بجائے جدلیاتی مادیت پر قائم ایک

ایسا سماجی نظام سامنے آیا جس نے کچلے ہوئے عوام کی اپنی توجہ کا مرکز اور طاقت کا منبع قرار دیا۔"۴۲

ان مضامین میں اس نقطہ پر زور دیا گیا ہے کہ ادب زندگی کا ترجمان ہے اس لیے ترقی پسند تنقید کے تحت جو مضامین لکھے گئے وہ معاشرے کے انتشار و اضطراب سے متاثر ہونے والے غریب اور نادار مزدوروں کی فاقہ کشی، مظلومیت اور بے کسی کے موضوعات پر لکھے گئے۔ ان تنقیدی مضامین لکھنے والے ناقدین میں ڈاکٹر اختر رائے پوری، سجاد ظہیر، مجنوں گورکھپوری، آل احمد سرور، سید احتشام حسین، ڈاکٹر عبد العلیم، اختر انصاری، عزیز احمد، ممتاز حسین، سردار جعفری وغیرہ شامل ہیں۔ یہاں صرف چند ایک کا احاطہ کریں گے باقی ناقدین کا بھرپور مطالعہ پانچویں باب میں کیا جائے گا۔

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کا مقالہ "ادب اور زندگی" رسالہ اُردو میں سہ ماہی شائع ہوا۔ جس میں اشتراکیت کے پہلو پر پہلی بار اظہار خیال کیا گیا۔ اختر حسین رائے پوری لکھتے ہیں:

"ادب کا یہی مقصد ہے کہ زبان و مکان کی حدبندیوں سے بالاتر ہوتے ہوئے بھی اپنے گردوپیش کا آئینہ دار ہوتا تا کہ اس کے حسن و قبیح سے آگاہ ہو کر انسانیت ترقی کے زینوں پر گامزن ہو۔۔۔۔ ادب کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ وہ ان جذبات کی ترجمانی کرے جو دنیا کو ترقی کی راہ دکھائیں ان جذبات پر نفرین کرے جو دُنیا کو آگے نہیں بڑھنے دیتے اور پھر وہ اندازِ بیان اختیار کرے جو زبان سے زیادہ لوگوں کی سمجھ میں آسکے کیونکہ بہرحال زندگی کا مقصد یہ ہی ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کا زیادہ سے زیادہ بھلا ہو سکے۔"۴۳

سجاد ظہیر ترقی پسند تحریک کے سرخیل تھے۔ ان کے مضامین کا لب و لہجہ اور عکس و خیال کال مارکس کے لہجۂ مارکس کا عکاس ہے۔ سجاد ظہیر کے مضامین حقیقتوں کے ترجمان نہیں ان کی فکر وہ فکر نو ہے جس نے ادبا و شعرا کو دل ٹٹولنے اور زخم کریدنے کا ڈھنگ سکھایا جینے کا قرینہ عطا کیا اور بات کہنے کا سلیقہ عطا کیا۔

احتشام حسین کی کتب "تنقیدی جائزے" اور "روایت اور بغاوت" حیدر آباد دکن سے شائع ہوئی "روایت اور بغاوت" جو ستمبر ۱۹۴۷ء میں شائع ہوئی اسی میں احتشام میں لکھتے ہیں:

"جو شخص بھی میرے مضامین پڑھے گا اُسے خود اندازہ ہوگا کہ میں انسانوں کی فلاح و بہبود اور اقتصادی انصاف کا ذکر کس شدت اور خلوص کے ساتھ کرتا ہوں اور شاید میرا کوئی مضمون ایسا ہو۔ جس میں ان کا تذکرہ کسی نہ کسی پہلو سے نہ آتا ہو۔"۴۴

احتشام حسین کے ہاں فرد اور سماج کا گہرا تعلق متعارف کرایا گیا انہوں نے تاثراتی تنقید کا جمود توڑا اور ایک کمزور نظام حریت کو مضبوط بنا ملی۔ آگے چل کر اسی کتاب میں لکھتے ہیں:

"انقلاب اور تغیر کے زمانے میں اسلوب مواد کا پابند ہوتا ہے۔ جمود اور انحطاط کے زمانے میں اظہار کو ہی سب کچھ سمجھا جاتا ہے۔"۴۵

ڈاکٹر عبد العلیم کی کتاب نہایت مختصر ہے اور اس میں "مارکسزم اور ادب" پر ڈاکٹر صاحب کے مار کسزم پر افکار و خیالات ملتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

"مادی فلسفہ جو اشتراکی حقیقت پسندی کی بنیاد ہے۔ ذہن کی نشوونما پر زور دیتا ہے وہ آرٹ اور سائنس کی ترقی کا حامی ہے۔ وہ روحانی قدروں یا ذہنی اور دماغی لطف اندوزی کا مخالف نہیں ہے وہ تو صرف ماورائیت کا دشمن ہے۔"۴۶

ترقی پسند تنقید ادب میں حقیقتوں اور صداقتوں کی تلاش میں سرگرداں رہی۔ ادب و سماج کے حوالے سے ڈاکٹر عبد العلیم ایک مارکسی نقاد کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔

حواشی

۱۔ The Encyclopedia Americana, Volume, 10, danbury, Grolier Incorporated, 1980, Page 589

۲۔ A-B- Benson "Several Essays", Edited by G-F.J.comberlege, oxford university press, seventh impression 1963, page: 1

۳۔ طیبہ خاتون، ڈاکٹر، ''اُردو میں ادبی تاریخ''(۱۷۵۷ تا ۱۹۱۴ء تک) دہلی: ۳۲۱ گلی گڑھیا جامع مسجد دہلی، اپریل ۱۹۸۹ء ص:۸۳

۴۔ گارساں دتاسی، ''ہندوستانی اخبار نویسی'' (کمپنی کے عہد میں) محمد عتیق، صدیقی، علی گڑھ انجمن ترقی اردو(ہند)، دسمبر ۱۹۵۷ء، بارِ اوّل، ص:۳۲۹

۵۔ احمد فاروقی خواجہ، ''پروفیسر رام چندر اُردو صحافی کی حیثیت سے''، دلی کالج اُردو میگزین، قدیم دلی کالج نمبر۱۹۵۳ء، ص:۶۳

۶۔ قاسم علی سخن، مترجم، خواجہ، احمد، فاروقی، دہلی کالج اُردو میگزین ,قدیم دلی کالج نمبر،۱۹۵۳ء، ص: ۶۳

۷۔ حمید الدین شاہد، خواجہ، اُردو میں سائنسی ادب، کراچی: ایوانِ اُردو کتاب، ناظم آباد، ۲۰ اگست۱۹۶۹ء، ص:۱۷،۱۶

۸۔ ضیاء الحق ''مضمون نویسی'' مخزن لاہور ستمبر۱۹۰۱ء جلد نمبر۶، ص:۳۱

۹۔ سید احمد خان ''مقالات سرسید''، ''محمد عبداللہ، خویشگی''، علی گڑھ، نیشنل پرنٹس، کمپنی، دیباچہ، سن یکم مارچ ۱۹۵۲ء، ص:۱۴۸

۱۰۔ .....، ''مقالات سرسید'' (جلد نہم) مرتب: محمد اسماعیل پانی پتی، مولانا، لاہور : مجلس ترقی ادب، طبع دوم، جون ۱۹۹۲ء، ص: ۲۰۹

۱۱۔ .....، ''مقالات سرسید'' (حصہ دہم)، مرتبہ: محمد اسماعیل پانی پتی، لاہور: مجلس ترقی ادب، طبع دوم، جون ۱۹۹۲ء، ص: ۳۵

۱۲۔ ناظمہ نقوی ''فکری زاویے'' لاہور: الحمد پبلی کیشنز، پرانی انارکلی ایبک روڈ، ۲۰۰۸ء ص: ۱۸۷

۱۳۔ الطاف حسین حالی، کلیات نثر حالی، جلد اول، لاہور: مجلس ترقی ادب، طبع اوّل ۱۹۶۷ء، ص: ۱۷۳،۱۷۲

۱۴۔ محمد حسین آزاد، نیرنگ خیال، مرتبہ: ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز اُردو بازار، طبع ثانی ۱۹۷۲ء، ص: ۱۰۴

۱۵۔ غلام حسین ذولفقار، ڈاکٹر، (مرتبہ)، ''نیرنگ خیال'' لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز اُردو بازار، طبع ثانی ۱۹۷۲ء، ص: ۴۸

۱۶۔ شبلی نعمانی، ''مقالاتِ شبلی (جلد دوم) مرتبہ: سلیمان ندوی، اعظم گڑھ: مولانا سید، مطبع معارف، طبع پنجم ۱۹۶۴ء، ص: ۲۲

۱۷۔ عبد الحلیم شرر، مضامین شرر جلد اول حصہ دوم، شاعرانہ و عاشقانہ مضامین، لاہور: مبارک علی اینڈ سنز سن ندارد، ص: ۱۲۰

۱۸۔ **Cynthia Ozick, "The Best American Essays", Edited, robert Atwan, Boston New York, Houghton Miffin company, 2008, P, 26.**

۱۹۔ محمد حسن، ڈاکٹر، ''اُردو میں رومانوی تحریک''، ملتان صدر: کاروانِ ادب، اشاعت ۱۹۸۶ء، ص: ۳۲، ۳۳

۲۰۔ ابوالکلام آزاد، ''ایک ہمہ گیر شخصیت''، مرتبہ: رشید الدین، خان، دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، دوسرا ایڈیشن، ۲۰۰۶ء، ص: ۴۶۴

۲۱۔ جوش ملیح آبادی، ''اشارات'' دہلی: نگارستان ایجنسی، اُردو بازار دلی، قزلباش، س ن، ص: ۵۸

۲۲۔ سجاد حیدر یلدرم ''انتخاب سجاد حیدر یلدرم، مرتبہ و مقدمہ: قرۃ العین حیدر، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۰ء، ص: ۲۱۰

۲۳۔ عبد القادر سر، مشمولہ مقالاتِ عبد القادر، مرتب: حنیف شاہد، لاہور: مجلس ترقی ادب، طبع اول فروری ۱۹۸۶ء، ص: ۱۵۹

۲۴۔ عبدالعزیز فلک پیما، لاہور: مضامین فلک پیما، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۶ء، ص: ۳۹

۲۵۔ خلیقی دہلوی، ''ادبستان'' ترتیب و مقدمہ اختر شیرانی، لاہور: کتاب منزل، بار سوم ۱۱ فروری ۱۹۳۰ء، ص: ۵۳

۲۶۔ حجاب امتیاز علی تاج، ''ادب زریں'' دہلی: عصمت بک ڈپو، بار دوم، ۱۹۴۳ء، ص ۷۵

۲۷۔ نیاز فتح پوری، علامہ انتقادیات، لاہور: الوقار پبلی کیشنز،۲۰۰۵،ص ۳۳

۲۸۔ مجنوں گورکھپوری، تنقیدی حاشیے، حیدر آباد: ادارہ اشاعت اُردو، عابد روڈ، دکن، فروری۱۹۴۵ء، ص:۱۶۸

۲۹۔ عبد الماجد دریا آبادی، ''انشائے ماجد یا لطائف ادب'' لاہور: ادارہ علم و عرفان، طبع اول ۲۰۰۰، ص:۱۶،۱۵

۳۰۔ عبد الرحمٰن بجنوری،باقیات بجنوری مرتب محمد فاتح فرخ،دہلی، لکھنو،لاہور:بمبئی، مکتبہ جامعہ،۱۹۴۰ء، ص:۴۶

۳۱۔ ڈاکٹر خورشید اسلام، نقوش طنز و ظرافت نمبر۱۷،۲۷، فروری۱۹۵۹، مرتب :دوسرا ایڈیشن، محمد طفیل، لاہور: ادارہ فروغ اُردوص: ۱۸

۳۲۔ فرحت اللہ بیگ، ''کلیاتِ فرحت اللہ'' جلد اوّل، لاہور: الاعجاز پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء ص: ۶۱، ۶۲

۳۳۔ پطرس بخاری، کلیات پطرس (جلد اول) مرتب: شیما مجید، لاہور: بک ٹاک میاں چیمبرز ٹمپل روڈ، ۲۰۰۳، ص ۸۱،۸۰

۳۴۔ رشید احمد صدیقی ''میزان نثر'' (جلد سوم) مرتبین: مہر الٰہی ندیم (علیگ) لطیف الزماں خان، کراچی: دانیال، اشاعت اول جون ۲۰۰۰، ص:۷۸

۳۵۔ ملا رموزی، ''مضمون نگاری''، نکاتِ رموزی (حصہ دوم) در الاشاعت پنجاب لاہور: ۱۹۲۹ء، ص:۱۶۱

۳۶۔ محمد سعید مرزا، ''مقالاتِ مرزا محمد سعید''، کراچی:انجمن ترقی اُردو،پاکستان، مرتبہ: شیما مجید،۲۰۰۲ء،ص:۱۸۱

۳۸۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، ''ادبی تحقیق کے اُصول''، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان طبع اوّل ۱۹۹۲ء، ص: ۲۵

۳۹۔ عبد الحق مقدمہ باغ و بہار، مقدماتِ عبد الحق مرتبہ :عبادت بریلوی، ڈاکٹر، لاہور: اُردو مرکز پہلا پاکستانی ایڈیشن ۱۹۶۴ء، ص:۳۱۷

۴۰۔ شفیع محمد مولانا، مقالات ''محمد شفیع'' (جلد اول) مرتب، احمد ربانی لاہور: مجلس ترقی ادب، طبع دوم اپریل ۲۰۰۷، ص:۲۷۶

۴۱۔ امتیاز علی عرشی، ''مقالات عرشی''، مرتبہ اخلاق احمد آہن، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۷ء ص:۱۴۳،۱۴۴

۴۲۔ قمر رئیس، ''ترقی پسند ادب''مرتبہ قمر رئیس، سید عاشور کاظمی، لاہور: مکتبہ عالیہ معاون مکتبہ عالیہ ۱۹۹۴،

ص

۴۳۔ اختر حسین رائے پوری، ''ادب اور زندگی'' مشمولہ ''ادب اورانقلاب'' حیدر آباد دکن: ادارہ اشاعت اُردو، پہلا ایڈیشن اکتوبر ۱۹۴۳ء، ص:۲۸،۲۷

۴۴۔ احتشام حسین ''روایت اور بغاوت'' حیدر آباد دکن: ادارہ اشاعت اُردو عابد روڈ ، ستمبر ۱۹۴۷ء(طبع اوّل) ص: ۱۰

۴۵۔ ایضاً ص: ۲۲

۴۶۔ عبد العلیم، ڈاکٹر، مارکسزم اورادب ''ترقی پسند ادب'' مرتبہ قمر رئیس، سید عاشور کاشمی، لاہور: سید مکتبہ عالیہ معاون مکتبہ عالیہ، ۱۹۹۴ء، ص:۱۹۸،۱۹۸

باب دوم

اُردو میں مضمون نگاری کی ابتدائی روایت

اُردو میں مضمون نگاری کی ابتدائی روایت

اُردو مضمون نگاری کا آغاز ''دہلی کالج'' سے ہوا۔ مدرسہ غازی الدین ''دہلی کالج'' کا ابتدائی نقش بن کر اُبھرتا ہے۔ مدرسہ کی ابتداء ۱۷۹۲ء میں ہوتی ہے اور مولوی عبدالحق ''مرحوم دہلی کالج'' میں لکھتے ہیں:

> ''اس مجوزہ کالج کا افتتاح ۱۸۲۵ء میں ہوا۔ اوراس ''شاہانہ عطیے'' میں سے اس کالج کے لیے پانسو رُپے ماہانہ مقرر کیے گئے۔''[۱]

مدرسہ غازی الدین کو''دہلی کالج'' میں تبدیل کرنے کا ایک مقصد انگریز سرکار کا مقامی طلبہ کو انگریزی زبان سے متعارف کرانا تھا۔ دہلی کالج کا ایک اہم مقصد یہ بھی تھا کہ اگر انگریزی زبان سے مقامی طلبہ کی شناسائی میں دشواری ہو تو پھر اُن طلبہ کو ان کی اپنی زبان میں مغربی علوم کی تعلیم دی جائے تا کہ مغربی علوم سے مشرق کے باسیوں کو شناسائی ہو سکے۔ اور یوں دہلی کالج اس دور میں ایک درخشاں بات کا اضافہ ہے جب علوم جدیدہ کی کمی محسوس کی جارہی تھی۔ ممتاز منگلوری ''دہلی کالج'' مضمون میں لکھتے ہیں:

> ''دہلی کالج'' کو بلا مبالغہ شمالی ہندوستان میں نشاۃ ثانیہ کا پہلا مشہور علمبردار کہا جاسکتا ہے ----- اس کالج کے ذریعے شمالی ہندوستان میں پہلی مرتبہ اُردو کے ذریعے مغربی علوم، ریاضی، سائنس، علم ہیئت اور فلسفہ وغیرہ کی تدریس شروع ہوئی جس نے نئی قدروں کے فروغ کے لیے فضا پیدا کی۔''[۲]

دہلی کالج واقعی ایک تہذیبی ادارہ تھا جہاں مغرب و مشرق کی اقدارِ اعلیٰ کی پاسداری کرنا اہم ترین جزو تھا۔ سیاسی و معاشرتی انتشار نے معاشرے کے سکون کو تہہ و بالا کر رکھا تھا۔ ایسے میں دہلی کالج کا وجود معاشرے میں ہم آہنگی اور توازن و اعتدال کا داعی بن کر اُبھرا۔ خواجہ احمد فاروقی ''دہلی کالج'' کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''دہلی کالج نے نہ صرف ملکی زبان میں تعلیم کی شاندار روایات قائم کیں اور اُردو نثر کو مالا مال کردیا۔ بلکہ نئی قدریں دیں اورایک نئی تہذیب کی بنیاد رکھی۔ مشرق و مغرب کا وہ امتزاج اور وہ سائنسی نقطہ نظر جو آج ہم پیدا کرنا چاہتے ہیں اور جس کی مدد

سے اس زمانہ میں ہم اپنی زندگی کی تشکیل کر رہے ہیں اس کا اولین احساس دہلی کالج ہی نے پیدا کیا---اس کالج سے ایک نئے دور کا آغاز ہوا، یہ دور جاری ہے ختم نہیں ہوا۔ ہماری تعلیم، ہماری زبان اور ہمارے ادب کا قافلہ اسی راستہ پر چل رہا ہے جو اس نے دکھلایا تھا"[۳]

مدرسہ غازی الدین کو دہلی کالج میں تبدیل کرنے کا ایک مقصد انگریزوں کا مقامی طلبہ کو انگریزی زبان سے متعارف کرانا تھا۔ ڈاکٹر رفعت جمال نے اپنی کتاب "ذکا اللہ حیات اور ان کے علمی و ادبی کارنامے" میں لکھا ہے:

"دہلی کالج" انگریزوں کے دستِ کرم کا دوسرا نادر تحفہ ہے۔ فورٹ ولیم کالج کے بالعکس "دہلی کالج" کا اہم مقصد یہ تھا کہ دیسی طلبہ کو انگریزی اور اگر ممکن نہ ہو تو ان کی اپنی زبان کے ذریعے مغربی علوم وفنون سے واقفیت بہم پہنچائی جائے۔"[۴]

دہلی کالج کی ابتدا اور اس کے عروج و زوال کی مختصر داستان کچھ یوں ہے:

۱۷۹۲ء میں مدرسہ غازی الدین کا آغاز ہوتا ہے دہلی کالج کا آغاز ۱۸۲۵ء میں ہوتا ہے اور یوں ۱۷۹۲ء میں شروع ہونے والا مدرسہ غازی الدین ۱۸۲۵ء میں دہلی کالج میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ مولوی عبدالحق کے نزدیک ۱۸۶۵ء سے قبل سرکاری مدارس میں مشرقی زبان وعلوم کی تعلیم دی جاتی رہی ہو گی۔ ۱۸۲۵ء میں دہلی کالج کا افتتاح ہوا۔ مخیر حضرات "شاہانہ عطیے" میں سے کالج کے لیے "پانچسو روپے" مقرر کیے گئے۔ مسٹر جے۔ ایچ۔ ٹیلر اس کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ ہیڈ مولوی و دیگر اساتذہ بھرتی ہوئے۔ ۱۷۵ روپے پرنسپل صاحب کی اور ہیڈ مولوی کی ۱۲۰ روپے اور دو اور مولوی ۵۰ روپے اور باقی ۲۵ اور ۳۰ روپے پر مقرر ہوئے۔ شروع میں جے۔ایچ۔ٹیلر کے مطابق نو طلبا تھے اور مولوی عبداللہ ان کو تعلیم دیتے تھے۔

۱۸۲۸ء میں انگریزی جماعت کا اضافہ ہوا۔ لیکن ہندو اور مسلمانوں نے مخالفت کی کہ نوجوان نسل کے لیے انگریزی تعلیم زہر قاتل ہے اس لیے اس مضمون میں نوجوانوں کی تعداد کم رہی۔

نواب اعتماد الدولہ نے بھی کار خیر کے لیے جو رقم دی وہ بھی ایک کالج قائم کرنا چاہتے تھے وہ رقم دہلی کالج کے لیے مختص کر دی۔

کالج میں ۱۹۳۰ء تک انگریزی پڑھنے والوں کی تعداد تین سو ہو گئی اور ساتھ ہی اردو زبان کی ترقی و ترویج بھی ہوئی۔

۷ مارچ ۱۸۳۵ء کو گورنر جنرل لارڈ بینٹنگ نے کونسل کی منظوری سے یہ احکام جاری کیے کہ مشرقی علوم اور دیسی زبانوں کی سرپرستی ختم کر کے تمام مالی امداد و وسائل انگریزی تعلیم کے لیے وقف کر دیے جائیں جس سے عوام میں بے چینی بڑھ گئی اور پھر گورنر جنرل لارڈ آکلینڈ نے مشرقی علوم و علاقائی زبانوں کی تعلیم کی اجازت کی سفارش کی۔ ممتاز منگلوری ''تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند'' میں لکھتے ہیں:

> ''دہلی کالج کو یہ فضیلت حاصل رہی کہ لارڈ بینٹنگ کے دور میں یہاں مغربی علوم کی تعلیم اردو میں ہی ہوتی رہی اور اس کے شعبۂ شرقی کے طلباء کے ۱۸۵۶ء تک جتنے بھی معائنے اور امتحانات ہوئے سب میں سائنسی علوم میں ان کی ذکاوت کو سراہا گیا اور لیفٹیننٹ گورنر تک نے ان رپورٹوں پر مسرت کا اظہار کیا۔ شرقی شعبہ کا تعلیمی معیار ۱۸۳۰ء سے ۱۸۴۵ء تک گر گیا تھا لیکن جلد ہی اس پر قابو پا لیا گیا۔ ۱۸۴۵ء میں مسٹر بتروس پرنسپل نے جو رپورٹ لکھی اس کے مطابق شرقی شعبے کے طلبا سوائے تاریخ کے اور کسی مضمون میں انگریزی شعبے کے طلبا سے کمتر نہیں تھے۔''۵

کالج کے پہلے پرنسپل مسٹر فلیکس بتروس (Flex Bootros) ۱۸۴۱ء میں مقرر ہوئے۔ دہلی کالج نے ان کی سرپرستی میں ترقی کی۔ ۱۸۴۳ء میں ایک انجمن انگریزوں اور ہندوستانیوں کے ساتھ مل کر بنائی جس کا نام ''انجمن اشاعت علوم بذریعہ السنہ ملکی'' تھا۔ جس کا سارا کام دہلی کالج میں ہوا۔ اور مسٹر بتروس ۱۹۴۵ء میں بوجۂ علالت واپس انگلستان چلے گئے اور مسٹر اشپرنگر پرنسپل کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ان کی محنت اور لگن نے اس انجمن کے تحت مغربی علوم وفنون اور اردو زبان میں سائنسی علوم کی ترویج و ترقی کے لیے نمایاں خدمات سرانجام دیں۔ اس کالج کا مقصد اولین مغرب و مشرق کی اقدار و روایت میں ربط پیدا کرنا ہے۔ اشپرنگر نے اس مقصد کے لیے جدوجہد کی۔

مسٹر اشپرنگر نے عربی زبان و ادب پر عبور رکھنے کی بنا پر اہل دلی میں اپنا مقام بنا لیا۔ ان کو شاہانِ اودھ کے کتب خانے کی فہرست تیار کرنے کے لیے لکھنؤ بھیج دیا گیا اور مسٹر جے کارگل دہلی کالج کے پرنسپل ہوئے۔ ان کے بعد ۱۸۵۷ء میں مسٹر ٹیلر پرنسپل بنے۔ مولوی عبدالحق ''مرحوم دہلی کالج'' میں لکھتے ہیں:

> ''مسٹر بتروس، ڈاکٹر اشپرنگر اور مسٹر ٹیلر یہ کالج کے تین ایسے پرنسپل گزرے ہیں کہ انہوں نے کالج کی سچی خدمت کی اور اس کی ترقی و اصلاح میں دل سے کوشش کی ..... خاص کر شرقی شعبے کی اصلاح اور اردو زبان میں مغربی علوم کے ترجموں کے متعلق مسٹر بتروس اور ڈاکٹر اشپرنگر نے جو بے ریا کوشش کی وہ بہت

قابل قدر ہے۔"[۲]

مسٹر اشپرنگر نے جو اُن دنوں دہلی کالج کے پرنسپل تھے اپنے زمانے میں ایک ہفتہ وار اخبار "قرآن السعدین" کا اجراء ۱۸۴۵ء میں کیا یہ اخبار "مطبع العلوم متعلق مدرس" دہلی سے شائع ہوتا تھا اس اخبار کو انگریزی کے اخبار پے حی کے طرز پر نکالا گیا۔ یہ بالتصویر اخبار تھا جس میں سائنسی، علمی، ادبی مضامین ہوتے تھے۔ کالج کی روداد اور تقریری مقابلوں کی روداد اس اخبار میں شائع ہوتی تھی۔ اس طرح سائنسی موضوعات پر مضامین لکھنے کا سلسلہ بھی قرآن السعدین سے شروع ہوا۔

اس کالج کی اہم اورنمایاں بات یہ تھی کہ یہاں اُردو ذریعہ تعلیم تھی اور یہاں مغربی علوم مثلاً فلسفہ، ریاضی علم، نجوم ہیئت کی تعلیم اُردو میں دی جاتی تھی۔ انگریزی اور اُردو مقابلہ مضمون نویسی کے لیے تمغے بھی دیئے جاتے تھے جن سے طلبہ کی حوصلہ افزائی ہوا کرتی تھی۔ ماسٹر رام چندر سائنس کی تعلیم اُردو زبان میں دیا کرتے تھے اورجلد ہی نیچرل فلاسفی اورمخلوط ریاضی، الجبرا، جیومیٹری، حساب کی تعلیم بھی اُردو میں دی جانے لگی دہلی کالج کا مقصد و مدعا یہ تھا کہ ادب اورسائنس کی تعلیم اُردو میں دی جائے اُردو تالیف وترجمہ دہلی کالج کی توسط سے ہوا کرتا تھا یوں اُردو زبان کی آبیاری دہلی کالج نے کی۔ دہلی ورنیکلر ٹرانس لیشن سوسائٹی کے تحت دہلی کالج کے مقاصد عربی، فارسی، سنسکرت، انگریزی کی کتابوں کو اُردو، بنگالی ہندی میں ترجمہ کرنا تھا۔ سائنس کی اصطلاحات یا سائنس کے لفظ کا نعم البدل اگر کوئی لفظ اُردو میں موجود ہو تو اس کو لکھنا ہے۔ ترجمہ پہلے پہل اعلیٰ درجے کا نہیں ہو سکتا لیکن جس ترجمہ سے بات سمجھ میں آجائے اسی ترجمہ پر اکتفا کیا جاسکتا تھا۔ بعض لفظ انگریزی کے بھلے لگتے تھے اُن کو ویسے ہی لکھ دینا بہتر ہوگا۔ اگر چہ اس انجمن نے اُردو کے علاوہ ہندی اور بنگالی میں بھی ترجمہ کرنے کا ارادہ کیا تھا لیکن سوائے اُردو کے کسی اورزبان میں ترجمہ نہ کیا گیا اور یوں اُردو موضوعات، زبان واسالیب میں روزبروز ترقی کرتی چلی گئی۔ ۱۸۲۳ء میں انجمن اشاعتِ علوم بذریعہ السنہ ملکی کے قیام کے بعد "دہلی ورنیکلر گرانشلین سوسائٹی نے باقاعدہ کتابیں شائع کرنی شروع کردیں اور پرنسپل بتروس اپنے ایک نوٹ میں لکھتے ہیں:

> "پرنسپل کی تحریک پر یا اس کے مشورے سے ہندوستانی مدرس اورشعبہ انگریزی کی اعلیٰ جماعت کے طالب علم کسی انگریزی (مطبوعہ یا قلمی) کتاب کو اُردو ترجمے کے لیے انتخاب کرتے تھے انہیں یہ پہلے ہی بتا دیا گیا تھا کہ اگر ان کے ترجمے اچھے ہوئے تو جہاں تک جلد ممکن ہوگا انکے یہ ترجمے طبع کرا دیے جائیں گے۔"[۳]

دہلی کالج کے اساتذہ اور طالب علم کے حوالے سے اب بات کرتے ہیں۔ پہلے مولوی ذکاء اللہ کا ذکر کرتے ہیں۔ ڈاکٹر اشرف احمد ''ذکاء اللہ حیات اور ان کے علمی کارنامے'' میں لکھتے ہیں:

> ''ذکا اللہ کا مطالعہ قدیم دلی کالج کا مطالعہ ہے۔ وہ اس لئے کہ ذکاء اللہ نہ صرف اس کالج کے ہونہار طالب علم رہے بلکہ اس کالج میں معلم ہونے کی عزت بھی انہوں نے حاصل کی۔''[۸]

مولوی محمد ذکاء اللہ اپریل ۱۸۳۲ء کو دہلی کے کوچے بلاقی بیگم میں ۱۸۳۲ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد حافظ ثناء اللہ اور دادا مولوی محمد بقاء اللہ عرصہ دراز سے امیر تیمور کورگانی کے شاہی خاندان کے انالیق تھے۔ دلی کالج میں تعلیم پائی۔ پھر دلی کالج میں ریاضی کے استاد مقرر ہوئے۔ ڈپٹی انسپکٹر مدراس کے گیارہ سال فرائض سرانجام دیئے اور پھر نارمل اسکول دلی کی ہیڈ ماسٹری کے بعد میور سنٹرل کالج الہ آباد میں پندرہ سال پروفیسری کی۔ ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد ایک سال تک علی گڑھ میں سرسید سے وابستہ رہے۔ انہوں نے تہذیب الاخلاق، معارف، مخزن، زمانہ، ادیب و دیگر رسائل میں مضمون نگاری کی۔ ۱۷۔ نومبر ۱۹۱۰ء میں وفات پائی ان کی ۱۴۳ تصانیف تھیں جن میں صرف چند کتب دستیاب ہیں۔ ان میں سے چند کے نام یہ ہیں۔ تاریخ عہدِ انگلشیہ، آئینِ قیصری، کرزن نامہ، تعلیم الاخلاق، صحیفۂ فطرت، منتہائے اقلیدس وغیرہ وغیرہ۔

مبادی الانشاء مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان کے مضمون ''خیالات'' نہایت مختصر ڈیڑھ صفحے کا مضمون ہے۔ جس میں خیالات کی پرواز اور خیالات کے منفی اور مثبت پہلو پر روشنی ڈالی ہے۔ دریا کو کوزے میں بند کیا ہے۔ اسلوب شگفتہ و سلیس ہے۔

دوسرا مضمون ''کیسا خیال غلط ہے کہ زمانہ برسر تنزل ہے'' یہ قدرے طویل مضمون ہے جس میں زمانۂ قدیم کے پرستاروں اور ماضی میں گم رہنے والوں پر کڑی تنقید کی ہے اور زمانۂ حال کو ترقی و ترفع کے لیے اہم گردانا ہے۔ زمانۂ حال کی خوبی و ہنر کا اعتراف کیا ہے۔ گورنمنٹ رعایا، مذہب، علم و ہنر، اخلاق و انسانیت کے حوالے سے بصیرت افروز نگارشات پیش کیے ہیں اور واحد کی ترقی کو دنیا کی ترقی کا مددگار و معاون قرار دیا ہے۔

مضمون پر مولوی صاحب کی گرفت ہے اور دلائل و منطق میں وزن ہے اسلوب بھی حقیقی، فطری اور سادہ ہے۔

ماسٹر رام چندر اور امام صہبائی مولوی ذکاء اللہ کے اساتذہ تھے۔ ماسٹر رام چندر کا ان پر گہرا اثر تھا۔ مولوی صاحب نے اخلاقی و سماجی، تہذیبی و فکری تربیت کا آغاز دہلی کالج سے کیا۔ ڈاکٹر رفعت جمال ''ذکاء اللہ حیات اور ان کے علمی و ادبی کارنامے'' میں لکھتے ہیں:

> ''غرض کہ رام چندر کی راہنمائی اور دہلی کالج کے ماحول نے ان کی شخصیت اور ذہنی صلاحیت کو وہ عظیم سرمایہ عطا کیا جس سے اردو کو ایک عظیم فن کار ملا اور اس فن کار کے فن نے اس ادارے کو زندہ جاوید بنا دیا۔''۹

مولوی ذکاء اللہ مستقل مزاج، جوشیلے، دیانت دار، روشن خیال، مخلص، ریاکاری سے پاک سچے اور سیدھے انسان تھے۔ ماسٹر رام چندر کے شاگردوں میں سب سے اہم تھے اور ان کی تربیت اسی دہلی کالج میں ہوئی تھی۔ اردو کی اہمیت کا احساس انہیں ہو گیا تھا اور اس کی وسعت مضامین پر بھی ان کی نظر عمیق تھی۔ اسی لئے انگریزی کتب کے تراجم بھی انہوں نے کیے۔ تصنیف و تالیف و ترجمے میں ان کی قابل گراں خدمات کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ ڈاکٹر طیبہ خاتون ''اردو میں ادبی نثر کی تاریخ'' ۱۸۵۷ء تا ۱۹۱۴ء میں لکھتی ہیں:

> ''ان کی جملہ تصانیف میں اس دور کے ہر رجحان کا عکس ملتا ہے۔ اس لیے ذکاء اللہ نے اپنے دور کی تمدنی اور اقتصادی زندگی کے مسائل کو بھی پیش کیا۔ جس سے سماجی شعور و اقدار کا بھی علم ہوتا ہے۔ افادی نقطۂ نظر سے ان کی اہمیت مسلم ہے۔ ان کے مضامین میں موضوعات کا بڑا تنوع ہے۔ زبان سریع الفہم ہوتی ہے۔ انہیں بھی اردو زبان میں تعلیم کی اہمیت کا احساس سرسید سے کم نہیں تھا۔ بیشتر مضامین اور تصانیف تعلیم کے نقطۂ نظر کو سامنے رکھ کر لکیں۔''۱۰

ماسٹر رام چندر دہلی کالج کے طالب علم ہونے کے ساتھ ساتھ وہاں کے معلم بھی تھے۔ وہ پانی پت میں ۱۸۲۱ء میں پیدا ہوئے۔ مکتب کی تعلیم کے بعد انگلش اسکول میں تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد شادی ہو گئی اور ۱۸۴۱ء میں ''دہلی کالج'' میں تین سال تک تعلیم حاصل کرتے رہے بعد میں اسی کالج میں مدرس ہو گئے۔ دو رسائل ''فوائد الناظرین'' اور ''محب ہند'' نکالے۔ ''دہلی کالج'' سے علیحدگی کے بعد رڑکی چلے گئے اور وہاں تامسن سول انجینئرنگ کالج میں نیٹو ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔ وہاں سے فارغ ہو کر دہلی میں ڈسٹرکٹ اسکول کے ہیڈ ماسٹر بنے۔ ۱۹۴۴ء میں ایک مہاراجہ مہندر کے ہاں اتالیق مقرر ہوئے۔ اس کے بعد محکمۂ تعلیم

جب وجود میں آیا اس کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ ۱۱ اگست ۱۸۸۰ء کو ان کا انتقال ہوا۔ عیسائی مذہب ان کے اختیار کرنے پر کافی تنقید کا نشانہ بھی بنے۔

دہلی کالج کے مصنفین میں ماسٹر رام چندر کی اہمیت مسلم ہے۔ انہوں نے سائنس ادب صحافت، تاریخ و تذکرہ، ترجمہ، حرف ونحو پر توجہ دی۔ ان کی علمی و ادبی نثر سادہ عام فہم اور پُراثر ہے۔ اور سرسید سے قبل ان کی نثر نے اردو زبان کو وسعت عطا کی۔ ان کے مضامین مدلل، مربوط، متوازن ہونے کے ساتھ ساتھ جاذبیت و کشش بھی رکھتے ہیں اور عام فہم اسلوب کے زیر اثر لکھے گئے یہ مضامین نئے رجحانات وموضوعات کی داغ بیل بھی ڈالتے ہیں۔ ممتاز منگلوری اپنے مضمون ''دہلی کالج کی علمی خدمات'' میں رقمطراز ہیں:

> ماسٹر رام چندر نے اردو زبان و ادب کی قابلِ قدر خدمات سرانجام دیں انہوں نے بار بار اس خیال کا اعادہ کیا کہ اگر اعلیٰ تعلیم کو وسعت دینا تو اس کے لیے اردو تعلیم کو ترقی دی دینا ہو گی۔ اردو میں انشائیہ نگاری کا سلسلہ انہوں نے سرسید سے پہلے شروع کیا۔[۱۱]

ماسٹر رام چندر کے مضامین ادبی شاہکار پھر بھی نہیں کہلا سکتے اور مدلل و مربوط ہونے کے باوجود ان میں کہیں کہیں جھول نظر آتا ہے اور ان کے تراجم اپنے اندر جان رکھنے کے باوجود روانی نہیں رکھتے۔

ماسٹر رام چندر کے مضامین میں جدت و تنوع ضرور ہے لیکن اس میں ادبی شان نہیں اور نہ ہی انشائیہ کے زمرے میں یہ مضامین آتے ہیں۔ ان کے اکثر مضامین سائنسی و معاشرتی موضوعات کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار ''مضامین سرسید'' میں لکھتے ہیں:

> ''ماسٹر رام چندر کے ان مضامین کو ہم باقاعدہ ادبی مضمون نہیں کہہ سکتے۔ زیادہ سے زیادہ ہم انہیں بے قاعدہ مضامین کی صف میں شمار کرسکتے ہیں کیونکہ انہوں نے ان اخلاقی و اصلاحی موضوعات کو علمی انداز میں پیش کیا ہے۔ ادبی انداز میں پیش کرنا ان کا مقصود بھی نہیں تھا اور غالباً وہ اس پر قادر بھی نہیں تھے۔''[۱۲]

نیز ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار ماسٹر رام چندر کو سرسید کا مضمون نگاری میں پیش رو بھی مانتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ماسٹر رام چندر کو ایک لحاظ سے اردو مضمون نویسی میں سرسید کا پیش رو کہا جا سکتا ہے۔ ماسٹر رام چندر کے سامنے بھی ''اسپیکٹیٹر'' کا تصور موجود تھا اور وہ اپنی خود

نوشت سوانح عمری میں اس کا ذکر کرتے ہیں کہ ہم اسپیکٹیٹر کے ڈھنگ پر کام شروع کرنے کا حوصلہ بھی رکھتے تھے۔"[۱۳]

جبکہ ماسٹر رام چندر کی مضمون نگاری کے حوالے سے "ماسٹر رام چندر" کے مقدمے میں خواجہ احمد فاروقی لکھتے ہیں:

"رام چندر کی علمی خدمات کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انہوں نے فکر و نظر اور ترک و اختیار کے نئے پیمانے دے کر اور صحافت و تنقید و ترجمہ اور مقالہ نگاری کے نئے معیار قائم کر کے اردو نثر کی کشتِ ویراں کو ریگزارِ برباد ہونے سے بچا لیا اور اس میں یہ صلاحیت پیدا کر دی کہ وہ آنے والے زمانے کا ساتھ دے سکے۔ اس میں دل کو کھینچنے والے عنصر کم ہیں لیکن اس پر ایک مقصد کی چھوٹ، ایک نئے تمدن کا پرتو ہے۔"[۱۴]

جبکہ خواجہ احمد فاروقی ماسٹر رام چندر کے مقدمے میں یہ بھی لکھتے ہیں:

"حقیقت یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت سے پہلے اردو کو کسی ادیب اور مفکر کی تحریروں میں شرق و مغرب کے امتزاج اور احیائے علمی میں اردو کی اہمیت پر اتنا زور نہیں جتنا کہ رام چندر کے یہاں ہے۔"[۱۵]

ان آرا کی روشنی میں ماسٹر رام چندر کے حوالے سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ علمی و ادبی مضامین کے سوتے ماسٹر رام چندر کی تحریروں سے پھوٹتے ہیں۔ باقاعدہ مضامین ادبی کی فہرست کے ان کے موضوعات میں نہیں آتے لیکن اردو میں مضمون نگاری کے حوالے سے سنگ میل کہلائے جا سکتے ہیں۔

ماسٹر پیارے لال دہلی کالج کے طالب علم تھے ابتداء میں اسی کالج میں پڑھایا۔ پھر محکمہ تعلیم سے وابستہ رہے اور پنجاب بک ڈپو میں بھی کیوریٹر رہے اور بعد میں انسپکٹر آف سکولز میں بہت کام کیا۔ پنجاب میں رسالہ "انالیق" نکالا اور اس میں بے شمار مضامین لکھے۔ ان کی تصانیف میں قصص ہند، تاریخ انگلستان، دربار قیصری ۱۸۷۷ء مسٹر ویلیر کی تالیف کا ترجمہ شامل ہیں۔

میر ناصر علی "صلائے عام" کے ایڈیٹر تھے۔ یوں تو دہلی کالج کے قدیم طلبا و اساتذہ میں مولوی امام بخش صہبائی بھی شامل تھے۔ فارسی کے استاد تھے اور فارسی تالیفات کے علاوہ انہوں نے اردو صرف و نحو بھی لکھی۔ مولوی ملوک علی فارسی و عربی اور اردو میں کمال رکھتے تھے۔

اس کالج کے تحت ترجمہ و تالیف ہوئی۔ ماسٹر رام چندر اور دوسرے اساتذہ اور طلبا نے مل کر اردو

میں تراجم کیے۔ میڈیسن، ریاضی، سائنس، قانون، اقتصادیات، ہسٹری کا انگلش سے اردو میں ترجمہ کیا۔ الف لیلیٰ کا ترجمہ فارسی سے اردو میں کیا گیا۔

دہلی ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کا قیام مسٹر بستروس کی کوششوں سے ہوا۔ ان کی خرابی صحت پر ملازمت کو خیرآباد کہنے کے بعد مسٹر اشپرنگر نے بہت دلچسپی اور محنت سے دہلی کالج کے لیے کام کیا۔ انہوں نے نصاب تعلیم کی اصلاح میں دلچسپی لی اور خود تاریخ یمنی کو ایڈٹ کیا۔

مولوی ملوک علی نے علم ہندسہ کی کتاب تحریر اقلیدس کے چار ابواب کا ترجمہ کیا۔ اس کے علاوہ سوسائٹی کے لیے انہوں نے سنن ترمذی کا ترجمہ کیا جبکہ مولوی امام بخش صہبائی نے شمس الدین کی ''حدائق البلاغت'' کا اردو ترجمہ کیا۔ ''شعرائے اردو'' کا ایک انتخاب کیا۔

ماسٹر پیارے لال نے تاریخ انگلستان دربار قیصری ۱۸۷۷ء (مسٹر ویلیر کی تالیف کا ترجمہ) کیا تاریخ ہندوستان دس جلدوں میں آئین قیصری تین جلدوں میں لکھی۔

مولوی ذکاء اللہ کی اہم تصانیف میں تاریخ ہندوستان (دس جلدوں میں) آئینِ قیصری تین جلدوں میں اور فرہنگ شامل ہے۔ ''مبادی الانشا'' مضامین کا مجموعہ ہے۔

مولوی کریم اللہ بھی دہلی کالج کے طالب علم تھے اور ان کی تصانیف تعلیم النساء، گلستان ہند، تذکرۃ طبقات الشعرائے ہند، گلدستہ، تذکرۃ النساء، تاریخ شعرائے عرب اور ابو الفداء کی تاریخ کی پہلی، دوسری، چوتھی اور پانچویں جلد کا ترجمہ شامل ہے۔

ماسٹر نور محمد نے تاریخ بنگال اور تاریخ مغلیہ کا ترجمہ کیا۔ ماسٹر حسینی نے تاریخ مغلیہ کے ترجمے میں ان کے مددگار بنے۔

مولوی حسن علی جو کہ فارسی کے استاد تھے قالِ مال، گلستانِ سعدی اور الف لیلہٰ کا منتخب ترجمہ اردو میں کیا۔

ماسٹر حسین بچوں کو تعلیم دیا کرتے تھے انہوں نے تاریخ مغلیہ کا ترجمہ اردو میں کیا۔ تاریخ ایران (مولفہ کوندر) کا اردو ترجمہ بھی کیا۔

سر دیوسنگھ منشی گری کرتے تھے انہوں نے پروفیسر ڈیمورگن کی کتاب اصولِ حساب کا ترجمہ کیا۔ جس کی اصلاح منشی اشرف علی نے کی اور سوسائٹی نے طبع کروایا۔

موتی لال دہلوی نے جو اس کالج کے ہونہار طالب علم تھے پلوٹارک کا تذکرہ سیئر کا ترجمہ اردو میں کیا جو ورنیکلر سوسائٹی نے شائع کیا۔ دو کتابیں مسمریزم کے موضوع پر انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرائی اور تعلیمِ نسواں اور صغیر سنی پر انگریزی میں دو رسالے لکھے۔

پیر زادہ محمد حسین نے سفرنامہ ابن بطوطہ کا ترجمہ کیا۔ مدن گوپال نے کئی قانونی کتب لکھیں جبکہ شیو نرائن نے تذکرہ ریماسن تھینز (پلوٹارک) کا ترجمہ اردو میں کیا۔ ہندوستان کا ایک جغرافیہ اردو میں لکھا۔ ارفوٹ کے رسالے علمِ طبعیات کا ترجمہ سروپ نرائن کے ساتھ مل کر کیا۔

مسٹر بتروس نے ۱۸۴۳ء میں انجمنِ اشاعتِ علوم بذریعہ الہند مل کر قائم کی۔ اس کالج میں باقاعدہ کتابیں دہلی ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کے تحت طبع ہونے لگی۔

یہ تمام معلومات مولوی عبدالحق کی کتاب ''مرحوم دہلی کالج'' اور ممتاز منگلوری کے مضمون ''دہلی کالج کی خدمات'' مشمولہ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند آٹھویں جلد سے اخذ کی ہیں۔ ممتاز منگلوری نے مولانا محمد حسین آزاد اور مولوی نذیر احمد کو دہلی کا ایک طالب علم قرار دیا ہے جبکہ مولوی عبدالحق نے آزاد، نذیر احمد کے حوالے سے ''دہلی کالج'' میں ان کی شمولیت کا تذکرہ ''مرحوم دہلی کالج'' میں پیش کیا۔ پروفیسر ڈاکٹر شمس الہدیٰ دریابادی لکھتے ہیں:

> ''اٹھارھویں صدی اور انیسویں صدی میں جبکہ ہمارا سیاسی زوال تقریباً مکمل ہو چکا تھا۔ معاشرت اور تہذیب کے رشتے اتنے مضبوط تھے کہ دہلی کالج کے غیر مذہبی ادارہ میں رام چندر اور ذکاء اللہ، پیارے لال آشوب، محمد حسین آزاد اور مولوی عبدالکریم وغیرہ سب ایک ہی طرح سوچتے اور ایک ہی طرح لکھتے تھے۔ دس کالج کی یہ خصوصیت تھی ہندوستان کے رجحانات سے ہم آہنگ ہے۔''[۱۴]

دہلی کالج کی خدمات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ دہلی کالج میں تراجم ومضامین و صحافت کی بدولت اردو نثر ایک طرف تو علمی و ادبی نکات و مسائل کو نہ صرف بیان کرنے کے قابل ہوئی دوسری طرف ''علی گڑھ تحریک'' کے لئے نئی راہیں متعین کرنے میں مددگار و معاون ثابت ہوئی۔

دہلی کالج ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں کی نذر ہو گیا اور پھر ۱۸۶۴ء تا ۱۸۷۷ء تک اس نے خود کو زندہ رکھنے کی کوشش کی اور ڈاکٹر شمس الہدیٰ دریابادی لکھتے ہیں:

> ہٹن (Hotton) کے بعد اڈمنڈ ولمٹ (Edmandwilmot) نے کالج کی

خدمات پرنسپل کی شکل میں انجام دیں۔ بہرحال کالج کسی طرح ۱۸۷۷ء تک چلتا رہا۔ اس کے بعد اس کو توڑ کر لاہور کالج میں ضم کر دیا اور تمام اسٹاف وطلباء کو لاہور جانے پر مجبور کر دیا۔"[۱۷]

مختصر یہ کہ دہلی کالج نے اُردو زبان میں روزمرہ بول چال کی نثر کو رواج دیا اور یوں اُردو زبان بتدریج ترقی کرکے ہر قسم کے موضوعات سے اپنے دامن کو کشادہ کرتی رہی۔ ترجمہ وتخلیق دہلی کالج کے مرہون منت ہے۔ نیز اِسی کالج سے مضامین میں ترجمہ وتخلیق کا دائرہ وسیع تر ہوتا گیا۔ یوں اُردو نثر نے ترقی کا سفر شروع کیا دہلی کالج نے تراجم کے ذریعے علمی وٹھوس مضامین اُردو زبان و ادب میں داخل کیے اپنے عہدے نئے اور جدید موضوعات سے اُردو کو متعارف کرایا۔ مضامین کی توسط سے طلبا میں تخلیقی شوق و ذوق اُبھارا۔ سائنسی وعلمی مضامین کی کھپت سے اُردو کی توقیر بڑھائی۔

علی گڑھ کالج: سرسید احمد خاں برصغیر پاک و ہند کے افق پر چمکتا ہوا ستارہ ہیں جو راہ نورد کو بجانب منزل رواں دواں کرتا ہے۔ برصغیر پاک و ہند کے لسانی، معاشی، سماجی، معاشرتی، تعلیمی، مذہبی، اخلاقی رو بہ زوال مسلمانوں کو عزم وحوصلہ عطا کرنے والا مردِ آہن ایک مسیحا بن کر ابھرا اور مسلمانوں کی ڈوبتی نیا کو پار لگایا۔

سرسید احمد خاں نے زبان اردو کو ذخیرۂ الفاظ سے مالا مال کر دیا۔ مافوق الفطرت داستانوں سے اسے نجات دلا دی ان دیو مالائی کہانیوں سے نجات دلا دی اور ان دیو مالائی کہانیوں میں قصہ در قصہ لطف و سرود ہوتا ہے اور کسی رحمانی ہاتھ کے منتظر شہزادے، شہزادیاں و دیگر افراد رہتے۔ پریاں، دیو، جن، بھوت، پریت ان داستانوں کے اہم رکن ہوتے اور زبان و بیان میں افراد داستان کی تعریف وتوصیف یا تنقید و تنقیص میں زمین وآسمان کی قلابیں ملا دی جاتیں یا دھجیاں اڑا دی جاتیں۔

سرسید احمد خاں نے غور وفکر سے جائزہ لینے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا کہ فراریت کی اس فضا کے سحر کو توڑ کر ہی مسلمانوں کو حقائق سے آگاہی دی جا سکتی ہے۔ اس کے لیے انہوں نے "مضمون نگاری" کا سہارا لیا اور اردو زبان جو تکلف وتصنع سے بھری پڑی ہے اور نثری داستانوں میں زبان کی سنگلاخ زمینوں کی دشت نوردی کی جاتی تھی اسے یکسر فراموش کر کے ایک سادہ اور بیانیہ انداز تحریر اپنایا اور کسی مشفق بزرگ کے "رحمانی ہاتھ" کی جگہ "اپنی مدد آپ" کے تحت برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کو جینا سکھایا گویا فریب،

سحر اور مافوق الفطرت نثر سے چھٹکارا دِلا کر عقلیت سے بھرپور انداز تحریر سے اردو ادب کو متعارف کرایا۔

اسی سلسلے میں سرسید نے علی گڑھ تحریک کا آغاز کیا لیکن جن دنوں سرسید غازی پور میں تھے انہوں نے ۱۸۶۳ء میں سائنٹفک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی۔ جس کا مقصد انگریزی سائنسی کتب کا ترجمہ اردو میں کرانے کے ساتھ ساتھ لوگوں میں سائنس کا شوق و دلچسپی پیدا کرنا تھا اور تقریروں، مباحثوں کے ساتھ ساتھ مغربی زبانوں کی اہم کتاب کا ترجمہ کرنا بھی اسی سوسائٹی کا مقصد تھا۔ ایک سال بعد جب سرسید علی گڑھ آئے تو یہاں سوسائٹی کو منتقل کیا۔ ڈاکٹر سید عبداللہ سرسید اور ان کے نامور رفقائے کار، میں لکھتے ہیں:

> "سرسید کے افکار کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ قدیم کے مقابلے میں جدید اور ماضی کے مقابلے میں عہد حاضر سے زیادہ وابستہ ہیں۔"[۱۸]

لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہیں سے علی گڑھ تحریک کا آغاز ہوا۔ ڈاکٹر فوق کریمی "سرسید کے سیاسی افکار" میں لکھتے ہیں:

> "اس اخبار میں معاشرتی، اخلاقی، مذہبی علمی اور ادبی سیاسی، مضامین کے علاوہ انگریزی اخباروں سے عمدہ آرٹیکل جو ہندوستان سے متعلق ہوتے تھے۔ ترجمہ کر کے شائع کیے جاتے تھے یہ اخبار شمالی ہندوستان میں عام خیالات کی تبدیلی اور معلومات کی ترقی کا ذریعہ بنا۔"[۱۹]

علی گڑھ سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ کالج کا پیش رو ثابت ہوئی۔ ڈاکٹر سلیم اختر "اردو کی مختصر ترین تاریخ" میں لکھتے ہیں:

> "علی گڑھ سے پہلے وہ ۱۸۱۶ء میں مراد آباد اور ۱۸۶۴ء میں غازی پور میں جدید طرز کے اسکول قائم کر چکے تھے لیکن ان کے خوابوں کی تعبیر ۱۸۷۷ء میں علی گڑھ کالج کے قیام کی صورت میں ظاہر ہوئی جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی صورت میں آج بھی علمی چشمے کی صورت میں زندہ ہے اور اس یونیورسٹی میں سرسید احمد خاں آسودۂ خاک ہیں۔"[۲۰]

علی گڑھ کالج کے قیام کا مقصد سرسید نے اس لیے کیا کہ مسلمانوں کی زبوں حالی کا اصل سبب مسلمانوں کی جہالت گردانتے تھے۔ اس لیے مسلمانوں کو تعلیمی فقدان کے پیش نظر انہوں نے ایک "کمیٹی خزانۃ الصناعۃ" قائم کی جس کا مقصد ایک مدرسہ قائم کرنا تھا اور اس کمیٹی کے مقاصد میں چندہ جمع کرنا بھی شامل تھا۔ سرسید نے غازی پور کو خیرباد کہہ کر دہلی میں سکونت اختیار کی اور اس مدرسے کے لیے چندہ جمع

کرنا شروع کر دیا۔ راجہ طارق محمود ''سرسید احمد خاں'' میں لکھتے ہیں:

''اب سرسید مرحوم نے چندہ جمع کرنے کے لیے زیادہ کوشش شروع کر دی۔ جہاں جہاں ان کے دوست، مددگار تھے وہاں اس غرض سے سب کمیٹیاں قائم کیں جیسے مرزا پور، علی گڑھ، کانگڑہ، پٹیالہ اس طرح پٹنہ، لاہور، گورکھپور کا سفر کیا گیا۔''۲۴

آخر وہ دن بھی آ پہنچا جب اس مدرسے کا افتتاح ہونا قرار پایا۔ ملکہ کی سالگرہ کے دن ایک جلسے میں جس کے صدر مولوی کریم ڈپٹی کلکٹر علی گڑھ تھے مدرسے کا افتتاح ہوا اور مدرسے میں یکم جون ۱۸۷۵ء سے جماعت بندی ہو کر تعلیم شروع ہو گئی اور اب سرسید نے سوچا کہ اس کالج کی ترقی کے لیے کوشش کی جائے اور ۱۸۷۶ء کو پنشن کی منظوری کے بعد وہ بنارس سے علی گڑھ آئے اور کالج کی ترقی و توسیع کے لیے مصروف عمل ہو گئے اور کالج کی عمارتوں کی وسعت ہونے لگی اور اس کالج کے لیے چندہ کی تگ و دو ملک کے طول و ارض میں ہونے لگی۔ مولانا حالی ''حیات جاوید'' میں لکھتے ہیں:

''علی گڑھ صرف دارالعلوم ہی نہیں بلکہ رفتہ رفتہ قومی ہمدردی، قومی اتحاد، قومی مصالح اور قومی مقاصد کی تحریک کا صدر مقام اور مرکز بننے لگا۔''۲۵

۸ جنوری ۱۸۷۷ء کو کالج کی بنیاد لارڈ لٹن وائسرے ہند کے ہاتھوں ہوئی اور یوں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کا قیام عمل میں آیا۔

سرسید احمد خاں مسلمانان پاک و ہند کی زبوں حالی پستی اور جہالت کی وجہ سے اذیت و کرب میں مبتلا تھے اور انہوں نے مسلمانوں میں علمی، اخلاقی، سیاسی مذہبی منافرتوں کو بھانپ لیا تھا اور مسلمانوں کی ذلت و رسوائی نے ان کو لہو کے آنسو رلا دیا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی، مسلمانوں کی بربادی و ویرانی کا سرسید کے دل پر اثر ہوا اور جو مسلمانوں کے خون کی ہولی کھیلی گئی سرسید اس سے آزردہ ہوئے اور اب انہوں نے تہیہ کر لیا کہ وہ تعلیمی، ذہنی، سیاسی، مذہبی طور پر پسماندہ اس قوم کی تذلیل، غفلت شعاری کاہلی اور رسوائی سے نجات دلائیں گے۔ اس کے لیے انہوں نے یہ مدرسہ قائم کیا۔ ایک تڑپتے فرد واحد کی آواز بن کر یہ مدرسہ ''محمڈن اینگلو کالج'' کے روپ میں سامنے آیا۔ مسلمانوں کے عروج و زوال کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد سرسید نے مسلمانوں کو مغربی تعلیم سے انگریزوں کے پٹھو بنانے کی جگہ قوم کے ذہنی ترفع پر زور دیا۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی ''سرسید اور علی گڑھ تحریک'' میں لکھتے ہیں:

''سرسید کے ذہن میں علم اور تعلیم کا بہت وسیع اور گہرا مفہوم تھا۔ انہوں نے انفرادی

تعلیم کے مقابلوں میں قومی تعلیم کا تصور پیش کیا تھا۔"[۴۳]

سرسید کو ایک اور معرکہ پر جنگ لڑنی پڑی۔ وہ اردو زبان کا تحفظ تھا جس کو ہندو ذہن کی بنا پر فرقہ واریت کے تحت ہندی زبان کو فوقیت دینا چاہ رہے تھے کیونکہ اردو کو مسلمانوں سے وابستہ کر کے اس کے خلاف محاذ آرائیاں شروع کر دیں۔ سرسید نے اس چیلنج کو قبول کیا اور اردو کی آبیاری کے لیے تن دہی سے عمل پیرا ہو گئے۔ علی گڑھ تحریک نے مسلمانوں کو ان کے کھوئے ہوئے تشخص کا احساس دلایا اور اس کالج کے ذریعے مسلمانوں کو علم و آگہی سے بہرہ ور کیا۔

علی گڑھ میں رہتے ہوئے سرسید نے مذہبی منافرتوں اور جہالتوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور مذہب کے اصول وقواعد و ضابطہ حیات کو فعال و متحرک بنانے کی جدوجہد کی۔ سرسید احمد خاں نے مسلمانوں کو اسلام کے صحیح مفہوم و معنی سے نہ صرف آگاہ کیا بلکہ تفسیر القرآن لکھ کر تعصب، تنگ نظری، انتشار اور دقیانوسی رسومات و توہمات کا قلع قمع کرنے کی کوشش کی اور اپنی اس جہد مسلسل میں کامیاب ہوئے۔ سرسید احمد نے اسلام کو داخلی و خارجی تحفظ دیا اور مسلمانوں کے بین الاقوامی اختلافات کو دور کر کے انہیں متحد کرنے کا درس دیا۔

علی گڑھ تحریک نے زبانِ اردو کا تحفظ بھی کیا اور ہندی زبان کی یلغار کے خلاف اردو کا تحفظ بھی کیا اور اسے وسیع سے وسیع کر دیا۔ غالب کی نثر انفرادی کوشش تھی اور علی گڑھ کی نثر کو تصنع، بناوٹ اور پُرتکلف و مرصع سازی کے حصار سے نکال کر فی البدیہہ سیدھا سادہ بے تکلف انداز تحریر عطا کیا اور اس نثر کے تحت ناول، تاریخ، سوانح نگاری، تنقید جیسے موضوعات کو اردو زبان کا زیور بنایا۔

سرسید احمد مصلح قوم تھے۔ اس لیے انہوں نے اکابرینِ ادب کو یکجا کر کے ان سے وہ ادبی تحریریں لکھوائی جو ابتذال، پھکو پن اور سطحی جذبات سے عوام کو چھٹکارا دلانے میں مددگار و معاون ہونے اور انہیں بصیرت، حقیقت پسندی، بلند مقاصد، مذہبی استحکام، اخلاقی پہچان اور معاشی و معاشرتی بلندی عطا کی۔ سرسید نے "خطبات احمدیہ" لکھ کر کے حالی نے "مقدمہ شعر و شاعری"، شبلی اور حالی نے سوانح نگاری سے مسلمانوں کے تابندہ ماضی کو کھوجنے اور ان سے عظمت رفتہ کے لازوال کارناموں سے زبوں حال مسلمانوں کو ولولہ و عزم اور حوصلہ عطا کیا۔ جس کی جلو میں وہ اپنے حال میں اپنی بے غیرتی، مفاد پرستی، بزدلی، کم ہمتی اور غفلت شعاری کے جال کو توڑ کر اعلیٰ مقاصد کی آرزو دل میں پیدا کرنے میں متحد و منظم ہو گئے۔

جدید نظم کو سرسید نے رائج کیا اور غزل کی شاعری کو پس پشت ڈال کر حالی سے "مدوجزر اسلام"

لکھوائی۔ شبلی نے المامون، الفاروق و دیگر سوانح لکھ کر اسلام کے حقیقی معنوں کو اجاگر کیا۔ سیرۃ النبی ﷺ لکھ کر شبلی نے مسلمانوں کے صالح کردار کا پُروقار منظر پیش کیا اور سرسید نے اردو میں مضمون نگاری کا آغاز کیا اور رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' جاری کر کے نامساعد حالات میں جکڑے مسلمانوں کو سیاسی، معاشی، معاشرتی مذہبی بے راہ روی سے باہر نکالا اور سفر انگلستان کے دوران انگلستان میں انہوں نے اسٹیل اور ایڈیسن کے اخبار ''ٹیٹلیر'' اور ''سپکٹیٹر'' کا مطالعہ کیا اور قومی کی اصلاح کے لئے مضمون نگاری کا آغاز کیا انہوں نے معاشرتی اخلاقی، سماجی، مذہبی معاشی ابتری پر مضامین لکھے اور لوگوں میں ''اپنی مدد آپ'' کا جذبہ ابھارا۔

ان مضامین کی زبان عام فہم سیدھی سادی تھی۔ بھاری بھر کم الفاظ اور انہوں نے موضوع اور مضمون موضوع پر زور دیا تا کہ عوام اور ادب کے درمیان افہام و تفہیم کا سلسلہ جاری ہو اور وہ زنگ آلودہ ذہن دل کو مصفا کر کے اپنی کردار سازی کریں۔ سرسید مقالات سرسید مرتبہ محمد اسماعیل پانی پتی لکھتے ہیں:

> ''تک بندی سے جو اس زمانے میں مقفی عبارت کہلاتی تھی ہاتھ اٹھایا۔ جہاں تک ہو سکا سادگی پر توجہ دی۔ اس میں کوشش کی کہ جو کچھ لطف ہو وہ مضمون کی ادا میں ہو۔ جو اپنے دل میں ہو وہ ہی دوسرے کے دل میں پڑے تا کہ دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے۔''[۲۴]

ادبی لحاظ سے اس اسلوب بیان اور روحِ مضمون میں ندرت و جدت پیدا ہوئی اور حالی کی ''مقدمہ شعر و شاعری'' نے نئے اور اہم مسائل سے روشناس کرائی۔ نذیر احمد کے اصلاحی ناولوں نے مسلمانوں کے اخلاقی زوال کی نشاندہی کر کے ان کی شخصیت و کردار کی اصلاحی کوششیں کیں۔ سرسید احمد خان لکھتے ہیں:

> ''ہمارے سب سے پہلے پیشوا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بت خانہ کے اور ہمارے ہادی۔ بابی وامی جدی محمد رسول اللہ صلی اللہ وآلہ وسلم نے کعبہ کے بتوں کو توڑا اور کعبہ سے نکالا پس ہم بھی ان کی تقلید کریں اور اپنے دلوں کے اس معنوی بتوں کو توڑیں جن کے توڑے بغیر کبھی فلاح نہیں پانے کے۔''[۲۵]

علی گڑھ محمڈن کالج نے مسلمانوں میں تعلیم کا تناسب بڑھا دیا جب ابتدائی طور پر پورے ہندوستان میں ۲۰ گریجویٹس تھے اور ہندو گریجویٹس کی تعداد ۸۴۶ تک جا پہنچی تھی۔ کالج میں مسلمانوں کی تعداد کا اضافہ ہوتا چلا گیا اور ۱۹ سال کے بعد مسلمان طلبا میں ۱۲۶ گریجویٹ اور ۱۷۴ انڈر گریجویٹ تھے۔

محمڈن کالج میں ''لاء'' "LAW" کی تعلیم حاصل کرنے والے ۱۸۹۰ء میں قانونی امتحان پاس کرنے لگے اور یوں ۱۴ ایل ایل بی کے اور ۵ وکالت کے امتحان میں پاس ہوئے۔

محمڈن کالج کے طلبا نے جو گورنمنٹ سروس اور ہندوستانی ریاستوں میں ملازمت حاصل کی وہ اگرچہ تسلی بخش نہیں تھی۔ لیکن مسلمانوں کے مورال بڑھانے اور ان کی تربیت و اصلاح کرنے میں علی گڑھ محمڈن کالج کا نمایاں حصہ ہے اور اگر یہ کالج قائم نہ ہوتا تو سرسید تحریک مسلمانوں کی جہالت دور کرنے اور اعلیٰ تعلیم یافتہ بنانے کے ساتھ ساتھ ان میں اسلامی تشخص، ذاتی کردار سازی اجتماعی اخوت و اتحاد، مذہبی و دینی اصلاح، اخلاقی استحکام معاشی مضبوطی پیدا کرنے میں ناکام رہتی۔

علی گڑھ تحریک کے توسط سے سرسید نے جن اکابرینِ ادب کو اکٹھا کیا۔ انہوں نے ایک طرف تو اردو زبان کو ذخیرۂ الفاظ سے مالا مال کیا دوسرے علمی، سماجی، سائنسی، مذہبی، اخلاقی موضوعات پُر کر کے اصلاح معاشرہ کے لیے تگ و دو کی۔

غزل میں سطحی عشق و عاشقی کا دور دورا تھا۔ سرسید نے حالی سے نظم ''مدوجزر اسلام'' لکھوا کر مسلمانوں کے سنہری ماضی کو سامنے لا کر ان کی غیرت و حمیت کو جگایا۔ حالی نے ہی پہلی تنقید کی کتاب ''مقدمہ شعر و شاعری'' لکھ کر شعر و شاعری کے پرانے اور فرسودہ رسم و رواج کی بیخ کنی کی اور غزل کے دامن کو موضوعات کی جدت سے بھر دیا۔ شبلی نے ''شعر العجم'' لکھی اور یوں تنقید نے علی گڑھ کا دامن تھام کر موضوعات کو اہم قرار دیا۔

علی گڑھ تحریک نے سوانح نگاری کے فن کو صداقت سے نوازا اور شبلی نے مشاہیرِ اسلام کی سوانح لکھ کر تاریخ کی سچی منظر کشی کی۔

سرسید احمد خاں نے ''خطبات احمدیہ'' لکھ کر عیسائیوں کے منہ بند کر دیئے اور حالی نے ''حیات جاوید'' اور ''یادگار غالب'' لکھ کر فکرِ غالب و سرسید کا عکس عوام کو دکھلایا۔ ''اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر'' لکھ کر شبلی نے اورنگ زیب عالمگیر کے بارے پھیلے ''متعصب رہنما'' کے پروپیگنڈے کی نفی کی۔

سرسید نے غزل کی جگہ نظم لکھنے پر زور دیا اور حالی نے نیچرل شاعری کے ذریعے اس دور کے سماجی، اخلاقی، سیاسی، مذہبی حالات کی بھرپور عکاسی نظموں کے ذریعے کر کے مسلمانوں کو زبوں حالی سے نکالنے میں اہم رول ادا کیا۔ نذیر احمد نے علی گڑھ تحریک کے زیر اثر ایسے قصے لکھے جو اس دور کے اخلاقی پسماندگی اور

اس کے تدارک پر مبنی تھے۔

داستان کے سحر زدہ ماحول، پرتکلف عبارت، فارسی تشبیہات و استعارات اور جن و پری سے، جادوئی چھڑی سے کام نکالنے کی جگہ خود عقل و دلائل اور حاضر دماغ سے اپنی بگڑی کو سنوارنا۔ اپنے کردار کے کمزوری اور بزدلی کو اپنی قوت ارادی اور بہادری سے دور کرنا سکھایا۔ ''مراۃ العروس'' ''توبۃ النصوح''، ''بنات النعش''، ''ابن الوقت'' جیسے ناول اس کے عکاس ہیں۔ نذیر احمد کے کردار جاندار اور حقیقی زمین سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کے مسائل بھی برصغیر پاک و ہند کے تھے۔

شبلی نے سیرۃ النبی ﷺ لکھ کر مسلمانوں کو یقین و ایمان کے ساتھ ساتھ آئیڈیل شخصیت کا احساس و ادراک عطا کیا۔ ماضی کی داستان ہی نہیں دہرائی بلکہ حال و مستقبل کی فلاح و بہبود کے لیے ماضی کے تابناک و درخشندہ باب سے سبق حاصل کرنے اور کچھ کر گزرنے کا حوصلہ عطا کیا۔

تہذیب اخلاق: علی گڑھ تحریک نے تعلیمی نکتہ نگاہ سے مسلمانوں میں علمی آگاہی شعور عطا کیا۔ سرسید نے تعلیمی و اصلاحی مضامین لکھے اور تہذیب الاخلاق کے اجرا نے مافوق الفطرت اور تصوراتی دنیا کی نفی کرتے ہوئے حقیقی دنیا سے قوم و حکومت کو متعارف کرایا اور ایک نیچرل سیدھا سادہ عام فہم انداز بیان عطا کیا جس کے جلو میں اردو زبان متنوع اور جدید مضامین کو بھی اپنے اندر سمونے لگی۔ اس کے مضامین نے نئی اصناف سے بھی متعارف کرایا۔ ادب اور تنقید میں ڈاکٹر سید شاہ علی لکھتے ہیں:

> ''سرسید نے ''تہذیب الاخلاق'' کے ذریعے مسلمانوں میں آزاد خیالی، رواداری اور ہمدردی پیدا کی۔ ان کے مذہبی اور سیاسی عقائد اور طریقۂ تعلیم و طرز معاشرت میں اصلاح کی ----- ایک پوری قوم کے سیاسی سماجی، اور مذہبی خیالات میں انقلاب عظیم برپا کر دینا ایک طرف حکومت پر اثر انداز ہونا دوسری طرف عوام کے بے تاج بادشاہ یعنی ان کے ادیبوں کی ساری تصانیف میں خواہ وہ از قسم ناول ہوں، تواریخ ہوں، سوانح حیات ہوں، شعری تصانیف ہوں، تنقید میں ہوں، یا طنزیات و مضحکات ہو، سب میں ایک روحِ اصلاح کارفرما کر دینا، سارے لٹریچر کا رخ پھیر دینا اور زندگی کے دیگر شعبہ جات کی طرح ادب میں بھی ایک تلاطم برپا کر دینا کچھ اور ہی معنی رکھتا ہے۔ ایک فرد کی بے پناہ قوت اور اثر کا اس سے بہتر اور شاندار مظاہرہ کسی قوم کی اس صدی کی تاریخ میں شاذ و نادر ہی کہیں ملے گا۔''[۲۶]

ڈاکٹر سید عبداللہ "ملا وجہی سے عبدالحق تک" میں لکھتے ہیں:

"ان کے مرکزی مضامین کا خیال یہ ہے کہ قومی ترقی کے لیے تہذیب ضروری ہے ان کے نزدیک تہذیب کے معنی وہ اندرون تبدیلی ہے جو بُرے کو اچھا کر دیتی ہے۔(بحوالہ مضمون سولزیشن یا تہذیب)۔"۴۷

اس سے پہلے کہ تہذیب الاخلاق کے اجرا اور مقاصد پر مفصل روشنی ڈالی جائے سرسید کے سفر انگلستان اور مقاصد سرسید کا مختصر جائزہ لے لیا جائے۔

یہ تو ہم پہلے بھی ذکر کر چکے ہیں کہ سرسید نے انتہائی نامساعد حالات میں کام کا آغاز کیا تھا۔انگریز ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا ذمہ دار مسلمانوں کو ٹھہراتے تھے جبکہ ہندو اپنی عیاری و مکاری کا جال بُن کر مسلمانوں کے خلاف ہونے کے ساتھ ساتھ حکومت کے پٹھو بن کر رہ گئے تھے اور معاشی عدم استحکام میں انگریز حکومت کا ساتھ دینے لگے تھے۔سرسید نے بھانپ لیا تھا کہ اگر حکومت کو جو مسلمانوں سے گلے شکوے ہیں۔انہیں اگر دور نہ کیا گیا اور ان غلط فہمیوں کا ازالہ نہ کیا گیا تو برصغیر پاکستان و ہند میں مسلمانوں کا مستقبل تاریک تر ہو جائے گا اور ان کا شاندار و تابناک ماضی صرف ایک کسک بن کر رہ جائے گا۔

اس مردِ مجاہد نے اس کام کا بیڑا اٹھایا کہ کس طرح مسلمانوں کو ان کا حقیقی، اصلی اور جائز مقام دلایا جائے۔اس غرض سے غور و فکر کرنے کے بعد پہلا کام سرسید نے یہ کیا کہ وہ سفر انگلستان پر روانہ ہوئے۔ انگلستان سفر کرنے کا وسیلہ وہ انگریز پالیسی تھی جس کے تحت برصغیر پاکستان و ہند کے باسیوں کو اعلیٰ تعلیم کی غرض سے انگلستان بھیجنا مقصود تھا۔سرسید کے بیٹے سید محمود کو اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے منتخب کیا۔تو سرسید احمد خاں نے بھی اپنے بیٹے سید محمود کے ساتھ جانے کا مصمم ارادہ کر لیا۔اس مقصد کے پورا کرنے کے لیے سرسید نے مالی مشکلات کی بھی پروا نہ کی اور اپنے کتب خانے کو بیچا اور کوٹھی و گھر کو رہن رکھ دیا۔

یکم اپریل ۱۸۶۹ء میں بنارس سے انگلستان روانہ ہوئے۔سرسید نے لندن میں قیام کے دوران کیمبرج اور آکسفورڈ یونیورسٹیوں کے نظام تعلیم کا مشاہدہ کیا۔

سرسید نے ۱۸۶۹ء تا ۱۸۷۰ء تک سترہ مہینے لندن میں قیام کیا اور ہمہ وقت اپنے مقاصد کے حصول کی جدوجہد کرتے رہے اور برطانیہ کے معاشی، سیاسی، ادبی، اصلاحی، سماجی استحکام کا بہ غور مطالعہ و مشاہدہ کرتے رہے۔اس دوران وہ لندن کے معزز افراد سے بھی ملے کیونکہ سفرِ انگلستان کا مقصد سرسید کے نزدیک یہ تھا کہ مسلمانان پاکستان و ہند کے لیے وہ لائحہ عمل اختیار کیا جائے جس سے ان کی اصلاح و تربیت ہو

سکے۔ مسلم و انگریز اقوام کے گلے شکوے دور ہو سکیں اور ترقی یافتہ انگریز قوم کی معاشرتی ترقی کے راز کو پا سکیں تا کہ مسلمانوں میں تعلیم، جدوجہد اور ترقی کا شعور پیدا کیا جا سکے۔ وہاں کے ارباب اختیار سے ملاقات کی جائے اور اصحاب علم وفن سے مل کر وہاں کی علمی، تہذیبی اور معاشرتی ورثے کا مطالعہ کیا جائے۔ سرسید کا سفر انگلستان کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ وہاں کی سائنسی اور مادی ترقی کا جائزہ لے کر برصغیر پاکستان و ہند کی سائنسی و مادی ترقی کے لیے منصوبہ تیار کیا جائے۔ وہاں کے کارخانوں، ہسپتالوں، خیراتی مراکز اور کاشتکاری کے طریقہ جات کا بھی مطالعہ کیا اور وہاں کی لائبریریوں، عجائب گھروں وغیرہ کا بھی بہ غور مطالعہ و مشاہدہ کیا۔ حالی ''حیات جاوید'' میں سرسید کی درخواست کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''ان مفید اور عمدہ باتوں کو ہندوستان کی بھلائی کے واسطے لکھیں جو اس امر کے نتیجے میں کہ تجارت کے باب میں انگلستان کے باشندے کیسے مستعد ہیں اور کارخانوں اور کاشتکاری اور شفاخانوں اور خیرات اور اس کے شہروں کی صفائی اور اس کی دولت اور علم سے روز بروز کام لیا جاتا ہے۔''[۲۸]

انگلستان میں لارڈ لارنس نے ان کا پُرتپاک خیرمقدم کیا کیونکہ سرسید اور ان کے اہل خانہ سے ان کے مراسم تھے اور وہ ہی عمائدین لندن سے سرسید کی ملاقات کرانے کا سبب بنے۔ سرسید نے ان کے توسط سے ہی لندن کی خاص خاص تقریبوں میں حصہ لیا اور وہاں متعدد جلسوں اور تقاریب میں حصہ لیا۔ سرسید احمد خاں کا سر ولیم مور کی کتاب ''لائف آف محمدؐ'' میں موجود اسلام اور نبی پاک ﷺ کے حوالے سے نازیبا بیانات تھے۔ ان کا سختی سے نوٹس لیتے ہوئے اس کے جواب میں ''خطبات احمدیہ'' لکھی اور اس کتاب کا جواب قرآن و حدیث اور خود انگریزوں کی کتابوں سے استفادہ کرتے ہوئے دیا۔

۱۳ جولائی کو سٹمونین سوسائٹی اوف سول انجینئرز کے ایک عظیم الشان جلسے میں سر لارڈ لارنس کے ساتھ شمولیت کی۔ ٹیمز پر جا کر اس کے کنارے کارخانوں کا مشاہدہ کیا اور اس جلسے میں جہاں انجینئرز چھائے ہوئے تھے اور انجینئرنگ کے سوا کوئی اور موضوع نہ تھا سرسید نے ایک شاندار اور پُرمغز تقریر کی۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ انگریز حکومت کی شان رعب و دبدبے میں تعلیم، ہتھیار اور عدل و انصاف شامل ہیں۔ جس کی بنا پر لوگ ان کے معترف ہیں لیکن جس چیز نے حکومت برطانیہ کی عظمت دھاک بٹھائی ہے وہ ان کی فن انجینئرنگ کے نتائج ہیں اس سلسلے میں انہوں نے ریل، دریاؤں کے پل، ندیاں اور پہاڑوں سے گزرتی ریل کا ذکر کیا ہے۔ اس تقریر کا ترجمہ لارڈ لارنس نے کیا تو سرسید احمد کو بہت سراہا گیا۔

۱۲اگست ۱۸۶۹ء کو سرسید احمد خاں کو لارڈ لارنس کی ایما پر انڈیا آفس میں ڈیوک آف گارنل کے ہاتھوں سے سی۔ایس۔آئی کا خطاب اور تمغہ ملا۔ ملکہ معظمہ سے لوی کے محل میں ملاقات کی۔ انھیم کلب کی آنریری ممبری ان کا وہ اعزاز تھا جو ان کی علمی حیثیت کو سراہنے کا واضح ثبوت تھا۔ یہاں صرف اس شخص کو ممبری دی جاتی تھی جو قابلِ عزت، مشہور، اعلیٰ علمی و ادبی شخصیت ہو اور سرسید کے لیے دو دفعہ اس کلب کی آنریزی اس ممبری کا اعزاز حاصل ہوا۔ سرسید کا مقصد اعلیٰ برطانیہ کی تعلیمی ترقی کا مطالعہ کر کے پاکستان و ہند میں مسلمانوں میں تعلیمی فقدان کو دور کرنے کی سعی تھا اس لیے انہوں نے کیمبرج یونیورسٹی کا دورہ کیا اور وہاں یونیورسٹی سے متعلقہ ہر شے کا سیر حاصل مطالعہ و مشاہدہ کیا۔ تعلیمِ نسواں اور طریقۂ کارِ تعلیم کا عمیق مشاہدہ کر کے برصغیر پاکستان و ہند کے مسلمانوں کی تعلیمی پالیسی کے لئے حکمت عملی تیار کی۔ انہوں نے برطانیہ کی علمی ترقی کے ساتھ وہاں کی تہذیبی و ثقافتی و تمدنی ترقی اور اس ترقی کی بنا پر منظم، معلم اور شائستہ قوم کی صورت میں انگریزوں کے منظر عام پر آنے کا کھوج بھی لگایا اور مسلمانوں کی پسماندگی کا اس سے موازنہ بھی کیا۔

سرسید احمد خان نے قیام لندن کے دوران رچرڈ اسٹیل اور جوزف ایڈیسن کے رسائل ٹیٹلر اور سپیکٹیٹر کا مطالعہ کیا اور اس بات کا اندازہ بخوبی لگایا کہ اسٹیل اور ایڈیسن کے مضامین انگریزی ادب کو ایک طرف تو نئی سمت گامزن کر رہے ہیں اور دوسری طرف ان کی اخلاقی و اصلاحی جدوجہد عوام الناس کی کردار سازی میں مددگار اور معاون ثابت ہو رہی ہے۔ ایڈیسن کے رسالے ٹیٹلر میں جو ۱۷۰۹ء سے ۱۷۱۱ء تک ہفتے میں تین بار شائع ہوتا رہا۔ ایڈیسن نے سیاسی بصیرت کے فقدان کی بنا پر ماحول میں انتشار اور اخلاقی سماجی رو بہ زوال معاشرے کی حالت زار کو موضوع بنا کر ٹیٹلر کا آغاز کیا۔ ٹیٹلر اور سپیکٹیٹر نے انگریز قوم کے اخلاق و اطوار تہذیب و تمدن کی آبیاری کرنے کے ساتھ ساتھ قومی احساس، قومی غیرت اور قومی تفکر کو بھی ارفع و اعلیٰ مقام عطا کیا اور اسپیکٹیٹر جو یکم مارچ ۱۷۱۱ء کو جاری ہوا اس کے پہلے شمارے میں سٹیل لکھتا ہے:

> "اس پرچے کے اجراء کا مقصد اپنے معاصرین کے لیے ہر صبح کو خیالات پر ایک FULL SHEET شائع کرنا اور ملک کی بہبود اور تفریح میں اپنا کردار ادا کرنا ہے۔"[۲۹]

ڈاکٹر طیبہ خان اردو میں ادبی نثر کی تاریخ میں لکھتی ہیں:

> "اردو ادب کے نقطۂ نظر سے سب سے اہم تحریک سرسید احمد خاں کی تحریک تھی۔

سرسید اور ان کے رفقاء کے خیالات اس عہد پر حاوی ہیں اور اس تحریک سے وابستہ
حضرات نے اردو ادب کی ہر صنف میں تاریخ ساز کارنامے انجام دیئے ہیں۔۳۰

سرسید نے تہذیب الاخلاق کے اجرا سے مسلمانوں کو نیا نظام فکر عطا ہوا۔ خیر کے عمل کا جو فقدان تھا۔ فرقہ واریت اور ملائیات نے مسلمانوں کے اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا تھا۔ سرسید نے تعلیم و تہذیب و تمدن کی آبیاری کے ساتھ ساتھ ورثہ کے تحفظ کا احساس بھی دلایا۔ مسلم تہذیب روحانی فقدان کا شکار تھی۔ فکری و ذہنی انتشار میں مبتلا تھی۔ رب العزت نے سرسید احمد خان کو مصلح قوم بنا کر پیش کیا۔ کہا جاتا ہے کہ الفاظ میں اتنی شدت ہوتی ہے کہ وہ تاریخ بدل دیتے ہیں اور سرسید اور ان کے رفقائے کار کے الفاظ و اسلوب نے برصغیر پاکستان و ہند کے مسلمانوں کی واقعی تاریخ تبدیل کر دی اور وہ مرد آہن اور مرد مومن بن کر اپنی اور معاشرے کی کردار سازی کرنے میں مصروف ہو گئے۔ جیسا کہ ہم پیچھے بھی ذکر کر آئے ہیں کہ سرسید کا زمانہ انحطاط ہی انحطاط کا زمانہ ہے۔ زوال پذیر معاشرہ ہے اس فلسفے کو سرسید نے ''تہذیب الاخلاق'' کے مضامین میں اٹھایا۔ مقصد زندگی کھو بیٹھنا اس دور کے مسلمانوں کا بہت بڑا المیہ تھا۔ مفکرِ قوم بن کر سرسید احمد خاں اُبھرے اور دانائی و حکمت سے کام لیتے ہوئے قوم میں تعلیم کا جذبہ ابھارا اور اخلاق کو سنوارا۔ تہذیب الاخلاق نکالا اور بتایا کہ ادب کا مقصد قوم کو جگانا ہے قوم جاگے گی تو مقصد اعلیٰ ہو گا اور مسلمان تنزلی سے ترقی کی طرف گامزن ہوں گے۔ روحانی و فکری افلاس گہرا ہو رہا تھا اور علم و ہنر میں پیچھے رہنے سے جو نقصان مسلمانوں نے اٹھایا سرسید کو اس کا احساس تھا انہوں نے ''تہذیب الاخلاق'' کے ذریعے مسلمانوں کو پابندیٔ وقت کا احساس دلایا کہ وقت کسی کا لحاظ نہیں کرتا اور جو قومیں اس کی قدر نہیں کرتیں یہ ان کو کچل ڈالتا ہے اور وقت کا تقاضا یہ ہے کہ علمی روایت، تہذیبی روایت کو سائنس و ٹیکنالوجی سے ہم آہنگ کیا جائے اور بربادیٔ وقت سے جو سسٹم اور نظام خراب ہو چکا ہے اس کی قدر کر کے اپنی صفیں درست کریں اور فضول کھیل تماشوں میں وقت کا ضیاع کرنے کی جگہ دینِ کامل کی طرف رجوع کریں۔

عظمتِ انسانی کا درس بھی سرسید نے ''تہذیب الاخلاق'' کے مضامین میں دیا ہے۔ مسلمانوں کے داخلی تضاد کو اجاگر کیا ہے اور ان مضامین کے ذریعے عصری شعور کے ساتھ ساتھ مسلمانوں میں تدریجی تبدیلیاں کیں۔ سرسید ایک پوری صدی پورا عہد بن کر ابھرے اور ان کا رچا ہوا انداز و اسلوب تاریخِ پاکستان و ہند کو ایک نیا رخ عطا کر گیا اور یوں مسلمان زوال و انحطاط سے نکل کر ترقی کی طرف گامزن

ہوئے۔ آرزوؤں نے ان کے دل میں جنم لیا اور غیرت وحمیت کے متوالے بن کر ابھرے۔ سرسید احمد خاں نے ان دونوں پرچوں کا بہ غور مطالعہ کرنے کے بعد یہ منصوبہ بنایا کہ لندن سے واپسی پر ان دونوں کی طرف سے ایک رسالہ نکالا جائے جو اصلاحی نثروں کے لیے کارآمد ثابت ہو سکے۔ چنانچہ علی گڑھ تحریک کے تحت سرسید نے اردو میں مضمون نگاری کا آغاز کیا یہ وہ دور تھا کہ جب دو مختلف اقوام کا معاشی، معاشرتی، سماجی، اخلاقی زوال ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا سبب بنا اور ہم بہ خوبی اس بات سے واقف ہیں کہ ہندو مسلم اقوام اپنے عقائد اور نظریات میں ایک دوسرے سے مختلف تھیں۔ ایک طرف تو احساس کمتری کا شکار ہو کر ابتری و بربادی کی طرف مسلمان قوم مائل تھی دوسری طرف انگریز سامراج ہے۔ حاکمانہ تمکنت نے ان کی رہی سہی ذہنی و جسمانی معاشرتی اور معاشی، مذہبی اور اخلاقی طاقت کو سلب کر لیا تھا۔ ایسے میں سرسید مرد مجاہد کی مانند اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنے اندر لگی آگ سے اس الاؤ کو روشن کرنے لگے جس کی چنگاریاں ابھی مسلمانوں کے ذہن و قلب میں سسکیاں لے رہی تھیں اور یوں انہوں نے ۲۴ دسمبر ۱۸۷۰ء کو پہلا ''تہذیب الاخلاق'' کا پرچہ شائع کیا۔ ٹیٹلر اور سپکٹیٹر کا ذکر کرتے ہوئے غلام حسین ذوالفقار سرسید کے الفاظ میں اس رسالے کے اجرا کا مقصد بیان کرتے ہیں:

> غرضیکہ جو کچھ فرنگستان میں تھا وہ ہی کچھ بلکہ اس سے بھی زیادہ اب ہندوستان میں موجود ہے۔ اور بلاشبہ ایک ٹیٹلر اور اسپیکٹیٹر کی یہاں بھی ضرورت ہے۔ سو خدا کا شکر ہے کہ یہ پرچہ انہیں کے قائم مقام مسلمانوں کے لیے جاری ہوا مگر افسوس کہ یہاں کوئی اسٹیل اور ایڈیسن نہیں ہے۔'[۳۴]

سرسید کی اس رائے سے کون اختلاف کرسکتا ہے کہ اُنھوں نے ''تہذیب الاخلاق'' کے ذریعے برصغیر پاکستان و ہند کے مسلمانوں کی ذہنی، سماجی، معاشرتی، اخلاقی، مذہبی فکر میں مثبت تبدیلیاں کی اور اس کے لیے انہوں نے ''تہذیب الاخلاق'' کے اجرا کے ضمن میں اکابرین ادب کو اکٹھا کیا ان سے رسالے کے لیے مضامین لکھوائے چراغ علی، سرسید، حالی، نذیر احمد، مولوی مہدی علی خاں بہادر، محسن الملک اور وقار الملک مولوی ذکاء اللہ وغیرہ۔ جیسے مایہ ناز ادبا کی تقریروں نے عقل وفرو کے پردے چاک کیے اور خود سرسید نے مذہب، سائنس، سیاست، معاشرت، تعلم تہذیب و تمدن اور تاریخ غرضیکہ ہر شعبہ ہائے زندگی کے موضوعات پر قلم اٹھایا اور ہر موضوع کو سرسری طور پر نہ لیا بلکہ دلائل و منطق اور تحقیق و تنقید سے اس کی پرداخت کی۔ مضمون فرد واحد اور اس سے متعلقات پر غور وفکر کرتا ہے اس لیے انسانی زندگی کا موضوع اس کا نکتۂ نظر ہوتا

ہے۔اس لیے مضمون کی جدت اور تنوع نے زبانِ اردو کو علمی و ادبی، سیاسی و سماجی، اخلاقی و مذہبی موضوعات سے مالا مال کیا اور منطق و دلائل کے ساتھ ساتھ سنجیدگی بھی سرسید کے دور کا قاصد رہی۔اگر چہ سرسید مضمون نگاری کے بانی تھے لیکن مضمون کا خالص اور اُچھوتا رنگ ان کی تحریروں میں مکمل طور پر نظر نہیں آتا کیونکہ ان کی تحریروں میں اصلاحی و تربیتی رنگ چڑھا ہوتا ہے۔لیکن پھر بھی سرسید کے موضوعات زندگی سے مربوط ہیں اور ان کا غیر رسمی طریق کار زندگی کے تاریک گوشوں کی نشاندہی کرنے کے ساتھ ساتھ اُجالے کی کرن بھی ثابت ہوتے ہیں اور انسان کی کشادگی و رفعت کا احساس دلاتے ہیں۔

''تہذیب الاخلاق'' کے مضامین خالص مذہبی، سیاسی و اخلاقی و اصلاحی مضامین میں ان کے چند مضامین ایسز کہلا سکتے ہیں مثلاً رسم و رواج، تعصب، تکمیل، انسان کے خیالات طریقۂ زندگی، ہمدردی، تعلیم و تربیت، عورتوں کے حقوق، وحشیانہ نیکی، تربیت اطفال، امید کی خوشی، ریا، مخالفت، خوشامد، کاہلی، اخلاق، گزرا ہوا زمانہ سراب حیات، خود غرضی اور قومی ہمدردی، بحث و تکرار، طریقہ تناول و طعام، مہذب قوموں کی پیروی، آدم کی سرگذشت اور تہذیب الاخلاق کا آخری پرچہ سرسید نے زبان اردو کو اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کے لیے کیوں چنا ڈاکٹر سید شاہ علی کہتے ہیں:

> ''انہوں نے مضمون کے ادا کا ایک سیدھا اور صاف طریقہ اختیار کیا۔الفاظ کی درستی اور بول چال کی صفائی میں کوشش کی۔ رنگین عبارت سے جو تشبیہات اور خیالی استعارات سے بھری ہوتی ہے۔جس کی شوکتِ لفظی سے دل پر کچھ اثر نہیں ہوتا پرہیز کیا ہندی و مقفیٰ عبارت سے ہاتھ اٹھایا جہاں تک ہو سکا سادگی عبارت پر توجہ کی۔اس میں کوشش کی کہ جو کچھ لطف ہو وہ صرف مضمون کے ادا میں ہو جو اپنے دل میں ہو وہی دوسروں کے دل میں پڑے تاکہ دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے۔''[۳۴]

ٹیٹلر اور اسپکٹیٹر ادبی پرچے تھے۔سرسید کے نزدیک اخلاقی و اصلاحی مقاصد تھے اسی لیے انہوں نے سادہ عام فہم انداز بیان اختیار کرنے کے باوجود اردو زبان کے قواعد و انشاء کو مدنظر نہیں رکھا اور زبان کو مقدم نہ جانا اور سادگی اختصار کے ساتھ ساتھ حقیقت پسندانہ نثر کا آغاز کیا جو صداقت و دیانت کے ساتھ ساتھ تصنع و بناوٹ سے پاک پُر تکلف عبارت کی بیخ کنی کرتی نظر آتی ہے۔تہذیب الاخلاق میں زیادہ تر مضامین خود سرسید کے ہوتے تھے۔سرسید کے ساتھ مولوی ذکاء اللہ محسن الملک، مولوی چراغ علی وغیرہ کے

نام اہم ہیں۔ سرسید احمد خان اور ان کے ساتھیوں کی یہ خوبی تھی کہ موضوع چاہے کیسے ہی دقیق کیوں نہ ہوں ان کو اپنے زورِ قلم سے مونس و ہمدرد قوم بن کر جرأت مندانہ عام فہم انداز میں تحریر کرتے۔ ''کابلی'' مضمون میں سرسید کس قدر سلیس زبان میں بڑی فلسفیانہ بات کہہ جاتے ہیں۔ تہذیب الاخلاق کے مقاصد کے حوالے سے ڈاکٹر سید عبداللہ ''ملا وجہی سے عبدالحق تک'' میں لکھتے ہیں:

> ''تہذیب الاخلاق کے مشمرہ مقاصد کا دائرہ کار بہت وسیع تھا۔ مثلاً فرد کے اخلاق کی اصلاح، قومی اصلاح و تکمیل، تہذیب اور شائستگی اور قومی عزت کا احساس پیدا کرنا، قوم کو جدید ترقیاتِ علمی کی طرف راغب کرنا، علمی نقطۂ نظر کی اصلاح، دینی زاویے کی اصلاح، ادب و انشاء کے لئے ذوق صحیح کا پیدا کرنا، اردو کی قومی حسیات اور اجتماعی افکار کا ترجمان بنانا۔''[۳۳]

مضمون ''امید کی خوشی'' فکری زاویوں کی توجیح کرتا ہے جبکہ ''اپنی مدد آپ'' خیالی، تصوراتی دنیا سے باہر کھینچ لاتا ہے۔ ''خوشامد'' انسانی اخلاق کے بزدلانہ افعال کا عکس دکھاتا ہے۔ ''بحث و تکرار'' جہالت کے پرخچے اڑاتا ہے ''تربیت اطفال'' علمی فقدان کا احساس دلاتا ہے۔ ''تعلیم و تربیت'' کے توسط سے ان دونوں کی اہمیت اجاگر کی گئی ہے۔ ان مضامین میں ادبی رنگ بھی جھلکتا ہے۔ ''تہذیب الاخلاق'' اور عہد سرسید کی نثر کے حوالے سے ڈاکٹر سلیم اختر نے بہت خوبصورت بات کہی ہے وہ لکھتے ہیں:

> ''سرسید کے موضوعات کی سنجیدگی، عبارت کا منطقی انداز اور عقلیت پر مبنی ذہنی رویہ انھیں باقاعدہ مقالہ یا مضمون بنا دیتا ہے۔ ''تہذیب الاخلاق'' میں سرسید اور ان کے تمام ہمنوا مضامین لکھتے تھے جن کے نتیجہ میں جلد ہی قارئین کا ایک ایسا طبقہ پیدا ہوگا جسے داستانی ادب کی صورت میں افیون کی ضرورت نہ رہی۔ یوں قومی، معاشرتی اور تعلیمی مسائل پر لکھنے پڑھنے اور سوچنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوا۔''[۳۴]

اس سے پہلے کہ ''تہذیب الاخلاق'' کا مختصراً مجموعی جائزہ لیں سرسید کے مندرجہ ذیل مضامین کا مختصر فکری و عملی تجزیہ کرتے ہیں۔ ''رسم و رواج'' مضمون میں سرسید احمد خاں نے رسم و رواج پر کڑی تنقید کی ہے اور رسم و رواج کے مثبت و منفی پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ بُرے رسم و رواج اپنانے یا رائج العام ہونے سے وہ اچھی نہیں ہو جاتیں بلکہ معاشرے کے بگاڑ کا سبب بنتی ہیں۔ رسم و رواج کو تعصب کی چادر نہیں اوڑھانی چاہیے اس سے دوسرے قوم کی رسم و رواج سے مستفید نہیں ہو جا سکتا۔ لیکن دوسری قوم کی اندھا دھند تقلید ہمیں جہالت کے اندھے کنوئیں میں ڈال کر ہمارے مستقبل کو تاریک کر سکتی ہے۔ مسلمانوں نے جو

بلاخوف و تردد دوسری اقوام و مذاہب کی وہ عادات و رسوم اپنا لیں جو ان کی تہذیب و سماج کے لیے زہر قاتل ہیں ان سے نقصانات ہوئے اور اپنے مذاہب میں غلط رسموں و رواج نے بھی ہمیں مشکلات کا شکار کیا ہے۔ ہمیں ان رسومات کو عارضی جان کر ان سے گریز نہیں کرنا چاہیے کیونکہ ان سے گریز ہمیں اذیت مُصیبت اور مشکلات کا شکار کر دے گا اور کر دیا ہے۔ ہمیں اِن رسومات و رواج کو غور وفکر کرنے کے بعد ان کے منفی اثرات کی بیخ کنی کر کے ان کے مثبت اور مہذب نکات سے اس قوم کو آشنا کرنا چاہیے اس سے تنزلی ترقی میں تبدیل ہو گی۔ یہ ایک پُرمغز مضمون ہے اور اس میں سرسید نے انسان کی عادات و رسوم و رواج کے جہالت پر مبنی رویوں اور انسانی رویوں کے باعث مسلمانوں کی اخلاقی پستی اور معاشی و سیاسی زوال کی نشاندہی منطق اندازِ نگارش سے کی ہے۔ اسلوب اس مضمون کا شستہ ہے اور اندازِ بیان روا ہے۔ اندازِ انشائی سے تہذیب و شائستگی اخلاق و تربیت کی مرہون منت ہوا کرتی ہے یہ ہی سرسید کا اس مضمون لکھنے کا اصل مدعا ہے۔

''تعصب'' سرسید کا ایک ایسا مضمون ہے جس میں سرسید نے انسانی بزدلی کے ایک اور نمایاں بدنما داغ کی عکاسی کی ہے۔ تعصب وہ گھناؤنا عمل ہے جس کے کر گزرنے پر کوئی فرد اور کوئی قوم اپنے تمام اخلاق، تہذیب و تمدن شائستگی اور ترقی و علم و ہنر کے باوجود ذلت و رسوائی اور تنزلی کے اتھاہ گہرے سمندر میں جا گرتے ہیں اور مسلمانوں کو سرسید احمد خاں یہ باور کراتے ہیں کہ اس تعصب نے ان میں فرقہ واریت کی جو فضا قائم کی ہے اور اپنی نیکیوں کو تعصب کی بھینٹ چڑھا کر ضائع کر دیتے ہیں۔ اسلام کی مضبوطی اور سچائی اٹل ہے لیکن نادان اور بے وقوف لوگ تعصب کے گھیراؤ و پڑاؤ میں ٹھہر کر اسلام کے مقاصد کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں اور اعتراضات و سوالات میں الجھ کر انسانی ترقی کی راہیں مسدود کرتے ہیں۔ تعصب دنیاوی ہو یا دینی انسان کو، قوم کو تباہ و برباد کر دیتا ہے اور ہر قوم دوسری قوم سے استفادہ کرتی ہے اور تعصب بری خصلت ہے۔ اس سے اجتناب ہی میں ہماری ترقی مضمر ہے۔ سرسید کا یہ مضمون مدلل ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے اندر بزدلانہ افعال و اعمال کی عکاسی کا وہ جوہر رکھتا ہے جس کے توسط سے مسلمان پاکستان و ہند اپنی بزدلانہ عادت، تعصب سے آشنا کرتی ہے اور اپنے آپ کو متحد کرنے کا عزم کرنے کا حوصلہ و ولولہ اپنے اندر پیدا کرنے کی تلقین کرتی ہے۔ اپنی اس خامی سے لاعلمی کی بنا پر حکومت مغلیہ کے زوال، معاشی، معاشرتی پسماندگی مذہبی منافرتوں کا ادراک کر کے ان کے قلع قمع کرنے کے لئے کوشاں ہوتی ہے۔ سرسید



کے مضامین کے دوررس نتائج نکلتے ہیں۔ اسلوب سادہ اور دلکش ہے۔ الفاظ میں رچاؤ اور تاثر ہے۔ دل سے بات نکلتی اور دل پر اثر کرتی ہے۔

''تکمیل'' سرسید نے ''تکمیل'' جیسے مضبوط اور ٹھوس مضمون میں زوال کی حقیقتوں اور صداقتوں کو بے نقاب کیا ہے۔ تکمیل کی خوش فہمی کسی بھی قوم یا فرد کے لیے تنزلی کا شاخسانہ ثابت ہوتی ہے۔ لفظ تکمیل صرف خدا کی ذات ہی کے لیے مختص ہے اور انسان لمحہ بہ لمحہ خود کو سنوارنے ، بنانے، اور نت نئے طریقوں سے خود کو نئے زاویوں میں ڈھالنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ مسلمانوں کے زوال کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ وہ غور و فکر کر کے اپنی کمزوری پر نظر نہیں ڈالتے ۔ اس بنا پر وہ کچھ سیکھنے کے عمل سے محروم رہ جاتے ہیں اس طرح ذلت و رسوائی کے طوق ان کا مقدر بن جائیں گے۔ علم و سائنس ٹیکنالوجی اور فنی و جدید تعلیم کے ساتھ ساتھ سماجی، مذہبی، اخلاقی تبدیلیاں اور نئے علوم کا علم ہی انسان کو ترقی کی راہ پر گامزن کرتا ہے۔ اسلوبِ بیان دلکش ہے۔ امثال و اقوال موضوع کی مناسبت سے ہونے کی بنا پر مضمون کی دلفریبی بڑھاتے ہیں۔ لہجہ سپاٹ ہی نہیں مضمون میں روانی کے ساتھ دلائل و منطق کی چاشنی بھی موجود ہے۔ حسن ادا، حسن بیان، حسن موضوع اس مضمون کا خاصہ ہے۔

''کاہلی'' ایک مختصر مضمون ہے جس میں ''کاہلی'' کا اصل مفہوم دل کی کاہلی بتایا گیا ہے اور دل کی کاہلی انسان کے دل کو مردہ کر دیتی ہے اور وہ کام کرنے اور کھوج لگانے کے مقاصد کی آرزو دل میں ہویدا کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ روٹی کمانے اور بنیادی ضروریات کے لئے محنت کرنا مجبوری ہے اور ہر قوم اس مجبوری میں جکڑی ہوئی ہے لیکن اپنی غیرت و حمیت کو برقرار رکھنا اور نئے علوم و فنون کو سیکھنا اور زندگی کو اعلیٰ مقاصد و آرزو کے تحت نہ گزارنا اصل کاہلی ہے اور مسلمانوں کو ان کی اس کاہلی نے زوال پذیر کیا ہے۔ انگریز قوم کی ترقی ان کی کاہلی کو دور کرنے میں مضمر ہے اور مسلمانوں نے کاہلی کے لبادے کو اوڑھ کر دلِ مردہ کو لبیک کہہ کر تنزلی و ذلت و رسوائی کو اپنے گھر کا راستہ دکھایا ہے۔ مضمون کا اختصار مضمون کی جامعیت کو للکارتا نہیں بلکہ اس کی جامعیت کی وہ مضبوطی عطا کرتا ہے کہ جس سے مضمون کی نہ صرف اہمیت بڑھ جاتی ہے بلکہ موضوع کی فکری و عقلی پرداخت بھی ہو جاتی ہے۔ امثال جاندار اور پُراثر ہیں اور دل سے بات نکلتی اور دل پر اثر کرتی ہے۔

''امید کی خوشی'' خالص ادبی مضمون ہے مضمون میں لفظوں کا جادوئی اثر دل کو سحر زدہ کر دیتا ہے۔

مضمون کا حسن انسان کو حوصلہ و ولولہ عطا کرتا ہے اور وہ اندھیروں میں امید کے جگمگاتے جگنوؤں کے جھرمٹ میں سوادِ منزل کی کھوج لگاتا ہے اور حسنِ عمل کو لبیک کہتے ہوئے حسنِ زندگی میں وہ ربط قائم و دائم کرتا ہے کہ جس کے جلو میں ترقی توقیر و عزت اس کے منتظر رہتے ہیں۔ ''امید'' وہ دلربا دلکش پیکر ہے جو مایوس خوف زدہ اور جہالت و ذلت کے قعرِ مذلت میں پڑے انسان کو نوید بہار بن کر مژدۂ بہار دیتی ہے۔ اُمید حوصلہ و ولولہ عطا کرتی ہے۔ خوشی و مسرت سے ہمکنار کرتی ہے۔ ناامیدیوں میں امید کے دیئے جلاتی ہے۔ پھر سرسید احمد خاں نے بھی بوڑھے، ماں، عالم نزع میں مبتلا انسان اور دیگر امثال سے ''امید'' کو بڑے دلکش انداز میں عیاں کیا ہے اور اپنے کام اور قوم کی دردمندی میں گھلنے اور ''امید'' پر آس لگانے کے احساس کو جس سادہ، عام فہم زبان میں پیش کیا ہے وہ مصلح قوم ہونے کا بھرپور اور بین ثبوت ہے اور یہ مضمون مکمل اور متوازن ہے۔ اس کا اعتدال و جامعیت اس مضمون کی اہمیت کو بڑھا دیتا ہے:

> ''او نورانی چہرہ والے یقین کی اکلوتی خوب صورت بیٹی! امید ـــــ روشنی تیرے ہی ساتھ ہے تو ہی ہماری مصیبت کے وقتوں میں ہم کو تسلی دیتی ہے تیری ہی بدولت نہایت دُور دراز خوشیاں ہم کو نہایت پاس نظر آتی ہیں۔ تیرے ہی سہارے سے زندگی کی مشکل مشکل گھاٹیاں ہم طے کرتے ہیں۔ تیرے ہی سبب سے ہمارے خوابیدہ خیال جاگتے ہیں۔''۳۵

''بحث و تکرار'' ایک فلسفیانہ موضوع ہے اور انسان کی جہالت پر مبنی خصلت کا عکاس ہے۔ اور کتوں کے بھونکنے اور تیوریاں چڑھانے کو جس طرح ہم غلیظ خیال کرتے ہیں اور ان سے اجتناب کرتے ہیں بالکل اسی طرح انسان جب فضول بحث و مباحثہ میں پڑتا ہے تو مثالِ سگ وہ بھی اپنے ہوش و حواس کھو دیتا ہے اور تہذیب و شائستگی کے دامن سے ہاتھ اٹھا لیتا ہے۔ سرسید کہتے ہیں کہ خیالات کا اختلاف ایک صحت مند فعل ہے اور اس میں اگر فساد کی کیفیت ہو تو اس کیفیت کے آنے سے پہلے ہی بحث کو ختم کر دینا چاہیے۔ نہایت پُرمغز مضمون ہے۔ مدلل اور ٹھوس ہے۔

> ''انسانوں میں اختلاف رائے ضرور ہوتا ہے اور اس کے پرکھنے کے لیے بحث و مباحثہ ہی کسوٹی ہے اور اگر سچ پوچھو تو بے مباحثہ اور دل لگی کے آپس میں دوستوں کی مجلس بھی پھیکی ہے، مگر ہمیشہ مباحثہ اور تکرار میں تہذیب و شائستگی، محبت اور دوستی کو ہاتھ سے جانے دینا نہ چاہیے۔''۳۶

سرسید کے تمام مضامین مدلل جامع اور اختصار پر مبنی ہیں۔ان مضامین کے موضوع اچھوتے ہونے کے ساتھ ساتھ مافوق الفطرت عناصر سے گریز کرتے اور حقیقی زندگی کے واقعات و طرز معاشرت کی کمزوریوں اور بزدلانہ افعال کی عکاسی کرتے نظر آتے ہیں۔ شاہد حسین رزاقی "سرسید اور اصلاح معاشرہ" میں لکھتے ہیں:

> "ہندوستان میں معاشرتی اصلاح کے لیے سرسید "تہذیب الاخلاق" سے وہ ہی کام لینا چاہتے تھے جو اسٹیل اور ایڈیسن نے انگلستان میں ٹیٹلر اور اسپیکٹیٹر سے لیا تھا۔ سرسید اُن دونوں کے مفید اثرات اور معاشرتی اصلاح میں کامیاب سے بہت متاثر تھے۔"۳۷

انجمنِ پنجاب کا قیام انگریزوں کی سیاسی ولسانی ضرورت تھا۔ برصغیر پاک و ہند کے دوسرے اضلاع کی طرح پنجاب میں بھی انگریزی نظامِ حکومت کو مستحکم کرنے کے لئے فروغِ تعلیم پر توجہ دینے لگے۔ کرنل ھالرائیڈ کے کہنے پر ڈاکٹر لائٹر نے انجمنِ پنجاب کی بنیاد رکھی۔ ڈاکٹر لائٹر ایک مایہ ناز مشترق تھے اور گورنمنٹ کالج کے پرنسپل۔ انھوں نے ہندو مسلم عالم و اُستاد اکٹھے کیے اور اُن کے تعاون سے ۲۱جنوری ۱۷۶۵ء کو لاہور میں انجمنِ پنجاب کا نام دیا۔اس انجمن کے تحت لائبریریاں اور مدارس، چھاپہ خانہ وجود میں آیا۔صفیہ بانو اپنے مضمون انجمنِ پنجاب قیام، مقاصد اور تاریخ میں انجمنِ پنجاب کے اراکین کا ذکر کرتی ہیں۔ (یہ مضمون مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد کے شمارہ ۳،۴ مارچ واپریل ۲۰۰۴ء جلد ۲۰ میں شائع ہوا)۔ڈاکٹرلائٹر انجمن پنجاب کے صدر بنائے گئے۔منشی ہرسکھ رائے اخبار فارسی کے سیکرٹری اور جانو بین چند رائے انگیریزی کے سیکرٹری منتخب ہوئے۔ دیگر اراکین کا نام صفیہ بانو نے دیوان بیج ناتھ، فقیر سید شمس الدین، سردار بھگوان سنگھ، شیخ فیروز الدین، مولوی کریم الدین، مولوی محمد حسین ، مولوی نیاز حسین، مولوی علمدار حسین بتائے ہیں۔اغراض مقاصد کے حوالے سے صفیہ بانو لکھتی ہیں۔

> "انجمن کے اغراض و مقاصد اور کمیٹیاں:
>
> ا۔قدیم شرقی علوم کا احیاء اور لسانیات، بشریات، تاریخ اور ہندوستان اور ہمسایہ ملکوں کے آثار قدیمہ کے بارے میں تحقیقی کام کی حوصلہ افزائی۔
>
> ۲۔دیسی زبانوں کے ذریعے عوام میں تعلیم کا فروغ
>
> ۳۔صنعت اور تجارت کی ترقی
>
> ۴۔معاشرتی۔ادبی۔سائنسی اور علم دلچسپی کے سیاسی مسائل پر تبادلہ خیالات،

حکومت کے تعمیری اقدامات کو مقبول بنانا ، ملک میں وفاداری اور مشترک ریاست کی
شہریت کے احساس کو فروغ دینا اور عوام الناس کی خواہشات اور مطالبات کے
مطابق حکومت کو تجاویز پیش کرنا ۔
۵۔مفاد عامہ کے تمام اقدامات میں صوبے کے تعلیم یافتہ اور با اثر طبقوں کو افسروں
سے قریب تر لانا ۔"۳۸

انجمن پنجاب کے تحت یہ بھی لائحہ عمل تیار کیا گیا کہ کتب کی اشاعت کے ساتھ ساتھ رسائل کا آغاز بھی کرتے ہیں ۔تا کہ دور دراز علاقوں میں بھی فروغ اُردو کے ساتھ ساتھ تعلیمی معیار بلند کیا جا سکے ۔اُردو انگریز سرکار کی ضرورت تھی ۔انجمن پنجاب نے علم کی ترویج و ترسیل کے لئے ۱۸۶۵ء میں "رسالہ انجمن اشاعت مطالب مفیدہ " کا اجرا کیا جس کے مُرید مولانا محمد حسین آزاد تھے اس رسالے میں انجمن کی روداد کے ساتھ ساتھ علمی و ادبی مضامین شائع ہوتے تھے ۔اخلاق و ادبی مضامین کی اشاعت بھی انجمن پنجاب کے رسالہ "رسالہ انجمن اشاعت مطالب مفیدہ "کے تحت ہوئی اور ان مجامین کے ذریعے عوام الناس کے بگڑے مذاق کی درستگی پر زیادہ زور دیا جانے لگا ۔مولوی محمد حسین کا مضمون "تحصیلِ علم سر مطلب اصل کیا سر" کا نثر پارہ ملاحظہ ہو:

"ہمکو چاہیے کہ جو کام کریں نیک نیت رفتار پر اور نیکی کے ٹہکانے پر ہمکو اور
ہمارے کُل قوم بلکہ تمام بنی نوع خورد و کلان پیرو جوان کو چاہے خوب سمجھیں کہ نیکی
کیا ہے اور ہم کو کیا کرنا چاہے اور جو کچھ ہم کرتے ہیں وہ کیا ہے ۔ثمرہ نافعہ
درخت کا اوسکے پھولنی پھلنے کے بعد حاصل ہوتا ہے ۔اس واسطے ہم کو چاہیے کہ
نیکی و نیک اطواری اختیار کریں بعد ازاں اس کا ثمرہ دیکھیں کہ کیا ہو گا ۔آئندہ
مالک خدا ہی اوسکے نام سے ابتدا ہے اور اسکے نام سے انتہا ہے۔"۳۹

جبکہ ادبی مضمون مولانا محمد حسین آزاد کا ہے یہ مضمون اُردو زبان اور شاعری پر مختصر روشنی ڈالنے کے بعد شاعری کے مزاج کی اصلاح کی طرف یوں اشارہ کرتا ہے ۔مضمون کا نام "لیکچر درباب اصلیت زبان اُردو کی" ہے۔ آزاد لکھتے ہیں:

"شاعری کا مدراج کل ہندوستان میں فقط مضامین عشق و محبت پر ہی اگر چہ اصلاح
اس کی نہایت مشکل ہے ۔ بہر حال توجہ شرط ہے ۔تجویز ہوا کہ لیکچر کے دن ایک
جلسہ مشاعرہ کا ہی ہوا کرے ۔اگر چہ فی الحال یہ نہیں کہہ سکتی ہیں کہ یہ جلسہ طرز

کام کا ہو گا لیکن اس میں حاضرین کو ترغیب دے کر تعین ہے کہ رفتہ رفتہ ایک طرز
کام پر لایا جائے گا۔"[۴۰]

۱۸۶۹ء ستمبر کا رسالہ میری تحقیق کی کاوشوں کا ثمر ہے اس رسالے کی پیشانی پر لکھا ہوا ہے۔

"Risalah ANJAMAN-I-PANJAB

or

proceedings of the society of the diffresion of useful

knowledge and literary essay & co.lahore.

آگے دو تین الفاظ ناقص ہیں اس کے بعد لکھا ہے:

میں جاری ہوتا ہی۔ مضامین علم مفید و خاص عام ترغیب وتہذیب، اخلاق وفوائد
علوم وفنون اسمیں قلمبند ہوتے ہیں۔"[۴۱]

سائنسی مضمون ہر دور کی ضرورت رہے ہیں کائنات کے اسرار رموز سے واقفیت انسانی جستجو کا خاصہ ہے۔ انجمن پنجاب کے رسالے مین بھی سائنسی علوم وفنون پر مضامین لکھے جاتے تھے۔ تا کہ عوام الناس کو سائنس کی اہمیت سے آگاہ ہی کے ساتھ ساتھ سائنسی ترقی وتبدیلی کی بھی معلومات فراہم کی جائیں۔ ستمبر ۱۹۶۹ء میں سائنس پر دو مضامین منشی کرام الٰہی کے ملتے ہیں۔ پہلا مضمون احوال برق و صاعقہ اور دوسرا مضمون "لیکچر دربیان ایجاد آلہ خوردبین" ہے۔ منشی کرم الٰہی کے مضمون احوال برق و صاعقہ میں آسمانی بجلی کے وجود میں آنے کا بیان ہے:

"کائنات جو ہیں کسی خاص جگہ پر برق کا کا قیام نہیں بلکہ تمام جو مین موجود ہے۔
بعض اشیاء زمین کے ایسی خاصیت رکھتی ہیں کہ بہ وقت پہونچی ابر کے زمین کے
قریب برق کو اپنے طرف جذب کرتے ہیں اور برق ...وتاثر جذب اوراشیاء کی سحاب
کو چھوڑ کر اشیاء جاذبہ کی جانب میل کرتی ہے اور بہ وقت چھوڑنے کے سحاب کو پھاڑ
بنا دیتی ہے اسی سبب سی آواز ہولناک پیدا ہوتا ہر اوراس کو صاعقہ کہتی ہین۔"[۴۲]

جلد ہی انجمن پنجاب کا یہ رسالہ بند ہو گیا۔ ڈاکٹر مسکین علی حجازی اپنی کتاب "اُردو صحافت کی تاریخ میں" لکھتے ہیں کہ ۱۸۷۱ء میں رسالہ انجمن اشاعت مطالب مفیدہ بند ہو گیا اور اس کی جگہ ہمسائے پنجاب نے لے لی۔ لیکن جلد ہی ہمسائے پنجاب کی جگہ اخبارِ انجمن پنجاب ہمارے سامنے آتا ہے۔ اخبارِ انجمن پنجاب کے مدیر ماسٹر پیارے لال آشوب اور محمد حسین آزاد تھے۔ میری تحقیق کا ثمر ۱۸۸۷ء فروری کا اخبار

ہے ۔اخبارِ انجمن پنجاب ہر جمعہ کے روز نکلتا تھا ۔۱۴ فروری ۱۸۸۷ء کے اخبار انجمن پنجاب میں اس اخبار کے اغراض و مقاصد لکھے ہوئے ہیں:

"اس اخبار کا اجراء انجمن پنجاب کی طرف سی ہی اور اس سی اصلی مطلب یہ ہی کہ ہمارے ہم وطن خیالات انگریز اور منشا ہر سرکار اور سرگزشت زمانہ سے واقف ہون اور اُن سے حاکم و محکوم دونوں کو فائدہ پہچو نچی اور بہبودی ملک ہو۔

اس مں اپنے اپنے موقع پر مضامین ذیل ہوتے ہیں۔

۱۔آرٹیکل یعنے جو اُمور وقتاً فوقتاً گور طلب ہوں اُن پر اپنی اور اہل ملک کی رائی۔

۲۔دیگر انگریزی اور اُردو اخبارون کی رائے۔

۳۔مضامین علمی اور بیانات عیب وصواب کتب وغیرہ نو تصنیف شد۔

۴۔حالات ممالک غیر اور ذکر رسم و رواج مختلف اقوام یورپ ایشیا ، افریقہ اور امریکہ کا جو ابتک اس ملک کے لوگوں کو معلوم نہیں اور حال اُن ممالک کی تاریخ قدیم کا۔

۵۔خطوط اور خبریں

۶۔خلاصہ قوانین اور احکام تغیر وتبدل وغیرہ ، عہدہ دران و ملازماں سرکاری

۷۔اشتہار ومضامین وغیرہ اخبار سے متعلق جو صاحب و خط و کتابت کرنا چاہیں وہ ایڈیٹر اخبار سے کریں اور معاملات زر کی بابت جو تحریر ہو وہ بنام سیکرٹری انجمن پنجاب بمقام لاہور ہونی چاہیے۔"[۴۳]

انجمن پنجاب کے ان رسائل میں تراجم مختلف زبانوں کی کتب ومضامین کے شائع ہوتے تھے ۔عربی ، فارسی سنکرت و دیگر زبانوں کے تراجم سے اُردو زبان کے کو وسعت عطا کی ۔شاعری کے مزاج میں تبدیلی پیدا کی اور عوام لناس کو سماجی و معاشرتی شعور ان مضامین کے ذریعے عطا کیا ۔گُل و بلبل کی داستانوں سے عوام کے ذہنوں کو چھٹکارا دلانے اور اخلاقی و سماجی مشکلات کا ہاتھ ہے ۔اپنی مشکلات کا خود حل تلاش کرنا ان رسائل کا مدعا تھا اور عوام الناس کو ان کی خودداری اور غیرت سے متعارف کرانے میں انجمن پنجاب نے اہم کام سر انجام دیا اور مولانا محمد حسین آزادحالی کی سر براہی مین شاعری کی نوک بلک سنواری گئی اور حیاتِ مستعار کے حقیقی پہلو سے متعارف کرایا گیا ۔ زندگی کا شعور عطا کیا اور سیاسی و تمدنی مزاج کی تبدیلی بھی انجمن پنجاب کے رسائل و کتب کی اشاعت کے ذریعے کرنے میں محققین و ادبا نے اہم کردار ادا کیا ہے ۔ڈاکٹر انور سدید ''اُردو ادب کی تحریکیں'' میں لکھتے ہیں:

"انجمن پنجاب کے جلسوں میں پڑھے گئے مضامین پر بحث ونظر کی عام اجازت

تھی۔ انجمن کے اس دستورالعمل سے شرکاء جلسہ کو بحث میں حصہ لینے، علمی نکتہ پیدا کرنے اور صحت مند تنقید کو برداشت کرنے کی تربیت ملی ۔ ہندوستان میں مجلس تنقید کی اولین روایت کو انجمن پنجاب نے ہی فروغ دیا ۔ علمی امور میں عالی ظرفی، کشادہ نظری اور وسعتِ نظر کے جذبات کی ترویج کی ۔"۴۴

حواشی

۱۔ عبدالحق، مولوی، ''مرحوم دہلی کالج''، انجمن ترقی اُردو ہند (دہلی) دوسرا ایڈیشن ۱۹۴۵ء ص:۶

۲۔ ممتاز منگلوری، ''دہلی کالج کی خدمات''، تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند، جلد ہشتم ۱۸۰۳ء تا ۱۸۵۷ء، لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۱ء، ص: ۸۷،۸۶

۳۔ احمد فاروقی، خواجہ، دلی کالج اُردو میگزین قدیم کالج نمبر ۱۹۵۳ء، دہلی: دلی پرنٹنگ ورکس، دہلی، ص:۲۱

۴۔ رفعت جمال، ڈاکٹر، ''ذکاء اللہ حیات اور اُن کے علمی کارنامے''، دہلی: اُردو بازار نقش اوّل، ۱۹۹۰ء، ص:۱۰۹

۵۔ ممتاز منگلوری، ''دہلی کالج کی خدمات''، تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند، جلد ہشتم ص ۱۸۰۳ء، ۱۸۵۷ء، لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۱ء، ص:۹

۶۔ عبدالحق، مولوی ''مرحوم دہلی کالج''، انجمن ترقی اُردو ہند (دہلی) دوسرا ایڈیشن ۱۹۴۵ء ص ۱۵۰

۷۔ ایضاً، ص:۱۳۳

۸۔ اشرف احمد، ڈاکٹر، (حرفے چند) ذکا اللہ حیات اوران کے علمی کارنامے، دہلی: ساقی بک ڈپو، اُردو بازار، نقش اوّل ۱۹۹۰ء، ص:۱۴

۹۔ رفعت جمال، ڈاکٹر، ''ذکا اللہ حیات اوران کے علمی کارنامے'' دہلی: اُردو بازار، نقش اوّل ۱۹۹۰ء، ص:۹۹

۱۰۔ طیبہ خاتون، ڈاکٹر، ''اُردو میں ادبی نثر کی تاریخ'' ۱۸۵۷ تا ۱۹۱۴ء، دہلی: ۳۲۱ گلی گڑھیاں، اپریل ۱۹۷۹ء، ص:۳۳۔۳۲

۱۱۔ ممتاز منگلوری ''دہلی کالج کی خدمات'' تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند، جلد ہشتم، ۱۸۰۳ تا ۱۸۵۷ء، لاہور: پنجاب یونیورسٹی ۱۹۷۱ء ص:۹۳

۱۲۔ غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر، مضامین سر سید، لاہور: مکتبہ خیابانِ ادب، جنوری ۱۹۶۷ء (مقدمہ، ص ہل)

۱۳۔ ایضاً،ص:(ک)

۱۴۔ احمد فاروقی، خواجہ (مقدمہ) ماسٹر رام چندر، صدیق الرحمٰن قدوائی، دہلی: ناشر شعبہ اُردو، یونیورسٹی دہلی، اشاعت اول، اگست ۱۹۶۷ء ص:۵۱،۵۰

۱۵۔ ایضاً،ص:۳۷

۱۶۔ شمس الہدای دریا آبادی، ڈاکٹر، ''ہندوستانی نشاۃ ثانیہ میں قدیم دہلی کالج کا کردار''، نئی دہلی: شاہد پبلی کیشنز، ص:۷۹،۷۸

۱۷۔ ایضاً ص: ۷۶

۱۸۔ عبداللہ، ڈاکٹر سید، ''سرسید اوراُنکے رفقائے کار''، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۴ء، ص ۲۵

۱۹۔ فوق کریمی، ڈاکٹر، ''سرسید کے سیاسی افکار'' علی گڑھ: کریمی بلڈنگ مسلم یونیورسٹی، سن اشاعت دسمبر ۱۹۸۷ء، ص:۱۲۹

۲۰۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، ''اُردو کی مختصر ترین تاریخ آغاز سے ۲۰۰۰ تک'' لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، سن ۲۰۰۲ ص:۳۳۲،۳۳۱

۲۱۔ راجہ طارق محمود ''سرسید احمد خان'' جہلم: بک کارنر، ۱۹۸۸ء،ص:۲۸۰

۲۲۔ الطاف حسین، حالی، مولانا، ''حیات جاوید'' لاہور: دوست ایسوسی ایٹس، اُردو بازار، ۲۰۰۳ ص:۱۱۲

۲۳۔ خلیق احمد نظامی، پروفیسر، ''سرسید اور علی گڑھ تحریک'' علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ایڈیشن ۱۹۸۲ء، ص:۶۴

۲۴۔ سید احمد خان، ''مقالاتِ سرسید''، حصہ دہم، مرتبہ محمد اسماعیل پانی پتی، لاہور: مجلس ترقی ادب ص:۱۰

۲۵۔ .....، مقالاتِ سرسید، حصہ دو از دھم، مرتبہ محمد اسماعیل پانی پتی، لاہور: مجلس ترقی ادب، طبع دوم جون ۱۹۹۳ء، ص:۲۸۴

۲۶۔ علی شاہ، ڈاکٹر، سید ''ادب اورتنقید'' کراچی: مکتبہ اسلوب، ناظم آباد، اشاعت اول ۱۹۶۲ء، ص:۴۶،۴۷

۲۷۔ عبد اللہ، ڈاکٹر، سید ''ملا وجہی سے عبد الحق تک'' لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۶ء، ص:۷۲

۲۸۔ الطاف حسین حالی، حیاتِ جاوید، لاہور: مطبوعہ آئینہ ادب، ص:۱۷۱

۲۹۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، ''اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ (آغاز سے ۲۰۰۰ تک)، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ص: ۶۱

۳۰۔ طیبہ خان، ڈاکٹر، ''اُردو میں ادبی نثر کی تاریخ'' ۱۹۵۷ء تا ۱۹۱۴ء) دہلی: گلی گڑھیا، اپریل ۱۹۷۹ء

ص:۵۸

۳۱۔ غلام حسین ذوالفقار،ڈاکٹر،''مضامین سرسید'' لاہور: مکتبہ خیابانِ ادب طبع زاد جنوری ۱۹۶۷ء،ص:۱۱،۱۰

۳۲۔ علی شاہ، ڈاکٹر،سید''ادب اورتنقید'' کراچی: مکتبہ اسلوب، ناظم آباد، اشاعت اول ۱۹۶۲،ص:۶۳

۳۳۔ عبد اللہ، ڈاکٹر سید،''ملا وجہی سے عبد الحق تک'' لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۱۹۹۶ء،ص:۶۹

۳۴۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اُردو کی مختصر ترین تاریخ آغاز سے۲۰۰۰ تک'' لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، س۲۰۰۲، ص:۳۳۶

۳۵۔ سید احمد خان، مقالاتِ سرسید مرتب،محمد اسماعیل، مولانا، پانی پتی، حصہ پانزدھم، لاہور: مجلس ترقی ادب،طبع دوم جون۲۰۰۱،ص:۱۹

۳۶۔ ایضاً، حصہ پنجم،طبع دوم، اپریل ۱۹۹۰ء،ص: ۱۴۰

۳۷۔ شاہد حسین رزاقی،''سرسید اور اصلاحِ معاشرہ''، لاہور:ادارہ ثقافت اسلامیہ،طبع اول،۱۹۶۳ء،ص:۴۳

۳۸: صفیہ بانو ڈاکٹر ، انجمنِ پنجاب تاریخ و خدمات، کراچی: کفایت اکیڈمی ، اُردو بازار ، طبع اول ۱۹۷۸،ص: ۱۰۷

۳۹: محمد حسین ، مولوی، ''تحصیلِ علم سی مطلب اصلی کیا ہی''،رسالہ انجمن اشاعت مطالب مفیدہ پنجاب '' نمبر۲۳،جلد ۳ بابت ماہ جولائی ۱۸۶۷،لاہور: مطبع بترس،ص:۷

۴۰: محمد حسین آزاد ، مولانا ، ''لیکچر درباب اصلیت زبان اُردو''رسالہ انجمن اشاعت مطالب مفیدہ پنجاب ''نمبر۲۳، جلد ۳ ،۶جولائی ۱۸۶۷ء، لاہور: مطبع بترس،ص: ۱۷

۴۱: رسالہ انجمن اشاعت مطالب مفیدہ پنجاب نمبر ۹، جلد نمبر ۵ ،ص: ۱

۴۲: کرم الٰہی منشی، ''احوال بر قادعۃ'' رسالہ انجمن اشاعت مطالب مفیدہ پنجاب ،نمبر۹ ،جلدنمبر۵،ص:۲

۴۳: اغراض مقاصد ، اخبار انجمن پنجاب ''،نمبر ۵ ، جلد ۱۸ ، مطبوعہ ۱۴ فروری ، ۱۸۸۷،نمبر ۵ ، جلد ۱۸ مطبوعہ شنبہ ،ص: ۱۶

۴۴: انور سدید، ڈاکٹر، ''اُردو ادب کی تحریکیں'' ابتدائے اُردو سے ۱۹۷۵ء تک، کراچی: انجمن ترقی اُردو، ایڈیشن چہارم،ص: ۳۵۲

باب سوم

مضمون نگاری ۱۸۵۷ء سے ۱۸۹۹ء تک

مضمون نگاری ۱۸۵۷ء سے ۱۸۹۹ء تک

زندگی کا حسن جب تحریروں میں سمٹ آتا ہے تو جذبات متحرک ہوتے ہیں۔ احساسات کو زبان مل جاتی ہے اور کیفیاتِ قلب ماننِد آئینہ مافی الضمیر بیان کرتے ہیں۔ اصنافِ ادب میں مافی الضمیر کی عکاسی کے لیے مضمون نگاری وہ واحد صنف ہے جو مصنف کے ذاتی خیالات، تصورات ونظریات کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ یہ لطیف وعمیق احساسات میں زندگی کے ہر پہلو، ہر موضوع اور ہر منظر کو اپنے اندر سمو کر اس طرح پیش کرتا ہے کہ ایک طرف تو مسرت و انبساط سے قاری آشنا ہوتا ہے اور دوسری طرف نامعلوم دنیاؤں کی سیر سے بھرپور لطف اٹھاتا ہے۔ علم وآگہی کے سارے منظر دھل کر نُکھرے ہو کر قاری کی سوچوں ونظروں کو مہکا دیتے ہیں۔

سرسید احمد خاں جو کہ اردو میں مضمون نگاری کے بانی ہیں۔ اُنھوں نے علمی، ادبی، مذہبی سیاسی، سائنسی، سماجی، نفسیاتی ہر قسم کے مضمون لکھے۔ سرسید احمد خاں ندرت وفکر وعمل کا پیکر تھے اور انہوں نے نفسیاتی و ذہنی پسماندگی کو قومی سطح پر بھانپتے ہوئے تعلیمی معیار کی ازسرِ نو تعمیر وتشکیل کرنے کے لیے جدوجہد کی اور علی گڑھ کالج کا اجرا کیا۔ ''تہذیب الاخلاق'' کے ذریعے مسلمانوں کی شعوری و لاشعوری نشوونما کی اور ان کی غفلت شعار عیش کوشی زندگی کو متحرک و باعمل کیا۔ عزم واستقلال سے مالا مال سرسید احمد خاں جرأت و بے باکی کا نمونہ تھے۔ ''تہذیب الاخلاق'' میں صداقت پر مبنی مضامین کی اشاعت کسی بھی مضمون نگار کا حوصلہ بڑھانے میں مددگار و معاون ہوا کرتی ہے۔

سرسید احمد کا دل گداز تھا۔ آنکھ میں حیاو وفا تھی اس لیے قوم کی مخالفت کو دل پر لیا، معاف کرنا اور اپنے کام میں جمے رہنا ان کا مقصدِ حیات تھا۔ سرسید کا فکرِ تجسس انہیں ایک جگہ پر ٹھہرنے نہیں دیتا تھا۔ وہ قوم کے نباض بن کر سامنے آئے اور صحافت، تعلیم، مذہب، معاشرت، اقتصادیات غرضیکہ جہاں انہیں قوم کی کمزوری سے واسطہ پڑا اس کے تدارک کے لیے لائحہ عمل تیار کرنے لگے اور اکابرینِ ادب کو بھی اس کام



میں شامل کرنے میں ذرا جھجک محسوس نہ کی۔ شعبۂ زندگی کے ہر پہلو سے آشنا ہونے کے ساتھ مکمل علم، مطالعہ اور مشاہدہ سرسید کا خاصہ تھا اور وہ اپنی قوتِ تحریر سے اپنے مقاصد کے لیے وہ راہ ہموار کرتے جو قوم کی ڈوبی نیا پار کرنے میں مددگار ثابت ہوتی۔ فکر و بصیرت قوتِ استدلال، صداقت، ندرتِ فکر، حقیقت پسندی ان کی تحریروں کا خاصہ تھی۔ سادگی کے ساتھ بے ساختگی اور بے ساختگی میں منطق و دلائل کی چاشنی ان کے مضامین کو جوہر قابل بنا دیتی اور ان کی ہمہ گیر شخصیت، ایک سحر آفرین شخصیت بن کر منظرِ عام پر نمودار ہوتی ہے۔ سرسید احمد خان پہلے باقاعدہ مضمون نگار کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں اور ان کی مضمون نگار کے حوالے سے ڈاکٹر سلیم اختر "انشائیہ کی بنیاد" میں لکھتے ہیں:

> "انہوں نے ۱۸۵۷ء کے بعد کی مخصوص سماجی اور علمی و ادبی فضا میں انگریزی ایسے کو اپنے اصلاحی مقاصد کی ترسیل کے لیے موزوں تر جانا اور یوں وہ اسے بروئے کار لائے ---- انہوں نے اپنے پرچے تہذیب الاخلاق کے ذریعے ہندوستان کے متعلق (خصوصاً اردو کی سادہ نثر کی ترویج کے معاملے میں) تقریباً ویسی ہی خدمات انجام دی ہیں جیسی انگلستان میں ایڈیسن اور اسٹیل نے سپیکٹیٹر اور ٹیلیر کے ذریعے انجام دی تھیں۔"[۷]

سرسید کی تحریروں میں تصنع و بناوٹ ہرگز نہیں نظر آتی۔ مرصع سازی سے بے نیاز یہ تحریریں دل پر اثر کرتی ہیں اور پُرتکلف، مافوق الفطرت عناصر کو سرسید یکسر فراموش کر کے ایک فی البدیہہ اور بے ساختہ اندازِ تحریر اپناتے ہیں یوں قاری کے ذہن و قلب کو فوری طور پر گرفت میں لے لیتے ہیں۔ مضمون "رسم و عادات" میں لکھتے ہیں:

> یہ بات ہم کو اپنی قوم اور اپنے ملک اور دوسری قوم کو اور دوسرے ملک دونوں کے رسم و رواج کے ساتھ برتنی چاہیے تاکہ جو رسم و عادات ہم میں بھلی ہے اس پر مستحکم رہیں اور جو رسم و عادت دوسروں میں اچھی ہے اس کو بلاتعصب اختیار کریں اور جو ان میں بری ہے اس کے اختیار کرنے سے بچتے رہیں۔"[۸]

کس قدر شستہ سادہ اور عام فہم اندازِ تحریر ہے لیکن پُرمغز اور مدلل بھی۔ یہ خاصہ سرسید کی تحریروں میں ہی ہے کہ وہ بات کو سہلِ متمنع میں کہہ کر قاری کی توجہ یکسر مضمون کی طرف مبذول کرا کے اسے اِدھر اُدھر دیکھنے کا موقع نہیں دیتے اور قاری تحریر کے سحر میں مبتلا ہو کر اپنے قلب و ذہن کو مُصفا کر جاتا ہے۔ وہ تاریخ کے اوراق پلٹ کر اپنی کمزوریوں اور کوتاہیوں سے باخبر بھی ہوتا جاتا ہے گویا دو دھاری تلوار سے سرسید

ذہن و قلب کی زنگ آلود تہوں کو مُصفا بھی کرتے ہیں اور اہتمامِ تربیت بھی کرتے ہیں۔ مضمون ''تعلیم و تربیت'' میں لکھتے ہیں:

> ''تعلیم اور تربیت کو ہم معنی سمجھنا بڑی غلطی ہے۔ بلکہ وہ جدا جدا چیزیں ہیں جو کچھ کہ انسان میں ہے اس کو باہر نکالنا انسان کو تعلیم دینا ہے اور اس کو کسی کام کے لائق کرنا اس کی تربیت کرنا ہے۔ مثلاً جو قوتیں کہ خدا تعالیٰ نے انسان میں رکھی ہیں ان کو تحریک دینا اور شگفتہ و شاداب کرنا انسان کی تعلیم ہے اور اس کو کسی بات کا مخزن اور مجمع بنانا اس کی تربیت ہے۔''[۳]

سرسید احمد نے جو مضامین لکھے مولانا اسماعیل پانی پتی نے ان کو سولہ جلدوں میں مرتب کیا۔ اُن کے مضامین میں شگفتگی و سادگی و سلاست کے ساتھ ساتھ اخلاقی و حکیمانہ اندازِ بیان بھی بدرجہ اُتم ملتا ہے۔ قوم کی بھلائی اور خیر خواہی کے لیے سرسید احمد خاں نے اسٹیل (Richard Steel) اور ایڈیسن (Joseph Addison) کے رسالوں اسپیکٹیٹر (The Spectator) اور ٹیٹلر (The Tatler) کے اندازِ بیان کو مدِنظر مضامین رکھ کر لکھے گئے ان مضامین میں جوشِ خطابت نمایاں ہے اور عقلی و منطقی دلائل سے ان مضامین کی بنیادوں کو مضبوط و مستحکم کیا ہے۔ کچھ مضامین ترجمہ ہیں اور کچھ طبع زاد۔ سرسید نے فکر و نظر تحقیق و جستجو کی راہیں متعین کرنے کے ساتھ ساتھ پروقار اور سادہ اسلوب سے اردو نثر کو مزین کیا۔ بے تکلف اور سیدھا اندازِ بیان سے اردو زبان ہر قسم کے موضوعات کو اپنے اندر سمونے کے قابل ہو گئی۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی ''سرسید اور علی گڑھ تحریک'' میں لکھتے ہیں:

> ''انہوں نے اردو زبان کو ایسی توانائی بخشی کہ وہ ملکی، سیاسی، اخلاقی، تاریخی اور فلسفیانہ غرض ہر قسم کے افکار اور مضامین کو صفائی، سادگی اور پُرتاثیر انداز میں ادا کرنے کے قابل بن گئی انہوں نے اپنے مضامین کے ذریعے مغرب کے افکار، نظریات اور شخصیات سے معاصرین کو رُوشناس کرایا۔''[۴]

سرسید کے مضمون ''امید کی خوشی'' بھی ایک بہتا ہوا دھارا ہے:

> ''اور نورانی چہرہ والے یقین کی اکلوتی خوب صورت بیٹی۔ امید یہ خدائی روشنی تیرے ہی ساتھ ہے۔ تو ہی ہمارے مصیبت کے وقتوں میں ہم کو تسلی دیتی ہے۔ تو ہی ہمارے آڑے وقتوں میں ہماری مدد کرتی ہے۔
> ---- تیری ہی برکت سے خوشی، خوشی کے لیے نام آوری، نام آوری کے لیے بہادری،

بہادری کے لیے فیاضی، فیاضی کے لیے محبت، محبت کے لیے نیکی، نیکی کے لیے .....
تیار ہے۔ انسان کی تمام خوبیاں اور ساری نیکیاں تیری ہی تابع اور تیری ہی فرماں
بردار ہیں۔"۵

سرسید احمد کے تمام مضامین ادبی مضامین کے زمرے میں نہیں آتے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے ان کے مضامین کو اپنی کتاب "سرسید اور ان کے رفقائے کار" میں مندرجہ ذیل موضوعات میں تقسیم کیا ہے:

۱۔ علمی و سائنسی مضامین
۲۔ مذہبی وفلسفیانہ مضامین
۳۔ سیاسی وملکی مضامین
۴۔ تہذیب الاخلاق کے مضامین
۵۔ ادبی مضامین

سرسید کے بعض مضامین خالص ادبی نوعیت کے ہیں اگرچہ ان میں سرسید کی "مصلح قوم" کی روح پوشیدہ ہے لیکن پھر بھی یہ مضامین ادبی نوعیت کے ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ "ملا وجہی سے عبدالحق تک" میں لکھتے ہیں:

"انگریزی ادب میں جس صنف کو "Essay" کہا جاتا ہے۔ سرسید کے سارے مضامین اس کی حد میں داخل نہیں ہوتے۔ البتہ بعض مضامین ایسے ہیں کہ جن کو آسانی سے مذکورہ بالا ادبی نوع کے دائرے میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ "تہذیب الاخلاق" کے مقالات میں سے مندرجہ ذیل مضامین ایسے ہیں جن میں اچھی مضمون نگاری کے نقوش موجود ہیں۔
تعصب، تعلیم و تربیت، کاہلی، اخلاق، ریا، مخالفت، خوشامد، بحث و تکرار، سوسائٹی، اپنی مدد آپ، سمجھ گزرا ہوا زمانہ، امید کی خوشی، رسم و رواج کے نقصانات، عورتوں کے حقوق
ان سب مضامین میں اختصار قدرِ مشترک ہے جو ایک مضمون یا "Essay" کا عمومی وصف ہے۔"۶

سرسید نے اردو نثر کو عشق و عاشقی اور روایتی اندازِ تحریر کے سحر سے باہر نکالا اور سادگی، سلاست و صفائی سے اس کو سنوارا و سجایا۔ یہی وجہ ہے کہ پیچیدہ و مشکل مسائل کو انہوں نے اپنے مضامین کے ذریعے

سادہ اظہار بیان میں احسن طریق سے یوں پیش کیا کہ حالی کے بقول دل سے نکلی بات دل پر اثر کر گئی اور قوم کی ذہنی، نفسیاتی، اخلاقی و معاشی و معاشرتی پرداخت ازسر نو ہوئی۔ مضمون ''اپنی مدد آپ'' میں سرسید احمد فرماتے ہیں:

> ''قومی ترقی مجموعہ ہے، شخصی محنت، شخصی عزت، شخصی ایمانداری، شخصی ہمدردی کا، اس طرح قومی تنزلی مجموعہ ہے شخص سستی، شخصی بے عزتی، شخصی بے ایمانی، شخصی خودغرضی کا اور شخصی برائیوں کا۔''[۷]

یہ اخلاقی و اصلاحی مضمون ہے لیکن ادق اور مشکل بات کس قدر آسانی سے کہہ دی یہ سرسید کا خاصہ ہے کہ بات سے بات نکال کر اعلیٰ مضمون پر گرفت بھی رکھتے ہیں اور قاری کی توجہ بھی نہیں ہٹتی ورنہ مقالات کی سنجیدگی، ان کی سلاست و شگفتگی کو ماند کر دیتی ہے۔ مسلمان اخلاقی طور پر رو بہ زوال تھے اور ان کی پستی و زبوں حالی ان کے اپنے اعمالِ رذیلہ کی بنا پر تھی وہ زندگی اور اس کے نشیب و فراز سے آنکھیں چراتے، آباؤ اجداد کے کارناموں پر فخر کرتے، اپنی کم ہمتی و بزدلی کو انا کی چادر میں اس طرح لپیٹتے کہ اصل منظر نامۂ زوال آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا نہ مسلمانانِ برصغیر پاک و ہند کو تنزلی کا سرا ہاتھ نہ آتا دکھائی دیتا۔ ایسے میں سرسید جیسا مردِ آہن اپنی سیاسی بصیرت کے جلو میں تنزلی و تباہی و بربادی کا جواز تلاش کر کے جدید تعلیم سے مسلمانوں کو آشنا کرتا ہے۔ ان کی کمزوریاں ان کو علی الاعلان بتاتا ہے۔ ان کی خامیوں کا ازالہ کرنے کے لیے علی گڑھ تحریک کا آغاز کرتا ہے اور ایڈیسن و اسٹیل کے رسالوں ٹیٹلر اور سپیکٹیٹر کی مانند رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' کا آغاز کر کے سماجی و معاشی و اخلاقی و دینی اصلاح کرنے میں مصروف عمل ہو جاتے ہیں اور کہیں خوشامد لکھ کر دل کی بیماریوں میں اول فوری بیماری خوشامد کو قرار دیتے ہیں کہیں بحث و تکرار کے ذریعے انسانی خباثتوں کو بے نقاب کرتے ہیں۔ کہیں تہذیب و تمدن، رسم و رواج کے ذریعے ذہنی شعور اجاگر کرتے ہیں۔ تعلیم و تربیت کو زیر بحث لا کر انسانی عادات و کردار کی تصحیح کی جاتی ہے کہیں ''گزرا ہوا زمانہ'' میں وائے ویلا مچانے والوں کو سراہا جاتا اور کہیں ''امید کی خوشی'' کو کامیابی، اعتماد اور ترقی کا سرچشمہ قرار دیا جاتا ہے۔ غرضیکہ یہ مضامین ادبی چاشنی، تازگی اور فرحت کے ساتھ ساتھ علمی بصیرت سے بھی لبریز نظر آتے ہیں اور ان کی کاٹ ذہن و قلب کو مصفا بھی کرتی ہے۔ یہ مضامین جذبہ، جوش، امنگ مسلمانوں میں ابھر کر ایک نیا تازہ ولولہ پیدا کرتے ہیں۔ اور وہ اپنی خودی اور تشخص کو پہچان کر میدان کارزار میں اخلاقی، ذہنی، معاشی، سیاسی، علمی، معاشرتی جنگ پر نکل کھڑے ہوتے ہیں اور انگریز و ہندو یلغار

کا اس طرح مقابلہ کرتے ہیں کہ "پاکستان" معرضِ وجود میں آ جانا ہے انگریز کو برصغیر پاک وہند سے چار و نا چار مجبورو بے کس ہو کر جانا پڑتا ہے اور ہندو بھی اپنی مکارانہ چالوں کے گورکھ دھندوں میں اُلجھ پڑتا ہے۔

سرسید احمد نے عوام اور خاص طور پر مسلمانوں کی ذہنی پسماندگی کو اہمیت دی اور ان کے مسائل اخلاقیہ کا حل تلاش کیا ان کے زوال کے اسباب ان کے اعمال بد اور غفلت شعاری کو گردانتے ہوئے ان کا ادب سے رشتہ (اس نئی صنف مضمون جسے انگریزی میں (Essay) "مضمون" کہتے ہیں) جوڑا اور ان کو ان کی کوتاہیوں، کمزوریوں کا سدِباب کرنے کے لیے خودشناسی کا درس دیا اس لیے ان کے مضامین طوالت کے ساتھ ساتھ سنجیدگی کا شکار بھی ہوئے اور لہجہ اسپاٹ بھی قدرے ہوا۔ ڈاکٹر انور سدید "اردو ادب کی تحریکیں" میں لکھتے ہیں:

> "سرسید نے ادیب اور اس کی تخلیق کو ہی اہمیت نہیں دی بلکہ قاری کی اساسی حیثیت کو بھی تسلیم کیا اور یوں مصنف، تخلیق اور قاری کی ایک ہم رشتہ تثلیث قائم کر دی۔ واضح رہے کہ سرسید نے مضمون کو طرزِ ادا پر فوقیت دی ہے۔"[۸]

مولانا حالی کے چوالیس مضامین یکجا کر کے دو جلدوں میں مولانا اسماعیل پانی پتی نے مجلس ترقی ادب لاہور سے شائع کیے۔ حالی نے جو مضامین، تقریریں اور تقریظیں لکھیں ان میں جلد اول میں مضامین کی فہرست کچھ یوں ہے۔ مذہبی مضامین، اصلاحی مضامین، تاریخی مضامین، سوانحی مضامین، مضامین متعلق سرسید، مضامین علی گڑھ، متفرق مضامین۔ جبکہ جلد دوم میں تقریظیں، تقریریں۔ جلد اول کے چند مضامین کا احاطہ کرنا ہے جو ادبی چاشنی کے ساتھ ساتھ علمی بصیرت بھی رکھتے ہیں۔ حالی کے مضامین ان کے اس قولِ مصدقہ سے مطابقت رکھتے ہیں کہ دل سے جو بات نکلتی ہے دل پر اثر کرتی ہے۔ سادہ و سلیس زبان میں روز مرہ محاورے کی ٹکسالی زبان سے مزین یہ مضامین واقعات و حالات کا تجزیہ کرنے کے ساتھ ساتھ ایک نئی سوچ اور نئے زاویے سے قاری کو متعارف کراتے ہیں۔ مضمون نگاری کو وسعت دینے کے ساتھ ساتھ نئے الفاظ سے بھی حالی متعارف کراتے ہیں۔ سید احتشام حسین "اردو انشائیہ" از سید صفی مرتضیٰ کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

> "تہذیب الاخلاق" کے قلمی معاونین کے علاوہ مولانا حالی، ذکاء اللہ، نذیر احمد، محمد حسین آزاد، حمید الدین سلیم سب سے سازِ زندگی کے تار تھے اور مضمون نگاری کے پہلے دور کے معمار۔ ان سب کے مضامین کی روح اصلاحِ قوم میں مضمر تھی ---- وہ امید کی طاقت قوم کے جسم میں پیدا کرنا چاہتے تھے اور ڈگمگاتے ہوئے قدموں کو

ثبات و استقلال سے جمانا چاہتے تھے ---- یہ مضمون جہاں اپنے اپنے مضمون نگاروں کا نقطہ نظر پیش کرتے ہیں وہاں اس عہد کی سماجی زندگی اور نظامِ معاشرت پر بھی روشنی ڈالتے ہیں ان مضمون نگاروں نے عام اور متعدی کمزوریوں کی تشخیص کی اور ان پر قلم اٹھایا۔"۹

"زبان گویا" میں زبان کی اہمیت اور اس کے استعمال کے مثبت و منفی پہلوؤں کی بھرپور عکاسی حالؔی کے ہاں نظر آتی ہے۔ حالؔی "زبان گویا" میں لکھتے ہیں:

"اے زبان! ہمارے بہت سے آرام اور بہت سی تکلیفیں ہمارے سینکڑوں نقصان اور ہزاروں فائدے، ہماری عزت، ہماری ذلت، ہماری نیک نامی، ہماری بدنامی، ہمارا سچ، ہمارا جھوٹ، صرف تیری ایک "ہاں" اور "نہیں" نے کروڑوں کی جانیں بچائیں اور لاکھوں کے سر کٹوائے۔"۱۰

اس مضمون کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ حالی کا مضمون "زبان گویا" ادبی چاشنی لیے ہوئے ہے۔ مضمون لکھنے والے کے لیے مضمون نگاری سادہ سلیس اور فی البدیہہ انداز بیان مہیا کرتی ہے مضمون نگار آزادی و بے تکلفی سے لکھتا چلا جاتا ہے۔ حالی کے ہاں بھی بے تکلفی کا انداز نظر آتا ہے ان کے وہ مضامین جو ادبی چاشنی و شگفتگی و تازگی اپنے اندر سموئے ہوتے ہیں ان میں بھی فی البدیہہ انداز ہے۔ حالؔی کے مضمون "زمانے کے موافق اپنا حال بناؤ" میں بے تکلفی اور آزادیٔ رائے مستحکم نظر آتے ہیں۔

"ہندوستان کی اکثر قومیں جو روز بروز اقبال مند ہوتی جاتی ہیں اور مسلمانوں کی قوم بد اقبالی کے بھنور اور ذلت کی دلدل میں کسی طرح نہیں نکلتی، اس کا سبب اس کے سوا کچھ نہیں کہ اور لوگ اپنی حالت کو زمانے کے موافق بناتے جاتے ہیں لیکن مسلمان اپنی وضع داری کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔---اس تمہید سے ناظرین کو ضرور یہ خیال ہو گا کہ ہم آگے چل کر اپنی قوم کو انگریزی پڑھنے، میز کرسی لگانے، کوٹ پتلون پہننے اور چھری کانٹے سے کھانے کی ترغیب دیں گے، کیونکہ ظاہراً زمانہ حال کا مقتضا یہی ہے مگر ان کو یاد رہے کہ ہماری مراد اس تمہید سے یہ ہرگز نہیں ہے بلکہ ہم کہتے ہیں کہ اس راہ کو اختیار کریں اور جس طرح ہو سکے اپنا قدم آگے بڑھائیں کیونکہ زمانہ بہ آوازِ بلند کہہ رہا ہے "من استوىٰ یو ماہ فھو مغبون۔"۱۱

ڈاکٹر عبدالقیوم، حالی کی نثر کے حوالے سے ان کے اسلوب کو سرسید کے زیر اثر لکھا جانے والا اسلوب گردانتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"حالی کی تصانیف میں ایک کلاسیکی ضبط و نظم بہ الفاظ دیگر رکھ رکھاؤ اور انتہائی سنجیدگی نمایاں ہے، حالی کے یہاں سرسید کے اسلوب کی بیشتر خصوصیات پائی جاتی ہیں بلکہ بعض لحاظ سے ان کی نثر کو سرسید کی نثر کی ترقی یافتہ شکل کہا جا سکتا ہے۔"[۱۲]

مولانا الطاف حسین حالی کا مضمون "ہم جیتے ہیں یا مر گئے؟" میں سرسید کا رنگ ملاحظہ ہو:

"الغرض کیا پرانے خیال والے اور کیا نئے خیال والے، دونوں عموماً سعی و کوشش کو عبث اور رائیگاں خیال کرتے ہیں۔ پہلے اس لیے کہ ترقی ضروری نہیں اور پچھلے اس لیے کہ ترقی ممکن نہیں۔ اس طرح ہمارے بعضے گروہ کچھ نہیں کر سکتے اور بعضے کچھ کرتے ہیں اور یہ بہت بڑا ثبوت اس بات کا ہے کہ ہماری قوم میں عملی قوت باقی نہیں رہی۔"[۱۳]

اردو مضمون نگاری کو "تہذیب الاخلاق" نے بہت نکھار بخشا ہے اور اردو کے دامن کو علمی، مذہبی، اصلاحی، تاریخی، ادبی، سائنسی نکتہ نظر سے وسیع سے وسیع تر کیا۔ زبان کو مرصع ساز کرداروں کے جھرمٹ سے نکال کر فطری اور پُرخلوص وہ لہجہ عطا کیا کہ جس نے برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کی تقدیر بدل دی اور انہیں "اظہار و ابلاغ" کے جدید اور نئے طریقے عطا کیے۔ حالی کے مضامین کا مقصدِ اولیٰ اصلاحِ قوم تھا۔ مولانا محمد اسماعیل پانی پتی لکھتے ہیں:

"اگرچہ ان مضامین کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ان غلط افکار و نظریات کی تردید تھا جو مسلمانوں میں رواج پا چکے تھے لیکن ان میں روایتی وعظ و نصیحت کا رنگ کہیں نظر نہیں آتا۔ ہر بات علمی انداز میں اس دردمندی اور دل سوزی سے کہی گئی ہے کہ دل میں اترتی چلی جاتی ہے۔"[۱۴]

مولانا حالی کے مضامین شگفتگی سے اگرچہ عاری نہیں لیکن ان کے لب و لہجہ میں وہ چاشنی نہیں جو کسی بھی مضمون کا خاصہ ہوا کرتی ہے۔ حالی کے مضامین چونکہ اصلاحی نقطۂ نظر کے پیشِ نظر لکھے گئے تھے اس لئے ان میں دلائل و منطق میں بات کہی گئی ہے لیکن عقل و وجدان کا ملا جُلا یہ رجحان قاری کے لیے نہ صرف قابلِ قبول ہے بلکہ اس کی ذہنی پرداخت بھی کرتا ہے۔ حالی نے مضمون "حسب و نسب" کو پُرمغز اور مدلل خیالات پر ختم کیا ہے:

"اکثر لوگ اس خیال سے کہ ہمارے بعد ہماری اولاد عزت و آبرو سے دنیا میں زندگی بسر کرے، اس کے واسطے جائیداد خرید کر چھوڑ جاتے ہیں، مگر ان کی تعلیم و

تربیت کا کچھ خیال نہیں، گویا وہ چاہتے ہیں کہ ہماری اولاد صرف نالائق ہی نہ رہے
بلکہ بدچلنی میں بھی شہرہ آفاق ہو۔ جہل اور جوانی اور اس کے ساتھ بے فکری، جہاں
یہ تینوں چیزیں جمع ہو گئیں، پھر خاندان کا اللہ ہی مالک ہے۔"۱۵

حالی کے مضامین کی ترتیب و نظم پر غور کیا جائے تو اکثر مضامین بے جھول اور بوجھل نہیں بلکہ چند مضامین ان کثافتوں اور آلائشوں سے پاک نہ رہ سکے۔ مثلاً حسب و نسب، ہم جیتے ہیں یا مر گئے، زبان گویا، زمانے کے موافق اپنا حال بناؤ، جبکہ مزاح، بدگمانی، کیا مسلمان ترقی کر سکتے ہیں، دنیا کی کل علم سے چلتی ہے یا عمل سے وغیرہ کی مثال دی جا سکتی ہے۔ ڈاکٹر انور سدید اپنی کتاب "اردو ادب کی تحریکیں" میں حالی کے موضوعات کے حوالے سے یوں رائے دیتے ہیں:

"حالی کے ہاں تشبیہ اور استعارے کی شیرینی کم ہے۔ تاہم وہ موضوع کا فکری
زاویہ ابھارتے ہیں اور قاری ان کے دلائل میں کھو جاتا ہے۔"۱۶

مضمون "بیانِ حالی" اپنے حالات و واقعات پر حالی کا لکھا گیا یہ مضمون دلکش، مدلل اور بے جھول ہونے کے ساتھ ساتھ قاری کو جادوئی انداز میں اسلوبِ بیان کے نیچرل اور سادہ ہونے کی بنا پر اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب رہا ہے۔ ملاحظہ ہو ایک نمونہ:

"پانی پت میں جو اب تک ایک محلہ انصاریوں کا مشہور ہے۔ وہ انہیں بزرگ کی
اولاد سے منسوب ہے۔ میں باپ کی طرف سے اسی شاخ سے علاقہ رکھتا ہوں اور
میری والدہ سادات کے ایک معزز گھرانے کی، جو یہاں "سادات شہدا پور" کے نام
سے مشہور ہیں، بیٹی تھیں۔"۱۷

سہل ممتنع میں لکھا گیا یہ مختصر پیرا گراف کس قدر سحر انگیز ہے۔ روانی، سلاست، دلنشینی اور بیان کی عمدگی نے مضمون کے حسن کو دوبالا کر دیا ہے۔ مسلمانوں کی زبوں حالی پسماندگی اور ناقص تعلیم و تربیت کے احساس نے حالی کو دلگیر کر رکھا تھا۔ وہ اپنے مضامین میں ایک نڈر، بے باک اور مضطرب شخص بن کر ابھرتے ہیں۔ اس لیے ان کے مضامین کا کڑوا کسیلا پن ان کے سادہ سلیس اسلوب میں بھی اپنا چہرہ چھپا نہیں سکا اور اس کی بے نقابی نشتر بن کر دل میں اتر جاتی ہے۔ لیکن وہ ایسا نشتر ہے جو گھاؤ کو ٹھیک کرنے سے پہلے لگانا ضروری سمجھا جاتا ہے تا کہ تمام مفسد مادہ خارج ہو کر گھاؤ کے بھرنے میں آسانی ہو۔ مصلحِ قوم حالی کا یہ انداز اس دورِ ابتلا کی ضرورت تھا اسی لیے مضمون نگاری کے عمل میں کھپ بھی گیا۔ مولانا حالی کے ہاں

مضمون نگاری انسان اور زندگی کے باہمی ربط کے درمیان گھومتی ہے۔ اسی لیے ان کے مضامین میں عدم تکمیل کا احساس قاری کو تذبذب میں نہیں ڈالتا اور میں تو یہاں تک کہوں گی کہ نفسِ مضمون میں عدم تکمیل کی پردہ پوشی نظر آتی ہے اور حالی کی یہ ہی خصوصیت ان کو مقبول و معروف کرتی دکھائی دیتی ہے۔ ڈاکٹر طیبہ خاتون ''اردو میں ادبی نثر کی تاریخ ۱۹۵۷ء تا ۱۹۱۴ء'' میں حالی کی مضمون نگاری کے حوالے سے لکھتی ہیں:

> ''مضامین حالی میں ''زمانہ'' ''الدین یُسر''، ''مسلمانوں کی تعلیم'' وغیرہ اچھے مضمون ہیں۔ لیکن ان کے یہاں بھی طویل مضامین کی تعداد زیادہ ہے جو مقالے کے ضمن میں آتے ہیں۔ البتہ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس صنف کے ارتقا کے لیے انہوں نے اور شبلی نے راہیں ضرور استوار کیں۔''[۱۸]

حالی مضمون نگاری کی بنیادوں کو استوار کرنے والے افراد میں شمار ہوتے ہیں اور مصلح قوم ہونے کی حیثیت سے ان کے مضامین میں اصلاحی رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔ سرسید کی عقلیت و مادیت کے اثرات کے زیرِ اثر حالی کی مقالہ نگاری اور مضمون نگاری اپنا رنگ جماتی نظر آتی ہے اور سید ظہیر الدین مدنی ''اردو لیسز'' میں لکھتے ہیں:

> ''حالی نے ''تہذیب الاخلاق'' رسالہ میں جو مضمون لکھے ان میں اصلاحی، علمی، ثقافتی، اخلاقی رنگ نظر آتا ہے اور یہ مضامین اپنے دور میں آغازِ مضمون نویسی کے اہم ستون ہیں۔''

پروفیسر خلیق احمد نظامی ''سرسید اور علی گڑھ تحریک'' میں کہتے ہیں:

> ''حالی اگرچہ سرسید ہی کے توسط سے اپنے دور کے بیشتر مسائل سے روشناس ہوئے لیکن ان مسائل پر وہ اپنی رائے بھی رکھتے تھے اور عام طور پر سرسید کے نقطۂ نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔''[۱۹]

مولوی ذکاء اللہ کے مضامین کے حوالے سے مبادی الانشاء حصہ چہارم تک میری رسائی ہوئی ہے اور جسے مطبع مجتبائی دہلی سے دوبارہ صحیح کرا کے ۱۹۰۰ء میں شائع کیا تھا۔ اس کے کل مضامین کی تعداد چوالیس ہے۔ اور جن میں سے چند مضامین کا ہم احاطہ کریں گے تا کہ مولوی صاحب کے ذہن تک رسائی حاصل کر سکیں۔ مولوی صاحب نے دہلی کالج کے ساتھ ساتھ سرسید احمد خاں کی تعلیمی تحریک میں بھی جوش و خروش سے حصہ لیا۔ مولوی صاحب کی تحریروں میں خلوص، دیانت، علمی فکر کے ساتھ ساتھ رچی بسی ہوئی ہے۔ دیانت

داری کے حوالے سے ''مبادی الانشاء'' حصہ چہارم میں مولوی صاحب لکھتے ہیں:

''دیانت داری دنیا میں ایسی کم ہے کہ دس ہزار آدمیوں میں ایک بھی ڈھونڈو نہیں ملتا ----- دیانت داری ایسی آواز ہے کہ کہیں اس کی گونج سنائی نہیں دیتی۔ بادشاہوں کے درباروں میں وہ گوش زد نہیں ہوتی۔ تجارت کے بازاروں میں بھی کانوں میں اس کی بھنک نہیں پڑتی۔ کونسلوں میں کہیں وہ کان میں نہیں آتا۔

دنیا میں جو چیز سزاوار ہے وہ دیانت ہے اور جو دیانت ہے وہ سزاوار ہے۔ دیانت کے ساتھ حسانت ہو تو پھر کیا کہنا۔ شہد و قند دونوں موجود، دیانت دار آدمی اکثر بھولے بھالے ہوتے ہیں اسی لئے ان کا نقصان ہو جاتا ہے۔''[۲۰]

اُردو زبان جو ثقیل تھی اُسے مصفا کرنے اور سہل نگاری کی طرف مائل کرنے کے ساتھ ساتھ ابتذال و پھکوپن سے عاری کرنے میں بھی مولوی ذکاء اللہ کی معاونت اہم سنگ میل ثابت ہوئی۔ مولوی صاحب کو دہلی کالج کے مقابلے کے ماحول نے مضمون نگاری کی طرف راغب کیا۔ انعام و اکرام نے ان کی مضمون نگاری کو وہ روانی بخشی جس نے ادبی مضامین لکھوائے اور ڈاکٹر رفعت جمال ''ذکاء اللہ حیات اور ان کے علمی و ادبی کارنامے'' میں رقم کرتی ہیں:

''اس دور کے تقریباً ہر معیاری رسالے میں ان کے مضامین شائع ہوتے تھے۔ خاص طور سے رسالہ حسن سائنٹفک گزٹ، ادیب، معارف، مخزن، زمانہ، عصر جدید، زبان، تہذیب الاخلاق، خاتون، علی گڑھ منتھلی، عصمت، عصرِ جدید، نظام المشائخ، اکمل الاخبار اور دہلی سوسائٹی وغیرہ اخبارات و رسائل میں خوب لکھا۔ ان کے شائع کنندہ مضامین کی تعداد خاصی ہے اگر ان کو یکجا کیا جائے تو کئی ضخیم جلدیں تیار ہو سکتی ہیں۔ ذکاء اللہ غضب کے لکھنے والے تھے۔''[۲۱]

مولوی ذکاء اللہ مغلیہ سلطنت کے زوال کے جلو میں مسلمانوں کے اخلاقی، سماجی، تمدنی، انتشار کو محسوس کر سکتے تھے۔ اس لیے ادب برائے ادب کی جگہ وہ ادب برائے زندگی کے قائل تھے اور اس متحرک زندگی کے حسنِ قبیح کو اپنے مضامین کا موضوع بناتے اور اصلاحِ کار بن کر اُبھرتے ہیں۔ اس کتاب میں ڈاکٹر رفعت جمال آگے چل کر لکھتی ہیں:

''بخشی ذکاء اللہ کے مضامین میں قومی دلسوزی انسان دوستی اور وطن پرستی کے جذبات ملتے ہیں۔ اور اصلاح پسندی کا احساس بھی جلوہ گر ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ

تہذیبی اور سماجی ترقی کے لیے انہوں نے اجتماعی زندگی کے ان عناصر و عوامل کا پتہ لگا لیا تھا جن سے اصلاح ممکن تھی۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ تمدنی زندگی کی نشوونما کے لیے اخلاقی اقدار کی بہت ضرورت ہے۔"۲۲

مولوی صاحب کے مضمون "ذہانت بغیر علم کے بیکار ہے" کا یہ نثر پارہ فہم و ادراک سے لبریز کئی ذہنوں کی کئی جہتیں کھولتا ہے:

"جب اپنی لیاقت کی نخوست دماغ میں سما جاتی ہے تو کاہلی اور غفلت اپنے افسانے سنا کے ہم کو خوب سُلاتی ہے اور اس نیند میں ہم متواتر اپنی برتری اور خوبیوں کے خوب خواب دیکھتے ہیں۔"۲۳

ان کے مضامین میں تخیلی پہلو بھی ملتے ہیں اور سید صفی مرتضیٰ "اردو انشائیہ" میں لکھتے ہیں:

"ادبی مضامین بھی لکھے بعض تخلیقی اور خود ان کی کاوش فکر کا نتیجہ ہیں اور بعض انگریزی مضامین کے ترجمے ہیں۔ موضوع کے لحاظ سے یہ مضامین اصلاحی بھی ہیں اور تخیلی بھی۔"۲۴

مولوی ذکاء اللہ کے جو مضامین ادبی تمکنت کے حامل ہیں ان کے بارے میں آدم شیخ "انشائیہ" میں لکھتے ہیں:

"سرسید احمد خاں، الطاف حسین حالی اور ذکاء اللہ وغیرہ نے قدیم اور جدید نثر کے درمیان "گریز" کا پارٹ ادا کیا۔"۲۵

مولوی ذکاء اللہ کے مضامین میں علمیت کا فقدان نہیں اور انگریزی الفاظ کے مناسب رچاؤ نے ان مضامین کو جدید مضمون نگاری کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔ فکر انگیزی کی دلیل ان کے مضامین کو قاری سے یوں وابستہ کرتی ہے کہ قاری خود ساختہ دنیاؤں کے خوش فہم خوابوں سے یک جست باہر نکل آتا ہے۔ ڈاکٹر سمیع اللہ لکھتے ہیں:

"مضمون نگاری میں ذکاء اللہ کو خاص ملکہ حاصل تھا ان کے زمانے کے ایڈیٹران کے مضامین و مقالات اپنے جرائد میں اشاعت کی غرض سے حاصل کرنے میں متمنی رہتے تھے۔ مختلف النوع موضوعات پر ان کے یہ بہ کثرت مضمون معاصر رسالوں میں شائع ہوئے۔ تہذیب الاخلاق، علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، مخزن، لاہور) زمانہ کانپور، رسالہ حسن حیدرآباد، شمس مکتبہ، صبح بہار میسور اور "خاتون وادیب" فیروز آباد تو خاص طور سے ان کے اشحات قلم سے فیض یاب ہوتے رہے۔ کچھ مضمون انہوں نے

انگریزی کتابوں کی مدد سے لکھے لیکن اکثر و بیشتر مضامین طبع زاد ہوتے۔ جو زمانے
کے ماحول و مزاج سے مطابقت رکھتے تھے ....."[۲۶]

نواب محسن الملک کے مذہبی، علمی، ادبی مضامین جو "تہذیب الاخلاق" کے ابتدائی پرچوں میں لکھے گئے، انہیں ملک فضل الدین کے زئی تاجر کتب قومی منزل نفش بندیہ، کوچہ ککے زیاں، بازار کشمیری لاہور نے مطبع کریمی لاہور سے غالباً ۱۹۱۴ء میں شائع کیا۔ یہ بارِ چہارم مجلد ہے۔ ڈاکٹر عبید اللہ خان "تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان" میں لکھتے ہیں:

"محسن الملک کی ادبی زندگی مختلف شکلوں میں سامنے آتی ہے۔ سرسید سے تعلق کی
وجہ سے انہوں نے "تہذیب الاخلاق" میں سلسلۂ مضامین شروع کیا۔ ۳۰ مضامین کا
ایک مجموعہ ملک الدین صاحب نے ترتیب دے کر انڈین اسٹیم پریس لاہور سے
شائع کرایا تھا۔ اس مجموعہ میں مختلف موضوعات پر مضامین ملتے ہیں جن سے ان
کی اسلام دوستی، ملی دردمندی اور علوم وفنون سے گہرے شغف کا پتہ چلتا ہے۔"[۲۷]

جلد اول میں کل ۲۶ (چھبیس) مضامین ملتے ہیں۔ جبکہ اس میں (۳۰) مضامین ہیں۔ باقی خطوط ہیں۔ ہم نے ان میں سے وہ مضامین چُنے ہیں جو ادبی و علمی لبادے میں ملبوس ہیں۔ نواب محسن الملک کے مضامین میں تمثیل کا انداز نظر آتا ہے لیکن ان کے علمی مضامین متانت و سنجیدگی کے ساتھ ساتھ موضوع پر گرفت بھی رکھے ہوئے ہیں۔ سرسید احمد خان کی رفاقت نے ان کے طرزِ تحریر پر بھی اثر ڈالا ہے اور ان کے ہاں بھی منطقی اور استدلالی اندازِ فکر ملتا ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ "سرسید اور ان کے رفقائے کار میں سرسید کے محسن الملک پر اثرات کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"محسن الملک کی کتابیں بہت بلند درجے کی نہیں اور مضامین میں کوئی جدید خیال
موجود نہیں۔ البتہ "تہذیب الاخلاق" کے مضامین میں بڑا زور دار جوش ہے۔ محسن
الملک دراصل سرسید صاحب کے ترجمان تھے اور بہت سے مسائل میں انہیں کی
پیروی کرتے تھے۔"[۲۸]

مضمون "قومی عزت" میں نواب محسن الملک لکھتے ہیں:

"ہماری حالت موجود عزت و ذلت کے باعث ہے۔ اسی لیے ہم کو اپنی حالت
موجودہ پر نظر کرنی چاہیے کہ آیا آج ہم کو ملکی فخر اور قومی عزت حاصل ہے یا نہیں۔
چنانچہ اس امر کے لیے ہمیں اپنی ملکی اور قومی تعلیم پر لحاظ کرنا چاہیے کیونکہ علم ہی

> عزت اور ذلت کی کسوٹی ہے۔ پس اگر ہماری تعلیم آج کل اور قوموں سے بہتر ہو اور دنیا کے ملکوں کے رہنے والے ہمارے علوم کی قدر و قیمت کی منزلت کرتے ہوں اور ہمارے ملک سے علوم و فنون کی تحصیل کرتے ہوں تو بے شک ہم کو ملکی فخر اور قومی عزت حاصل ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو ملکی فخر اور قومی عزت کا ہم کو نام لینا بھی زیبا نہیں۔"[۲۹]

مضمون موضوع کے لحاظ سے متعین ہونے کے باوجود دقیق نہیں ہے اور مسلمانانِ برصغیر پاک و ہند کی اخلاقی و علمی کمزوری کی نشاندہی کرتا ہے۔ ڈاکٹر عبید اللہ خان تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند میں اپنے مضمون "دوسرے مصنفین" میں لکھتے ہیں:

> "محسن الملک کے ان مضامین کے مطالعے کے بعد ان کی ادبی حیثیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کے مضامین میں جو انہوں نے مذہبی، اخلاقی، تعلیمی، تاریخی اور اصلاحی مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔ جن میں ان کا خاص ادبی رنگ جھلکتا ہے اور قدم قدم پر ان کا جوش اور خلوص ان تحریروں میں نظر آتا ہے۔"[۳۰]

ڈاکٹر سید عبداللہ نے اپنی کتاب "سرسید اور ان کے رفقائے کار" میں محسن الملک کے مضامین کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے(۱) علمی و فکری مضامین (۲) علمی و ادبی مضامین۔ سید عبداللہ نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ محسن الملک کے طرزِ بیان میں ادیبانہ زندگی ہر جگہ موجود ہے یہاں تک کہ ان کی عقلی تحریروں میں ادبی چاشنی موجود ہے۔ قومی اصلاح کی تشکیل اور قومی شعور کی تربیت کے لیے محسن الملک کے مضامین مسیحائی کا کام کرتے ہیں۔ محسن الملک کا انداز معروضی، مدلل ہے۔ مضامین میں ربط و توازن بھی ہے اور ان کے مضامین بھی اصلاحی اور مقصدی ہیں۔ ان مضامین میں اختصار کے ساتھ ساتھ سنجیدگی بھی شامل ہے لیکن شگفتگی اور نکھار بھی میں بدرجہ اُتم موجود ہے اور ادبی چاشنی کا ذکر تو ہم پہلے ہی کر چکے ہیں۔ بیسویں صدی کے آغاز میں جو لوگ مضمون نگاری کو مضبوط بنیاد فراہم کرتے ہیں ان میں مہدی افادی کا نام بھی سرِفہرست ہے۔ ان کے مضامین کا مجموعہ "افاداتِ مہدی" کے نام سے ان کی بیگم، بیگم مہدی حسن نے سرسید بک ڈپو علی گڑھ سے بار اول ۱۹۵۸ء میں شائع کرایا۔ اس کا دیباچہ مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے لکھا ہے اور اس کے کل ۳۲ مضمون مہدی افادی صاحب کے لکھے ہوئے ہیں اور "اردو کے ایک نامور ادیب کی موت" مولانا عبدالماجد دریا آبادی کا لکھا ہوا ہے اور اس کے مقامات تاریخ رحلت نواب سید جعفر علی صاحب نے لکھے

ہیں۔ان تعریفوں کے حوالے سے اگر مہدی افادی کے مضامین کا جائزہ لیں تو ان کے مضامین میں شگفتگی بھی ہے غور وفکر کے ساتھ ساتھ آزادیٔ رائے کا بھی بھرپور احساس ملتا ہے۔ اختصار ان کے مضمون نگاری خاص وصف ہے اور احساسات و جذبات جب تخیلی رنگ میں ڈھلتا ہے تو زندگی کے گونا گوں مظاہر سے وہ تصاویر اپنے لفظوں میں مقید کرتا ہے۔افادات مہدی میں ''ترکوں کی معاشرت'' میں لکھتے ہیں:

> ''ہرقوم کے لیے ہر زمانہ میں اس کی عقلی حالت کے مناسب خاص خاص اخلاق و عادات ہوتے ہیں جو ملکی آب و ہوا، باہمی میل جول، مذہبی عقائد، لٹریری خیالات، علمی اختراعات اور سیاسی نظامات کے تحت میں آہستہ آہستہ اور بتدریج بدلتے رہتے ہیں اور جس قدر اخلاق و عادات پر ان کا اثر پڑتا ہے موجودہ زمانے ارتقاء عقلی کا دور ہے۔صدیوں کے زنگ ایک دم نہ سہی رفتہ رفتہ چھوٹیں گے۔''[۳۳]

اردو میں مضمون نگاری کی صنف جدید ہے اور اس سے اردو کو متعارف کرانے والے سرسید احمد خان ہیں۔ان کی پھیلائی ہوئی علمی روشنی میں مہدی افادی نے اپنے لیے ایک واضح راہ متعین کی۔ اگرچہ مہدی افادی پیشہ ور مضمون نگار نہیں تھے۔کل ۳۱ مضامین میں تنقید و ترجمہ بھی شامل ہے۔ان کے مضامین خلوص سے لکھے گئے ہیں۔اسی لیے ان میں درشتی اور تلخی نظر نہیں آتی بلکہ علم وفکر کے موتی ان مضامین میں بکھرے نظر آتے ہیں۔مضمون نگاری کا اردو میں آغاز انگریزی سے ہوا۔انگریزی مضمون کو ایسے لکھتے ہیں اور مہدی افادی کے مضامین میں شوخی کے ساتھ ساتھ ترتیب ونظم بھی موجود ہے۔ان کے مضامین اختصار کے وصف سے عاری نہیں ہیں، خاص موضوع کی قید نہیں ہے اور نہ ہی تاثراتی رنگ ان کے مضامین میں جھلکتا ہے۔ بلکہ ادبیت کی شان ان کے مضامین کو وہ نکھار بخشتی ہے جو اردو کی ترقی ونشوونما میں بھی حصہ لیتا ہے۔اپنے مضمون ''علامہ شبلی کا ماہوار علمی رسالہ'' میں مہدی افادی کی رائے ملاحظہ ہو:

> ''مختصر یہ کہ آج کل کے مصنفین میں علامہ شبلی کو ایک خاص امتیازی فوقیت حاصل ہے جو ان کے اور ہمعصروں کے حصہ میں نہیں آیا۔ ان کے سخت سے سخت حریف مقابل بھی ان کی تحقیقات کی گرد کو نہیں پہنچے۔''[۳۴]

فی زمانہ انقلابات وتغیرات نے ادیبوں کو بھی موضوع میں جدت عطا کی اور مہدی افادی کے مضامین میں بھی اس دور کے جدید موضوعات کی بازگشت سنائی دی جاتی ہے۔''شعرالعجم پر ایک فلسفیانہ نظر'' ہو یا ''پروفیسر براؤن اور ایرانی لٹریچر کا دورِ جدید''، ان کا ذہن اپنی جولانیاں دکھاتا نظر آتا ہے۔''تنقیداتِ

عالیہ" مضمون میں مہدی افادی انگریزی اخبار "کامریڈ" پر ناقدانہ نظر ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "کامریڈ نے دو طرفہ کشمکش سے علیحدہ ہو کر جو مستقل روش اختیار کی ہے وہ دراصل اس کے ادبیات میں داخل ہونے کے لائق ہے۔اس کی تنقیدات خاص کر طنزیات لٹریچر کی جان ہوتی ہیں۔ یہ تو معلوم ہے کہ ایڈیٹر انگریز نہیں ہے لیکن سمجھ میں نہیں آتا عربوں کی اصطلاح میں ایک" عجمی "زبانِ غیر پر کیونکر اس حد تک قادر ہو گا۔"[۳۳]

دلائل سے پُر، یہ پیراگراف اپنے اندر ایڈیٹر اور اخبار "کامریڈ" کا مکمل احاطہ کرتا ہے اور اختصار سے لکھا گیا یہ مضمون جامع بھی ہے اور تاریخی ادبی اہمیت رکھتا ہے۔ مضامین افادی کا اندازِ تحریر مغربی ہے اور فلسفیانہ جمال رکھتے ہیں اور اخلاق کے سوتے بھی ان کے مضامین کا خاصہ تھے۔ خوش مزاجی اور بذلہ سنجی بھی ان کے مضامین میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اور یہ خوش مزاجی اور بذلہ سنجی ان کے مضامین میں شامل ہے۔ باقاعدہ مضمون نگاری اگرچہ آپ نے نہیں کی لیکن جو بھی مضامین ۲۰ سالہ دور میں لکھے ان میں مہدی کی غیر معمولی لیاقت کا ثبوت ملتا ہے اور یہ لیاقت قاری کے دل پر بھی اثر کرتی ہے کیونکہ اس کا متناسب اور متوازن استعمال بھی وہ گوہر یکتا ہے جو مشکل سے ہی ہاتھ آتا ہے۔ مہدی افادی اپنے مضمون "ملک میں تاریخ کا معلم اول" میں لکھتے ہیں:

> "تاریخِ اسلامی کی نسبت ایک زمانہ میں یورپ نے جس قدر متعصبانہ رائے قائم کی تھی، اب رفتہ رفتہ ان سے دست بردار ہوتا جاتا ہے۔موجودہ دور میں جو ہر قسم کی دماغی ترقیات کا دور ہے۔ واقعات کا ایک خاص معیار صداقت قائم ہو گیا ہے۔ ہر واقعہ کی جانچ اجتماعی، اخلاقی اور فلسفیانہ حیثیت سے کی جاتی ہے۔ چنانچہ علمائے مستشرقین کی توجہ سے جدید سلسلۂ انکشافات میں ایک نیا لٹریچر پیدا ہو گیا ہے جس میں ہمدردانہ التفات کے ساتھ ایک طرح کی سنجیدگی اور بلند نظری پائی جاتی ہے۔"[۳۴]

اردو مضمون نگاری کا آغاز دو قوموں یعنی ہندو اور مسلمانوں کے دورِ زوال سے شروع ہوتا ہے اور ایسے دور میں اصلاحی و اخلاقی مضامین نے لوگوں کو غور و فکر کرنے پر آمادہ کر دیا۔ میر ناصر علی نے باقاعدہ کوئی کتاب تو نہیں لکھی۔ لیکن صلائے عام، تیرھویں صدی، زمانہ اور دیگر رسائل میں آپ نے جو مضامین لکھے انہیں میر ناصر علی کے پوتے سید انصار علی صاحب نے مرتب کر کے ہمارے سامنے "مقاماتِ ناصری"

کی صورت میں پیش کیا۔اس میں مضامین کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

☆ پہلا حصہ ''تیرھویں صدی'' کے مضامین کا انتخاب ہے۔ پہلے حصہ میں (۱۴) مضامین ہیں۔

☆ دوسرا حصہ ''زمانہ''، ''افسانہ ایام'' و ناصری سے انتخاب دوسرا حصہ ہے۔ ۶ مضامین ہیں۔

☆ تیسرا حصہ ''صلائے عام''، ۱۹۰۸ء تا ۱۹۱۱ء کا انتخاب ہے۔تیسرے حصے میں ۵۵ مضامین ہیں۔

ان مضامین کا اجتماعی جائزہ ناصر علی کی مضمون نگاری کے حوالے سے کریں گے۔

واقعی مضمون نگار جس بے تکلفی کا مستحق ہے وہ مضمون نگاری کی حسنِ ادا ہے تبھی پتا چلتا ہے کہ میر ناصر علی کے مضامین اپنی بے ساختگی، بے تکلفی کے ساتھ ساتھ رواں دواں اسلوب کی جلو میں قاری کو ہر ''رازِ نہاں خانہ'' سے شناسائی دینے کے ساتھ ساتھ قربت بھی مہیا کرتے ہیں اور دل گدازی و ہمدردی کے ہمراہ قاری علمیت و بصیرت کے موتیوں سے جھولی بھرتا ہے کیونکہ میر ناصر علی کے مضامین محسوسات کی یلغار سے اجنبیت کی دیوار گرانے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ ''مسکرانا'' کا نمونہ نثر پارہ ملاحظہ ہو:

> ''مسکرانا چہرے کا زیور ہے۔ چہرے کی شکنیں جو رنج میں پیدا ہو جاتی ہیں۔ مسکرانے سے مٹ جاتی ہیں۔ شقاوت و سختی جاتی رہتی ہے۔اس لیے پریوں فرشتوں اور اولیاء اللہ کی تصویریں اکثر مسکراتی ہوئی دیکھنے میں آتی ہیں کہ مسکرانا اطمینانِ باطن کی علامت ہے۔جلاد خونی اور قصاب کے چہرے کبھی مسکراتے نہیں۔ دیکھیے مسکرانے سے بدشکل بھی اچھا معلوم ہوتا ہے اور خوبصورت تو پری زاد بن جاتا ہے۔ مسکرانا تعلیم و تلقین کے بغیر جاہل سے جاہل آدمی کی سمجھ میں آجاتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے آنکھ سے دل میں اُتر جاتا ہے۔''۳۵

لطیف مضمون ایک اسٹرکچر ہے جس میں زندگی کے نئے نئے پہلو روشن ہوتے ہیں اور موضوعات کا تنوع اس کی زمین کو بنجر پن سے روکتا ہے اور خود رو گھاس کی مانند یہ موضوعات ادب میں خود اپنے لیے جگہ بناتے ہیں اور ادب و سماج کا ایسا رشتہ جوڑتے ہیں کہ جس میں فلسفیانہ گتھیوں کو بھی بڑے پیار سے ہلکے پھلکے انداز میں اس طرح حل کیا جاتا ہے کہ لفظوں کے آبگینے ٹوٹ پھوٹ کا شکار بھی نہ ہوں اور بات بھی دل پر اثر کرے۔میر ناصر علی کے مضامین کا یہی خاص وصف ہے کہ خیال کا انوکھا پن لفظوں کی چاشنی میں گھل مل جاتا ہے اور قاری کے ذہنی کینوس کو وسیع سے وسیع تر کر دیتا ہے، بات سے بات نکلتی ہے اور روح و دل کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔انصار ناصری اپنے مضمون ''میر ناصر علی'' میں اپنی رائے کا یوں اظہار کرتے ہیں:

"عمر بھر مختلف فلسفیانہ، محققانہ اور شاعرانہ قسم کے سینکڑوں مضامین لکھتے رہے جو ان ہی کے مختلف رسائل میں شائع ہوتے رہے۔ ہزاروں صفحات پر مشتمل یہ گراں قدر مضامین اپنی مخصوص نازک خیالی اور پاکیزہ بیان کے باعث اردو ادب میں کلاسکس کا درجہ رکھتے ہیں کہ ان جیسا اسلوبِ بیان، اسٹائل اردو ادب میں اپنی نوع کا پہلا اور آخری تھا۔"۳۶

ان کے مضامین میں "مضمون "پریشان" کی لفریبی قاری کو چونکا دیتی ہے اور وہ حسنِ پریشان کے اندازِ بیان سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ علم و بیان کے مزے بھی لیتا ہے۔ مضمون پریشان کا نمونہ ملاحظہ ہو:

"آج مجھے صلائے عام کے لیے مضمون کی تلاش تھی۔ خیال ہوا کہ مضمونِ پریشان لکھ ڈالیے جس کی تمہید میں عرض ہے۔

مے رحم از فکر سر زلفِ پریشان است باز
درمیان معنی و لفظم بیابان است باز

اس طرز کے مضمون میں آشفتہ مزاجوں کی طرح سلسلہ و ربط مشکل سے سمجھ آتا ہے لیکن ایک وضع کا سامان کتنا ہی جدا جدا کیوں نہ ہو یکجا کر دینے سے بسانِ لچ گدیاں خاص دلکش صورت پیدا کر دیتا ہے جس سے بوئے نفس آنے لگتی ہے۔"۳۷

میر ناصر علی کے ہاں ہمیں مغربی اندازِ تحریر نظر آتا ہے اور ان کی "مضمونِ پریشاں" کے نام سے جو تحریر ملتی ہے وہ بھی انگریزی کی پروردہ نظر آتی ہیں لیکن مجھے یہ مضامین دلکش و لفریب لگنے کے ساتھ ساتھ فکر کی جولانیاں بکھیرتے نظر آتے ہیں۔ میر ناصر علی کے مضامین کی کشادگی اور اختصار ان کا حسن ہے۔ ان کا انداز ہلکا پھلکا ہے۔ شاہد احمد دہلوی لکھتے ہیں:

"خاں بہادر میر ناصر علی نے فارسی، عربی اور انگریزی اور فرانسیسی لٹریچر کا بہت وسیع مطالعہ کیا ہے اور اردو میں ایسے مضامین لکھے جو اپنی علو خیالی اور نزہت بیان کی وجہ سے آپ اپنا جواب نہیں۔ خالص ادبی اور شاعرانہ قسم کے مضامین میں فلسفے اور غور و فکر کی چاشنی میر صاحب ہی نے دی اور مغربی لٹریچر کے اثر سے اردو ادب کو گہرے فکر سے روشناس کرایا اور ایک نئی شاہراہِ خیال وضع کی۔"۳۸

میر ناصر علی کے مضامین کا اس حوالے سے تجزیہ کریں تو وہ ایک طرف دریا کو کوزہ میں بند کرتے ہیں اور دوسری طرف اپنا مدعا اور مافی الضمیر بھی بھرپور طریق سے بیان کر جاتے ہیں اور یہ خاصیت ان کے

انشائیوں کو لازوال بنا دیتی ہے۔ مضمون ''حسنِ مقال'' میں میر ناصر علی لکھتے ہیں:

''محبت کے لیے وفا کیا، کسی تدبیر وفکر کی ضرورت نہیں۔ کیڑا بے دست و پا پھول کی پتیوں میں گھر کر لیتا ہے۔ قمری بے بتائے سرو کو پہچان لیتی ہے اور باغبان سے پہلے بلبل کو موسمِ بہار کی خبر ہو جاتی ہے کوئل کو بغیر علم نباتات اور بے جنتری معلوم ہو جاتا ہے کہ آم کا درخت کب مور رلاتا ہے۔ محبت وہ چیز ہے جو سامان واسباب کی محتاج نہیں، بادشاہ کو بادشاہی کے لیے ملک درکار ہے۔ سپاہی کو میدانِ جنگ فلاسفر کو علم و تحقیق کی ضرورت ہے۔ مگر محبت کے لیے ایک اکیلا دل چاہیے۔ اس لیے جب تک دنیا میں دل سی چیز ہے محبت کسی کے مٹائے مٹ نہیں سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ محبت کا داغ بڑا داغ سمجھا جاتا ہے۔''۳۹

میر ناصر علی کی عالمانہ، ناصحانہ انداز بھی شوخی و لفریبی کی پھلجھڑیاں بکھیرتا ہے اور مقصدِ حیات کی خوبصورتیاں ان کے مضامین میں چمکتی دمکتی ہیں اور اعلیٰ و ادنیٰ ہر قسم کے موضوع کو قلمبند کر کے مضمون نگاری کی صنف کو وسعت مہیا کرتے ہیں۔ مشاہدے و تجربات کی بھٹی میں کندن بننے والے میر ناصر علی اپنے مضامین کو تجربات و مشاہدات سے مزین کر کے قارئینِ ادب کو بھی ان تجربات و مشاہدات سے مستفید کرتے ہیں۔ میر ناصر علی نے ہر موضوع پر قلم اٹھایا اور موضوعات کو انسانی حقوق، انسانی معاشرے اور انسانی فطریات کے دائرہ کار میں دیکھنے اور دکھانے کی کوشش کی اور تحلیل وتصریف سے گریز کیا۔ ان کے مضامین میں تہذیب و تمدن دلی نظر آتا ہے اور دلی کی معاشرت کی بھرپور عکاسی بھی ملتی ہے۔ ڈاکٹر انور سدید ''انشائیہ اردو ادب میں'' لکھتے ہیں:

''میر ناصر علی کے مضامین کی اولین خوبی ان کی زندہ اور خیال افروز نثر ہے۔ اس نثر میں دلی کی جھلکیاں ہی نظر نہیں آتیں بلکہ وہ اجتماعی شخصیت بھی موجود ہے جو تہذیبوں کی اتھل پتھل میں معدوم ہو گئی تھی۔''۴۰

مولانا شبلی نعمانی کے مضامین مختلف موضوعات پر جن میں علمی، سیاسی، تاریخی و ادبی و سیاسی مضامین لکھے جن کو باقاعدہ آٹھ جلدوں میں سید سلمان ندوی نے دارالمصنفین اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

☆ مقالات شبلی جلد اول میں کل ۶ مضامین ہیں۔ مذہبی مضامین ہیں اور در مطبع معارف اعظم گڑھ سے ۱۳۷۳ھ/۱۹۵۴ء میں شائع کیا گیا۔ اس میں مختلف رسالوں اور اخباروں سے مضامین کو یکجا کیا۔

☆ مقالات شبلی جلد دوم میں ادبی مضامین (دس) کو مختلف رسالوں سے ۱۳۶۹ھ/ ۱۹۵۰ء میں یکجا کیا۔

معارف اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

☆ مقالاتِ جلد سوم میں تعلیمی مضامین جن کو رسالوں اور اخباروں میں کل ۱۱ مضامین یکجا کر کے معارف اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

☆ مقالاتِ شبلی جلد چہارم (تنقیدی) میں الندوہ و دیگر رسائل سے یکجا کر کے ۱۳۵۳ھ/۱۹۳۴ء میں در مطبع معارف اعظم گڑھ سے ۱۶ مضامین کے ساتھ شائع کیا۔

☆ مقالاتِ شبلی جلد پنجم (تاریخی حصہ اول) میں کل مضامین کی تعداد ۹ ہے اور اس میں ان مشاہیر اسلام کی سوانح حیات سے فن کو الندوہ وغیرہ سے یکجا کر کے ۱۳۷۵ھ/ ۱۹۵۵ء میں معارف اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

☆ مقالاتِ شبلی جلد ششم (حصہ دوم) میں وہ تاریخی مباحث پر لکھے گئے ۷ مضامین ہیں جنہیں ۱۳۷۱ھ/ ۱۹۵۱ء میں معارف اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

☆ مقالاتِ شبلی جلد ہفتم میں فلسفیانہ ۱۲ مضامین ہیں جو مقالاتِ شبلی اور الندوہ کے مختلف نمبروں سے یکجا کیے اور ۱۹۶۵ء میں مطبع معارف اعظم گڑھ طبع گریڈ (کتبہ اقبال احمد) سے شائع ہوئے۔

☆ مقالاتِ شبلی جلد ہشتم قومی اور اخباری مضامین کا وہ مجموعہ ہے جو الندوہ، مسلم گزٹ اور دوسرے رسائل و اخبارات سے یکجا کر کے در مطبع معارفِ اعظم گڑھ سے ۱۳۵۷ھ/ ۱۹۳۸ء میں در مطبع سے شائع کی اور اس کے جلد میں مقالات کے حصے بنا دیئے گئے ہیں۔ مذہبی، علمی، تاریخی، تعلیمی، سیاسی اور متفرق حصہ ہیں۔

مضمون میں اگر اچھوتا خیال، علمِ تازہ اور نیچرل اندازِ تحریر کی آمیزش اختصار و حق و جمال نہ ہو تو مضمون اپنا اثر نہیں چھوڑتا اور جو علمیت کی دھاک سے اپنے مضمون کو سنوارتے سجاتے ہیں ایسے ادباء کے بصیرت افروز خیالات سے مستفید ہونا ناممکن نہیں ہوتا لیکن مشکل ضرور ہوا کرتا ہے۔ مقالاتِ شبلی کا انداز نیچرل ہونے کے ساتھ ساتھ اختصار کے وصف سے عاری نہیں ہے اور تصنع و بناوٹ ان کی سرشت میں نہیں ہے اور نہ ہی ان کی تحریروں میں اس کے لیے کوئی جگہ نظر آتی ہے۔ مولانا فاروق چڑیا کوٹی ایک جید عالم تھے مولانا شبلی کے بارے میں اپنے ایک مضمون ''ایک اور آفتاب غروب ہو گیا'' میں لکھتے ہیں:

''مزاج میں سخت وارفتگی، بے پروائی اور بے تکلفی تھی۔ اسی لئے ایک جگہ قیام نہیں کر

سکتے تھے نہ کوئی کام باقاعدہ انجام دے سکتے تھے۔ اسی وجہ سے کوئی بڑی خدمت یا عہدہ نہ حاصل کر سکے۔ اس کی ان کو پروا نہ تھی۔ علمی ذوق اس قدر غالب تھا کہ سخت سے سخت دنیاوی کشمکش میں بھی تعلم و تعلیم کا سلسلہ منقطع نہیں ہوتا۔ بے قاعدگی کی وجہ سے کوئی مستقل تصنیف نہیں کی۔ چھوٹے چھوٹے دو چار رسالے لکھے اور وہ بھی ناتمام رہ گئے۔ تمام مسائل علیہ میں مجتہدانہ رائے رکھتے تھے اور جب کوئی کتاب پڑھاتے تھے تو عموماً مصنف کی غلطیوں اور فرو گذاشتوں سے تعرض کرتے تھے۔"[۱۴]

اس مضمون کے اس پیرا گراف میں مولانا فاروق چڑیا کوٹی کا مکمل احاطہ کیا ہوا ہے۔ موضوع پر گرفت، اندازِ تحریر نیچرل اور علمیت و بصیرت کے برمحل و بہ موقع استعمال نے اس پیراگراف سے پورے مضمون کا احاطہ کر کے قارئین کو مطمئن کر دیا۔ گنے چنے لفظوں میں اپنا مافی الضمیر بیان کرنا شبلی کا خاصہ ہے اور ان کے ہاں معنی و الفاظ کا ربط و آہنگ نظر آیا ہے اور بے تکلف اندازِ تحریر بھی ان کے خلوص دیانت و محنت کا عکاس بھی ہے۔ ڈاکٹر بشیر سیفی ''اردو میں انشائیہ نگاری'' میں لکھتے ہیں:

"شبلی نعمانی کا اسلوب دبستانِ سرسید کے برعکس دلکش اور ادبی شان کا حامل ہے مگر موضوع و مواد کے لحاظ سے ان کے مضامین تاریخی، تحقیقی اور تنقیدی ہیں۔"[۱۴]

جہاں تک مضمون کی ترتیب و نظم کا سوال ہے تو شبلی کے مضامین میں کہیں جھول نظر نہیں آتا اور تنقید و تحقیق کا سارا مواد ان کے مضامین میں بدرجہ اُتم موجود ہے۔ ان کے مضامین کا پسِ منظر اور پیشِ منظر ان کے ذہنی ارتقاء اور بصیرت و فہم و ادراک کا عکاس ہے۔ اردو مضمون نویسی کو شبلی نے اپنے پُرجوش مضامین میں اصلاحی و تعلیمی فکر و معاشرتی ہیں وہاں یہ مضامین حقیقت سے قریب ترین بھی ہیں اور زندگی کے حقائق کو بے نقاب کرتے ہیں۔ مذہبی مضامین اور تاریخی مضامین تصحیح واقعات کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ سیاسی مضامین افہام و ادراک کے عکاس ہیں۔ علمی مضامین جوہر قابل کو تراشتے ہیں جبکہ ادبی مضامین ادبی شاہکار بن کر اُبھرتے ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید، شبلی کے حوالے سے ''اردو ادب کی تحریکیں'' میں اپنی رائے کا یوں اظہار کرتے ہیں:

"وہ محقق، نقاد، ادیب، شاعر، خطیب، فلسفی اور متکلم تھے۔ چنانچہ انہوں نے ہر موضوع پر پوری ذمہ داری سے قلم اٹھایا اور علمی، ادبی اور مذہبی مباحث کو اپنے منفرد دلائل اور آزاد تفکر سے سلجھا دیا۔"[۱۴]

جہاں تک ان کے مذہبی موضوعات کا ذکر ہے تو ہم ان کی شخصیت میں مذہبی منافرتوں کے خلاف

احساس اُبھرتا دیکھتے ہیں اور اسی احساس کے تحت انہوں نے مذہبی موضوعات پر قلم اُٹھایا تا کہ اسلام پر ہونے والے اعتراضات کا جواب دے سکیں۔ پروفیسر محمد فرمان "محمد شبلی نعمانی" مضمون میں لکھتے ہیں:

> "چونکہ اس زمانے میں عیسائی مشنریوں اور آریہ سماجیوں کے حملے اسلام پر بدستور جاری تھے، نیز یورپ کے مستشرقین مسلمانوں کے علوم، تاریخ اور تمدن کو اپنے اعتراضات کا نشانہ بنانے میں بڑی شدت اختیار کر رہے تھے۔ لہٰذا شبلی نے ان تقاضوں کے پیشِ نظر اسلام کی حمایت میں قلم اُٹھانا ضروری سمجھا۔"[۴۴]

تاریخی مضامین لکھ کر شبلی نے جہاں اسلاف کے کارناموں کو اُجاگر کیا وہاں انہوں نے مسلمانوں پر لگے ہوئے اعتراضات کا بھی جواب دینے کی حتی المقدور کوشش کی۔ مضمون تراجم کا یہ پہرا ملاحظہ ہو جس کے ذریعے مسلمانوں کے تراجم کرنے کی اہمیت کو اُجاگر کیا ہے:

> "تراجم کے زیرِ عنوان ایک مفصل مضمون یہ ثابت کرنے کے لیے لکھا کہ عہدِ وسطیٰ میں مسلمانوں نے دنیا کی تمام قوموں کا علمی سرمایہ اپنی زبان میں منتقل کر لیا تھا۔ اگر دنیا میں مسلمانوں کا قدم نہ آتا تو یونان، مصر ہند اور فارس کے علوم آج برباد ہو چکے ہوتے۔"[۴۵]

تاریخ کے حوالے سے جہانگیر کی "تزک جہانگیری" پر لگائے ہوئے جھوٹے الزام کے جواب میں شبلی نے "جہانگیر اور تزک جہانگیری" مضمون شبلی "مقالاتِ شبلی" جلد چہارم میں لکھا ہے۔ جس کے بارے میں پروفیسر محمد فرمان اپنے مضمون "محمد شبلی نعمانی" میں لکھتے ہیں:

> "یورپ کی طرف سے یہ الزام لگایا جاتا تھا کہ سلاطینِ اسلام غفلت شعار، عیش پرست اور سیہ کار تھے۔ شبلی نے جہانگیر اور تزک جہانگیری کے عنوان سے یوں تصریح کیا ہے کہ روزنامچے میں نہایت سچائی کے ساتھ ایسے حقائق بیان ہوئے ہیں جن سے اس "عیش پرست" سلطان کی اُمورِ ملکی سے دلچسپی، جغرافیائی تحقیقات، علم الحیوانات، مصوری، صناعی، سپہ گری اور علماء کی قدر دانی جیسے موضوعات پر ایسی روشنی پڑتی ہے کہ اس کی عیش پرستی کا خیال تک نہیں رہتا۔"[۴۶]

۱۸۵۷ء کے بعد اردو ادب جن تبدیلیوں سے دوچار ہوا۔ اس نے نئے امکانات روشن کیے اور نئی راہوں سے اردو ادب کو متعارف کرایا اور مضمون نگاری بھی اس دور کی نئی راہوں سے ایک روشن ستارہ بن کر جگمگانے لگی۔ فارسی کے بھاری بھرکم الفاظ سے چھٹکارا حاصل کرنے کی سعی کی جانے لگی۔ فی البدیہہ روزمرہ

بول چال سے قریب زبان کو ترجیح دی جانے لگی اور حسنِ بیان کو حسنِ ادا تک دیکھنے کی جستجو میں صداقت و دیانت سے شناسائی کر کے متحرک اور متوازن ادب پیش کیا جانے لگا۔ شبلی نے بھی جو مضمون نگاری کی ان کے ہاں جیسا کہ ہم نے پہلے کہا صداقت و دیانت کا فقدان نظر نہیں آتا اور حسنِ بیان سے حسنِ ادا تک خطابت و جوش کے باوجود فی البدیہہ انداز ملتا ہے۔ شبلی کے مضامین سیر حاصل گفتگو کرتے ہیں ان میں عدم تکمیل کا ذرا بھر بھی شائبہ نہیں ہوتا اپنی روح وفکر کے مطابق یہ مضامین نہ تو تضادات کا شکار ہیں اور نہ ہی انتشار کا۔ یہ مضامین ''علوم جدیدہ'' (علم کی حقیقت) فلسفہ اور فارسی شاعری، ہمایوں نامہ، تزک جہانگیری، مآثر رحیمی اور عبدالرحیم خانِ خاناں، شبلی کی علمیت اور اعلیٰ پایہ کی مضمون نگاری کا منہ بولتا ثبوت ہیں اور ان کی مضمون نگاری کا شاہکار ہیں۔ شبلی کا خطابیہ انداز ان کے مضامین میں جوش اُبھارتے ہیں اور یہ جوش کسی بپھرے ہوئے طوفان کی طرح مبالغہ پر مبنی نہیں ہوتا بلکہ غفلت میں ڈوبے ہوئے ذہنوں کو سوچنے اور کچھ کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ ایک نئی لگن اور جذبے کو اُبھارتے ہیں اور عوام الناس کو ''اصلاحِ خود'' کا درس دیتے ہیں۔ ''تعلیم جدید و قدیم''، مضمون میں شبلی لکھتے ہیں:

> ''تعلیم قدیم کے ساتھ جدید خیالات سے واقف ہونے اور انگریزی زبان اور انگریزی علوم پڑھنے کی ضرورت ہے لیکن باین ہمہ اس بات کی ضرورت نہیں کہ ہم ان علماء کو جن کو کسی قسم کی اصلاح کی ضرورت نہیں خیال کرتے۔''[۴۷]

شبلی کے مضامین میں جدت اور تنوع کے ساتھ ساتھ حال، ماضی و مستقبل ہمیں مربوط نظر آتے ہیں اور ان میں پختگی کے ساتھ ساتھ ناقدانہ آراء بھی ہوتی ہیں۔ جبکہ ڈاکٹر سید عبداللہ ''سرسید اور ان کے رفقائے کار میں شبلی اور ندوہ کے حوالے سے اپنی رائے کا یوں اظہار کرتے ہیں:

> ''الندوہ شبلی کی نیم جذباتی، دینی، تاریخی اور قومی نقطۂ نظر کا شارح اور مبلغ تھا۔ عالمانہ اور فاضلانہ مقالات کے باوجود اس کا نصب العین یہ تھا کہ ملک میں ایک علمی اور ذہنی انقلاب پیدا ہو اس کی ادبی حیثیت بلند تر تھی اور اس کے مقالات کی روح اثباتی اور ایجابی تھی۔''[۴۸]

زندگی سماج سے وابستہ ہے اور اس کے مقاصد بھی اسی سماج کے مرہونِ منت ہیں اور سماجی خیر و شر سے عبارت ہے۔ دکھ سکھ کے مسائل اسی سماج کا حصہ ہیں۔ سیاست، تجارت، قیادت، علمیت و مذہبیت میں تضاد بھی اس سماج کا ایک منظر ہے اور جو محرومِ نظر ہوا کرتے ہیں وہ نظامِ اخلاق کی کمزوریوں کو بھانپ نہیں

سکتے۔لیکن جو حسنِ نظر رکھتے ہیں وہ ظلم و بربریت اور منافقتوں کے پردے چاک کرتے ہیں اور اپنے قلم کی نوک سے اصلاحِ معاشرہ کرتے ہیں۔شبلی بھی باطن کی آنکھ سے دیکھتے ہیں، پھر اپنے مقالات سے منافرتوں کی بیخ کنی کرتے ہیں۔لیکن عقلیت و منطقیت کے باوجود شبلی کے موضوعات کی اہم خصوصیات ان کا اختصار ہے اور وہ دریا کو کوزے میں بند کرنے کو پسند کرتے ہیں۔ان کے مقالات بھرپور دلائل کے ساتھ موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں اور شاہانہ انداز اور ٹھاٹ باٹ ان کے مقالات کو ادبی بلندی عطا کرتا ہے۔ مقالاتِ شبلی جلد سوم میں لکھے گئے مضمون 'دفنِ نمو کی مروجہ کتابیں'' میں شبلی کی علمی و ادبی بصیرت کا نمونہ ملاحظہ ہو:

> ''جب یہ امر ثابت ہو گیا کہ نحو کا اصل تعلق الفاظ کی ترتیب اور تقدیم و تاخیر سے ہے تو نحو کی ترتیب یہ ہونی چاہیے کہ کلام کے جو اجزاء سب سے مقدم ہیں ان کا حال پہلے بیان کیا جائے پھر ان سے کم درجہ کے اجزاء کا حال، پھر ان سے کم کا۔''[۴۹]

شبلی کے مقالات میں علمیت کے ساتھ ساتھ صداقت کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے اور خیالات میں انتشار شبلی کے ہاں نہیں ملتا بلکہ موضوعات میں ربط و تسلسل ملتا ہے۔ مرصع ساز زبان کی بجائے سادہ، بے تکلف زبان کا استعمال ہمیں شبلی کے مقالات میں نظر آتا ہے۔اس اندازِ تحریر میں بے تکلفی ملتی ہے۔ندرت، جدت، جاودانی اور جاذبیت بھی شبلی کے مقالات کا خاصہ ہے اور مقالات کی ترویج و ترقی کے لیے شبلی کے مقالات مددگار و معاون ثابت ہوئے۔ ان کا شخصی زاویۂ نگاہ ان کے مقالات میں نمایاں ہوتا ہے۔ ان کے مضامین اجتہاد کی راہیں بھی کھولتے ہیں اور خود ستائی و خود نمائی ان کے مقالات میں اپنا جلوہ دکھاتی ہے۔ شخصی زاویہ نگاہ ہونے کے باوجود شبلی کے مقالوں میں اجتماعی نکتہ نظر جگہ پاتا ہے۔شبلی نے اپنے مقالوں میں جذبات و محسوسات کی ترجمانی بھی سیدھے سادے واضح انداز میں کی ہے۔ زندگی کی ترتیب و توازن زندگی کے نشیب و فراز سے عبارت ہے اور زندگی کے نشیب و فراز انسان کو ہنساتے بھی ہیں، رلاتے بھی ہیں۔ انسان غم و خوشی کے تضادات کا مجموعہ ہے۔انسانی رویوں کے ان تضادات کو قلم بند کرانے والے مزاح نگار کہلاتے ہیں۔ مزاح کڑوی صداقتوں کو کڑوے لفظوں میں بیان کرے تو طنز نگار کہلاتا ہے۔ ان ہی سچائیوں کو رکیک الفاظ و خیالات میں بیان کرے تو پھکو پن و رکاکت کہلاتی ہے۔لیکن اگر معتدل الفاظ و خیال کا سہارا لیا جائے تو ظرافت کے زمرے میں آتا ہے۔ ہنسنا ہنسانا سماجی ارتقاء کا سبب بنتا ہے۔سماجی، سیاسی، گھٹن میں ہنسی ہنسی میں مافی الضمیر بیان کر کے مزاح نگار معاشرے کو بڑے پتے کی بات بتا جاتا ہے۔اودھ

پنچ کا مطمع نظر بھی ہنسی ہنسی میں عوام کی فکری نشوونما کرنا تھا۔ منشی سجاد حسین نے ۱۴ جنوری ۱۸۷۷ء میں اودھ پنچ جاری کیا۔ اس کے توسط سے کئی مزاح نگاروں نے جنم لیا۔ چکسبت لکھتے ہیں:

"آج نثر اردو جس سلیس اور پاکیزہ روش پر جاری ہے اس کی ایجاد میں اودھ پنچ کا بہت بڑا حصہ ہے۔"۵۰

"اودھ پنچ" ہفت روزہ اخبار تھا۔ اودھ پنچ مزاح سے بھرپور ہونے کے باوجود سیاسی معاشرتی رویوں اور اقدار پر بھی گہری طنز کرتا تھا۔ "اودھ پنچ" کے لکھنے والوں میں مرزا مچھو بیگ ستم ظریف، نواب سید محمد آزاد، منشی جوالا پرشاد، منشی سجاد حسین اور اس دور کے دیگر قلم کار شامل تھے۔ سرسید کی پالیسیوں کے خلاف اودھ و پنچ میں دل کھول کر تبصرہ کیا جاتا تھا۔ منشی سجاد حسین مغربی تہذیب و تعلیمات سے بیزار تھے اس لیے سرسید کو نشانہ ستم بناتے رہے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ وہ طنز و ظرافت میں اپنے طرز کے موجد تھے۔ ان کی ذہانت و متانت، علمی بصیرت اور مدبرانہ قیادت و صلاحیت کا "اودھ پنچ" منہ بولتا ثبوت ہے۔ شوخی، ظرافت اور بذلہ سنجی منشی سجاد حسین کا طرۂ امتیاز تھی اسی لیے ان کے قلم سے نکلے مضامین پراثر اور سحر انگیز ہیں۔ منشی صاحب کے زیر نگرانی نکلنے والا یہ اخبار ایک تحریک تھا اس اخبار نے ادبی دنیا میں انقلابی و ہنگامی صورتحال بھی پیش کی۔ اپنے زمانے کی اہم تبدیلیوں کی نشاندہی بھی کی "اودھ پنچ" میں منشی جوالا پرشاد اپنے مضمون "اودھ کی فریاد نے ولایت کا رخ کیا" میں لکھتے ہیں:

"اچھا یہ تو بتاؤ کہ حقیقت میں رعایا ناراض ہے یا یار لوگ مینڈھے لڑوا رہے ہیں۔ بھائی صاحب سب کو دل سے لگی ہے سارے ملک میں تہلکہ پڑا ہوا ہے کہ اللہ اس ڈوبتی ہوئی ناؤ کو تار لے..... اب کیا آئے گا جب اودھ کی چیف کمشنری ولایت سے بحال ہو جائے گی۔ اے تیرے منہ میں گھی شکر۔ بھلا ہمیں کیا دو گے۔ تمہیں۔ تمہیں۔ تمہیں یہ لکھتے ہوئے رنو چکر ہوئے۔"۵۱

مغربی تہذیب اور مشرق و مغرب کے تضادات کو پیشِ نظر رکھ کر "اودھ پنچ" نے پھبتیوں اور بذلہ سنجی کے ذریعے یہ آواز بانگِ دہل بلند کی کہ جب سے سماجی و معاشرتی رویے پرانی اقدار و روایات سے ٹکراتے ہیں تو ماحول میں خرابیاں اور خامیاں بھی ہتی ہیں۔ کچھ قلم کار خامیوں کی نشاندہی کرتے ہیں اور کچھ ان مصائب و خامیوں پر اصلاحی نقطۂ نظر سے قلم اٹھاتے ہیں۔ اول الذکر "اودھ پنچ" ہے۔ جو ان تضادات پر نوک جھوک کرتا ہے، موثر الذکر سرسید احمد خاں ہیں جو اصلاحی نکتہ نظر سے معاشرے کے فرسودہ نظام پر

آواز حق بلند کرتے ہیں۔ ''اودھ پنچ'' سرسید اور نئی تہذیب دونوں کو قبول نہیں کرتا اور یہ مجلّہ سرسید اور علی گڑھ تحریک دونوں پر بھی کڑی تنقید کرتا ہے۔ انگریز و انگریز سرکار کے خلاف اپنے غیظ و غضب کا اظہار بڑے جوش و خروش سے کرتا ہے۔ ''گلدستہ پنچ'' کے مقدمے میں چکسبت لکھتے ہیں:

''اسنے والیان ریاست کی خوشامد سے اپنا دامن پاک رکھا اور ہمیشہ اون کی غفلت و عیش پسندی کا پردہ فاش کرتا رہا۔'' ۵۲

مرزا مچھو بیگ جوستم ظریف کے نام سے لکھتے تھے۔ اپنے مضمون ''گرما بگوشت و روبکاری ہی رہی'' میں برسات کے حوالے سے موسم کی اٹھکیلیوں، کیچڑ اور پانی سے جھل تھل ہونے، برسات میں عاشق و محبوب وکیلوں کے کچہری جانے، کوٹ کالر اور کپڑے خراب ہونے کا ذکر کرتے ہوئے زبان دانی کا شوق پورا کرتے نظر آتے ہیں۔ جبکہ پنڈی تربھون ناتھ ہجر کا مضمون ''محرم الحرام'' ہے جس میں مجلسوں، ماتم اور سبیلوں کا ذکر ہے اور لکھنو کا محرم تو مشہور ہے۔ یہ مختصر مضمون منظر نگاری کے لحاظ سے عمدہ ہے۔ زبان کا رچاؤ اور لوچ اس مضمون کا خاصہ ہے۔ آغاز مضمون پر زبان کا چٹخارہ ختم ہے:

''حضرت! ذی ادھر مخاطب ہو جیئے، واللہ میں مانتا ہوں۔ کیوں نہو، ہم پرتاب گڈھ سے ننگے پاؤں نہار منہ سر پر بھوسا اڑاتے خاک پھانکتے محرمی صورت بنائے آندھی، کی طرح چلے آتے ہیں اور آپ ہیں کہ چپ چاپ مزے سے منہ میں گھنگھیاں بھرے کانوں میں تیل ڈالے، لحاف مین دبکے پڑے خراٹے لے رہے ہیں۔ اسے سبحان اللہ بس آدمی ہوتو آپ سا ہو۔'' ۵۳

''اودھ پنچ'' کے اخلاقی، سیاسی، سماجی، معاشرتی مضامین اپنے اندر دم خم رکھتے ہیں۔ کہیں کہیں زبان کی مشکل پسندی کا خیال آتا ہے اور کہیں کہیں زبان کی سادگی و سلاست کے ساتھ ساتھ دلکشی، نازگی و فرحت سے بھرپور ملتی ہے۔ زندگی کو عقلی دلائل پر پرکھنے والے یہ مضامین اپنے اندر جدت و تنوع کے ساتھ ساتھ مشرقیت کا احساس بھی رکھتے ہیں۔ ''اودھ پنچ'' سے پہلے لکھنے والے نمایاں میں تھے۔ ''اودھ پنچ'' کے توسط سے بہت سے مزاح نگار سامنے آتے ہیں۔ ڈاکٹر فوزیہ چوہدری ''نقد ظرافت'' میں لکھتی ہیں:



> ''اودھ پنچ'' واحد پرچہ تھا۔ جس نے مزاح کو ہتھیار بنایا اور مشن کے طور پر آگے بڑھا۔ یہی وہ دور تھا جب مزاح نے اپنی حیثیت اور اہمیت منوائی اور ''اودھ پنچ'' کے پلیٹ فارم سے ایسے لکھنے والے منظر عام پر آئے جو صرف مزاح نگار کے طور پر مشہور ہوئے۔ اسی سے قبل مزاح اور مزاح نگار اس سے قبل مزاح اور مزاح نگار تو موجود تھے لیکن ان کی باقاعدہ حیثیت کو تسلیم نہیں کیا جاتا تھا۔ مگر ''اودھ پنچ'' کے دور میں مزاح کی حیثیت کو باقاعدہ جانا گیا اور یہ ایک رجحان ساز رویے کے طور پر اردو ادب میں متعارف ہوا۔''۵۴

''اودھ پنچ'' اپنے ہم عصر جریدوں پر بھی کڑی اور بے باک تنقید کرتا ہے۔ تخریب و تعمیر کے اسی دور میں ''اودھ پنچ'' سیاسی و سماجی منافقتوں کو بے نقاب کرنے کی ذمہ داری احسن طریق سے نبھاتا رہا۔ ''اودھ پنچ'' کا جذباتی رنگ ''اودھ پنچ'' کو مقبول بنانے میں مددگار و معاون ثابت ہوا۔ فکر و فن کا خیال ''اودھ پنچ'' میں منشی سجاد حسین نے رکھا۔ اسی دور میں اپنے موضوعات کا محور انسان اور اس کے مسائل معاشرہ اور بے حسی اس کے مسائل اور دکھ درد کو ''اودھ پنچ'' نے آشکار کیا۔ کیونکہ اس دور کا معاشرہ بے حسی اور سرد مہری کا شکار تھا۔ ''اودھ پنچ'' کے نگاروں نے معاشرے میں فکر، منطقی سوچ اور برائیوں کے تدارک کا علاج اپنے مضامین میں پیش کیا۔ مسز آفتاب مسرور عالم خان لکھتی ہیں:

> ''بگاڑ میں بناؤ کی صورت نکالنے کے علاوہ ''اودھ پنچ'' کی یہ خدمت بھی سنہرے حروف میں لکھنے کے قابل ہے کہ اردو نثر کو سادگی سلاست روانی اور بے تکلفی کے ساتھ ادبی حسن و لطافت دلکشی اور شگفتگی سے بھی ہمکنار کیا۔''۵۵

نواب سید محمد آزاد اودھ پنچ کے خاص لکھاریوں میں سے تھے ان کے ہاں فکر و تخیل کی جولانی عروج پر نظر آتی ہے۔ عبارت شگفتہ اور لفظ متحرک نظر آتے ہیں۔ فکری اپج آپ کے مضامین کو جدید نو لکھاریوں کی صف میں لا کھڑا کرتے ہیں۔ ''اودھ پنچ'' کے لیے آپ نے جو مضامین لکھے ان مضامین میں مغربی تہذیب پر طنز اور زبان کی چاشنی بھی ہے۔ احمد علی شوق قدوائی کے نثری مضامین ''اودھ پنچ'' کا حصہ بنے۔ مزاح

سے بھرپور ان کے مضامین معاشرے پر طنز بھی کرتے ہیں اور معاشرے کو واقعات کے بیان سے سدھارنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ مختصر یہ ہے کہ "اودھ پنچ" کا ظریفانہ انداز اپنے موضوعات میں سوشل اصلاح کا پہلو سموئے ہوئے ہے۔ زبان کا بے ساختہ پن بھی "اودھ پنچ" کا خاصہ ہے۔ چکبست "گلدستہ پنچ" میں لکھتے ہیں:

> "اودھ پنچ کے مضامین کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ دنیا کا کوئی مسئلہ ایسا نہ تھا جو اودھ پنچ کے ظریفوں کی گلکاری سے خالی رہتا ہو۔ اس کے علاوہ لکھنو کے طرز معاشرت کی پرمذاق اور دلکش تصویروں سے اس کے صفحے اکثر رنگین نظر آتے ہیں۔"۵۲

حواشی

۱۔ سلیم اختر ، ڈاکٹر ، انشائیہ کی بنیاد ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز ،۲۰۰۲ء ،ص:۶۸

۲۔ سید احمد خان ،مقالات سرسید ، (حصہ پنجم) مرتبہ: محمد اسماعیل ، پانی پتی مولانا لاہور: مجلس ترقی ادب، حصہ دوم اپریل ۱۹۹۰ء ،ص:۱۳

۳۔ ..... ، مقالاتِ سرسید ، (حصہ) (حصہ ہشتم) مرتبہ: محمد اسماعیل پانی پتی ، مولانا ،لاہور: مجلس ترقی ادب طبع دوم اپریل ۱۹۹۱ء ،ص:۱۶،۱۵

۴۔ خلیق احمد نظامی، پروفیسر، سرسید اور علی گڑھ تحریک ۔ علی گڑھ: ایجوکیشن بک ہاؤس، ۱۹۸۲ء، ص:۲۳۳

۵۔ سید احمد خاں، ''مقالاتِ سرسید''، (حصہ پانزدھم) مرتبہ: محمد اسماعیل، پانی پتی، مولانا، لاہور: مجلس ترقی ادب، طبع دوم جون ۲۰۰۱ء، ص: ۱۹۔۲۰

۶۔ عبداللہ ، ڈاکٹر ، سید ، "ملا وجہی سے عبدالحق تک "لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز ،۱۹۹۴ء ،ص:۸۴،۸۳

۷۔ سید احمد خان ،مقالاتِ سرسید (حصہ پنجم) مرتبہ: محمد اسماعیل ، پانی پتی ، مولانا ، لاہور: مجلس ترقی ادب، دوم اپریل ۱۹۹۰ء ،ص:۷۴

۸۔ انور سدید، ڈاکٹر، ''اُردو ادب کی تحریکیں، کراچی: انجمن ترقی اُردو پاکستان، اشاعت چہارم، ۱۹۹۹ء، ص: ۳۱۸

۹۔ احتشام حسین، سید، (مقدمہ) "اُردو انشائیہ "۔ نئی دہلی: انجن ترقی ء اُردو ہند بار دوم جون ۱۹۴۹ء ،ص:۱۴

۱۰۔ الطاف حسین ، حالی ،کلیات نثر حالی (جلد اول) مرتبہ: محمد اسماعیل ،مولانا ، پانی پتی، لاہور: مجلس ترقی ادب ،طبع اول دسمبر ۱۹۶۷ء ،ص: ۳۸۷

۱۱۔ ایضاً ،ص: ۱۲۳۔۱۲۴

۱۲۔ عبدالقیوم ، ڈاکٹر ، کلیات نثر حالی (جلد اول)،(مرتب) محمد اسماعیل پانی پتی ،مولانا ، لاہور: مجلس ترقی ادب ،طبع اوّل دسمبر ۱۹۶۷ء ،ص: فلیپ

۱۳۔ الطاف حسین ،حالی ، کلیات نثر حالی (جلد اول)، (مرتب)،محمد اسماعیل ،مولانا ، پانی پتی ، لاہور: مجلس ترقی ادب ، (طبع اول) دسمبر ۱۹۶۷ء ،ص: ۲۱۲

۱۴۔ محمد اسماعیل پانی پتی، مولانا، ''کلیات نثر حالی''، لاہور: مجلس ترقی ادب، (طبع اول) دسمبر ۱۹۶۷ء، ص: فلیپ

۱۵۔ الطاف حسین، حالی، ''کلیات نثر حالی''، مرتب: محمد اسماعیل، پانی پتی، مولانا، لاہور: مجلس ترقی ادب، طبع اول، دسمبر ۱۹۶۷ء، ص:۲۱۲

۱۶۔ انور سدید، ڈاکٹر ، اُردو ادب کی تحریکیں ، کراچی: انجمن ترقی اُردو ، اشاعت چہارم ۱۹۹۹ء، ص:۳۱۹

۱۷۔ الطاف حسین حالی ، کلیات نثر حالی ، (جلد اول) محمد اسماعیل ، پانی پتی، مولانا، لاہور: مجلس ترقی ادب، طبع اوّل ، دسمبر ۱۹۶۷ء، ص: ۳۳۳،۳۳۲

۱۸۔ طیبہ خاتون ، ڈاکٹر "اُردو میں ادبی نثر کی تاریخ ، دہلی: ۳۲۱گلی گڑھیا، جامع مسجد دہلی اپریل ۱۹۷۹ء، ص:۹۰

۱۹۔ خلیق احمد نظامی ،''سر سید اور علی گڑھ تحریک''، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۷۲ء، ص: ۱۷۷

۲۰۔ ذکا اللہ ، مولوی ، ''مبادی الانشا''، (حصہ چہارم) دہلی: مطبع مجتبائی ، اشاعت دوم ، اپریل ۱۹۰۰ء ، ص: ۱۶۵،۱۶۴

۲۱۔ رفعت جمال ، ڈاکٹر ، ذکا اللہ حیات اور ان کے علمی و ادبی، کارنامے ،دہلی: ساقی بک ڈپو ، اُردو بازار ، نقش اوّل ۱۹۹۰ء، ص :۱۶۴،۱۶۳

۲۲۔ ایضاً ،ص:۱۶۹

۲۳۔ ذکا اللہ مولوی ، مبادی الانشا (حصہ چہارم)، دہلی: مطبع مجتبائی ، اشاعت دوم ، اپریل ۱۹۰۰ء ،ص:۳۴

۲۴۔ صفی مرتضٰی ،سید ، ''اُردو انشائیہ''، دہلی: انجمن ترقی اُردو ہند، بار دوم،۱۹۶۹ء، ص: ۳۳

۲۵۔ آدم شیخ ، انشائیہ، رائٹرس امپوریم پرائیوٹ لمیٹڈ ، طبع اوّل ۱۹۶۵ء، ص: ۱۳

۲۶۔ سمیع اللہ ڈاکٹر ، رسالہ ''آجکل''، اگست ۱۹۶۷ء ، جلد ۲۶، نمبر ۱، ص:۱۶

۲۷۔ عبید اللہ خان ، ڈاکٹر ، ''تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند''، (نویں جلد) اُردو ادب (چہارم)، ۱۸۵۷ تا ۱۹۴۴ء، لاہور: پنجاب یونیورسٹی، طبع اول فروری ۱۹۷۶ء ،ص:۲۱۰

۲۸۔ عبد اللہ، ڈاکٹر سید، سر سید احمد خان اور اُن کے رفقائے کار، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۴ء، طبع سوم ۱۹۹۴ء، ص: ۶۷

۲۹۔ سید مہدی علی، خان، محسن الملک، نواب، تہذیب الاخلاق جلد اول، لاہور: (مرتب) فضل الدین ملک، مطبع کریمی، ۱۹۱۴ء، ص: ۱۸۹

۳۰۔ عبید اللہ خان، ڈاکٹر، "تاریخ ادبیات، مسلمانان پاکستان و ہند، نویں جلد، اُردو ادب، (چہارم، ۱۸۵۸ تا ۱۹۱۴ء، لاہور: پنجاب یونیورسٹی، طبع اول فروری ۱۹۷۶ء، ص: ۲۱۱

۳۱۔ مہدی افادی، "افادات مہدی"، علی گڑھ: سر سید بک ڈپو، بارِ اول ۱۹۵۸ء، ص: ۹۲

۳۲۔ ایضاً، ص: ۱۰۲

۳۳۔ ایضاً، ص: ۲۱۵

۳۴۔ ایضاً، ص: ۱۹۳

۳۵۔ ناصر علی میر، دہلوی، مقاماتِ ناصری، مرتب انصار ناصری، سید، کراچی: انجمن ترقی اُردو، اشاعت اول ۱۹۶۹ء، ص: ۳۸۲، ۳۸۱

۳۶۔ انصار، ناصری، "نقوش"، جنوری ۱۹۵۵ء، ۴۸، ۴۷، ص: ۹۰

۳۷۔ ناصر علی میر، دہلوی، "مقامات ناصری"، (مرتب) انصار ناصری، سید، کراچی: انجمن ترقی اُردو، اشاعت اول ۱۹۶۹ء، ص: ۴۲۱

۳۸۔ شاہد احمد، دہلی، "نقوش"، جنوری ۱۹۵۵ء، ۴۸، ۴۷، ص: ۱۰۱

۳۹۔ ناصر علی میر، "مقاماتِ ناصری"، مرتبہ: انصار ناصری، کراچی: انجمن ترقی اُردو، اشاعت اول ۱۹۶۹ء، ص: ۳۹۱

۴۰۔ انور سدید، ڈاکٹر، "انشائیہ اُردو ادب میں"، لاہور: مکتبہ فکر و خیال، اشاعت اول، جنوری ۱۹۸۵ء، ص: ۹۸

۴۱۔ فاروق چڑیا کوٹی، مولانا، "مقالات شبلی"، (جلد) مرتبہ سلیمان ندوی سید، در مطبع اعظم گڑھ، ۱۹۳۸ء/۱۳۵۷ھ، ص: ۳۸، ۳۷

۴۲۔ بشیر سیفی، ڈاکٹر، "اُردو میں انشائیہ نگاری"، لاہور: نذیر پبلیشرز، ۱۹۸۹ء، ص: ۱۰۳، ۱۰۲

۴۳۔ انور سدید، ڈاکٹر، "اُردو ادب کی تحریکیں"، کراچی: انجمن ترقی اُردو پاکستان، اشاعت چہارم، ۱۹۹۹ء

ص: ۳۲۷

۴۴۔ محمد فرمان، پروفیسر، ''تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان وہند''، لاہور: پنجاب یونیورسٹی، طبع اوّل، فروری ۱۹۷۲ء، ص: ۱۷۶

۴۵۔ شبلی نعمانی، ''مقالاتِ شبلی''، مرتبہ: سلیمان ندوی، سید، مولانا، اعظم گڑھ: مطبع معارف طبع، ص: ۹۷

۴۶۔ محمد فرمان فتح، پروفیسر، '' تاریخِ ادبیات پاکستان وہند''، لاہور: پنجاب یونیورسٹی، طبع اوّل، فروری ۱۹۷۲ء، ص: ۱۷۹

۴۷۔ شبلی نعمانی، مقالاتِ شبلی، (جلد سوم) مرتبہ، سلیمان ندوی، سید، مولانا، اعظم گڑھ: مطبع معارف، طبع دوم، ۱۹۵۵ء، ۱۳۷۵ھ، ص: ۱۴۲

۴۸۔ عبداللہ، ڈاکٹر سید، سرسید اور ان کے رفقائے کار، اسلام آباد: مقتدرہ، طبع سوم ۱۹۹۴ء، ص: ۱۹۹

۴۹۔ شبلی نعمانی، ''مقالاتِ شبلی''، (جلدسوم) مرتبہ: سلیمان ندوی، سید، مولانا، اعظم گڑھ، مطبع معارف، ۱۹۵۵ء، ۱۳۷۵ھ، ص:۱۳۴

۵۰۔ برج نرائن چک بست، پنڈت، لکھنوی، گلدستہ بنج، لکھنو: ہندوستانی پریس ۱۹۱۵ء، ص:۶

۵۱۔ جوالا پرشاد، منشی برق، ''انتخاب اودھ بنج'' لکھنو: مطبوعہ نیر پریس پاٹانامہ، سن ندارد، ص:۱۱۱

۵۲۔ برج نرائن چک بست، پنڈت، لکھنوی، ''گلدستہ بنج''، لکھنو: ہندوستانی پریس ۱۹۱۵ء، ص:۱۱

۵۳۔ ترجھوں ناتھ پسر والمتخلص بہ ہجر، پنڈت، ''گلدستہ بنج' لکھنو: ہندوستانی پریس، ۱۹۱۵ء، ص:۹۵

۵۴۔ فوزیہ چوہدری، ڈاکٹر، ''نقد ظرافت''، لاہور: پولیمر پبلی کیشنز، اردو بازار، مارچ ۱۹۹۸ء، ص:۹

۵۵۔ مسز آفتاب مسرور عالم خان، ''اُردو نثر ادب میں طنز و مزاح روایت اور فن''، اسلام آباد: ہائر ایجوکیشن کمیشن، ۲۰۰۶ء، ص:۴۳

۵۶۔ برج نرائن چکبست، پنڈت، لکھنوی، '' گلدستہ بنج''، لکھنو: ہندوستانی پریس ۱۹۱۵ء، ص:۷

باب چہارم

رسائل میں مضمون نگاری کا ارتقاء

۱۹۰۰ء سے ۱۹۳۶ء تک

رسائل میں مضمون نگاری کا ارتقاء ۱۹۰۰ء سے ۱۹۳۶ء تک

(موضوعات، مواد اور اسالیب کا مجموعی جائزہ)

مخزن: مخزن علمی، سیاسی، ادبی و معاشرتی بادِ سموم میں تازہ ہوا کا جھونکا ثابت ہوا۔ اس سے پہلے علمی تازگی کا احساس مفقود نہ تھا زندگی بدل رہی تھی۔ ایسے میں روایات کی پاسداری ذرا مشکل سی ہوگئی تھی۔ مخزن نے بدلتی زندگی کی بدلتی اقدار کو بھی گلے لگایا اور روایت کو بھی ملحوظ خاطر رکھا اور اُردو کی قدر شناسائی بھی کرائی۔ مخزن سے قبل رسائل میں نہیں نکلتے تھے گلدستوں کی صورت میں شاعری کا مواد نظر آتا ہے لیکن مخزن نے باقاعدہ "ادب العالیہ" کا آغاز کیا مضامین بھی اعلیٰ معیار کے شائع کیے۔ مخزن ایک تحریک تھا، عہد ساز رسالہ تھا سر عبد القادر نے جو مخزن کے مدیر بھی تھے۔ مخزن کو سیاسی جھگڑوں سے دور رکھا اور افہام و تفہیم سے مسائل کے حل کے لیے ہمہ وقت کوشاں رہتے تھے۔ شیخ عبد القادر نے مخزن کے اجرا کے وقت سرسید کے "تہذیب اخلاق" کی جدت اور اسلوب کی تعریف کے بعد رسالہ مخزن کے اجرا کا مقصد بتایا کہ نئے مذاق، نئی سوچ اور نئی فکرِ تازہ کے ذریعے مخزن آغاز کیا ہے۔

نئی سوچ، نئی فکر وہ رومانوی نثر تھی جسے سرسید کی عقلی و مادی نثر کے جواب میں لکھی جارہی تھیں سماجی، لسانی فرقہ وارانہ گروہ بندیوں سے مخزن کو بچاتے ہوئے عبد القادر نے حق گوئی و بے باکی کا مظاہرہ کیا اور مخزن کو عوامی اُمنگوں کا جذبات و احساسات کا آئینہ دار بنا کر اُردو کے قدیم لب و لہجہ سے منہ موڑتے ہوئے فطری، جذباتی، رومانوی و انفرادی نکتہ نظر عطا کیا شیخ عبد القادر ۱۹۱۰ء تک مخزن کے باقاعدہ مدیر رہے اس کے بعد اُن کا نام اعزازی طور پر اُن کی مصروفیت کی بنا پر مخزن کے سرورق پر شائع ہوتا رہا اور مخزن کی ادارت مولوی غلام رسول، مولوی ظہور الدین، حفیظ جالندھری وغیرہ کے ہاتھ میں آگئی اور مخزن کا پہلے جیسا معیار نہیں رہا لیکن پھر مخزن نے اپنی انفرادیت برقرار رکھا۔ ۱۹۱۰ء تک مخزن کے لکھنے والوں میں سر عبد القادر، شیخ محمد اکرام، بشیر احمد، امتیاز علی تاج، سید علمدار حسین، حسن نظامی، سجاد حیدر یلدرم، سجاد مرزا بیگ، دیا نرائن نگم، میر نثار علی، شبلی نعمانی، علامہ اقبال، سید احمد

دہلوی، راشد الخیری، شمس اللہ قادری، عبدالحلیم شرر، حسرت موہانی، حفیظ جالندھری و دیگر مشاہیر ادب شامل تھے۔

اُنیسویں صدی کے مسلمانوں کو سطوت و سلطنت چھین جانے کا احساس تھا جو اب پچھتاوا بن کر ڈس رہا تھا۔ علمی و ادبی شعور رکھنے والے کارکن احساس غیرت و حمیت کو اُجاگر کرنے میں کوشاں ہوئے اور سیاسی بصیرت کے حامل افراد بھی آزادیٔ نفس پر آمادگی کا اظہار کر چکے تھے اور مخزن بھی احساس ندامت و احساس غیرت کو جگانے میں اپنا کردار ادا کر رہا تھا۔ مخزن جدید اسلوب نگاری کے آغاز کا سبب بنا۔ اگرچہ رومانیت کے سوتے تو آزاد کی نظم و نثر سے پھوٹتے ہیں لیکن سرسید کی عقلی و مادی نثر کے حصار کو توڑتے ہوئے مخزن نے رومانوی لہر سے اُردو ادب تو متعارف کرایا۔ مخزن نے ایک طرف تو جمالیاتی اسلوب کی اثر انگیزی سحر انگیزی اور حسن و لطف پر روشنی ڈالی ہے۔ دوسری طرف رومانوی اندازِ فکر نے قوتِ متخیلہ کی گلکاریاں قاری کے ذوق سلیم کے تحریک کا سبب بھی بنتی ہیں۔ ڈاکٹر محمد اشرف خان کی مخزن کے حوالے سے یہ رائے ہے:

> ''مخزن کے اجراء کو اس لیے اُردو میں رومانوی تحریک کا نقطہ آغاز قرار دیا جا سکتا ہے کہ اس اقدام سے ان تمام نئے آثار، رجحانات اور جدید خیالات کو ایک ترجمان اور سٹیج مل گیا جو اُردو ادب میں کچھ عرصے سے فروغ پا رہے تھے۔ مخزن بیک وقت رومانوی تحریک کا محرک ترجمان، پیام بر علم بردار اور مشعل بردار ثابت ہوا۔''[۱]

تحقیق کم سے کم میں زیادہ معلومات فراہم کرنے کے مترادف ہے اور موضوع کی تلاش، انتھک محنت طلب ہے۔ کوشش اور لگن محقق کو نایاب نسخوں کی بازیابی کے لیے مسلسل آمادہ کیے رکھتی ہے۔ ایسے ہی محققوں کی مخزن نہ صرف حوصلہ افزائی کرتا رہا بلکہ مخزن بے نظیر اسلوب کے جلو میں وسیع تحقیقی میدان بھی فراہم کرتا رہا۔ مولوی حبیب الرحمٰن کا تحقیقی مضمون کلیات میر حسن، سید شمس اللہ قادری کا مختصر تحقیقی مضمون ''طوطا کہانی'' رضا علی وحشت کا تحقیقی مضمون ''شیخ علی حزیں'' و دیگر مضامین تحقیقی اسلوب اور تحقیقی مزاج کے حامل ہیں۔ مخزن کا تنقیدی شعور شیخ عبدالقادر کے جدید ذہن کا عکاس ہے اور مخزن کی وساطت سے ہم اس دور کی تنقیدی بصیرت اور ادب فہمی کا بہ خوبی اندازہ کر سکتے ہیں۔ شبلی نعمانی کا مضمون ''شاعری کی حقیقت'' میں شاعری کی ارسطو کے حوالے سے حقیقت اور ماہیت پر روشنی ڈالتے ہوئے شاعری میں محاکات پر بات کی۔

شیخ عبدالقادر کا مضمون ''نظم آزاد'' مولانا محمد حسین آزاد پر خوبصورت تنقید ہے جس میں آزاد کی نظموں کے حوالے سے حسن و قبح پر روشنی ڈالی۔ عبدالحلیم شرر کا مضمون قدیم و جدید شاعری'' خواجہ عبدالرؤف کا مضمون کلام ظفر پر ایک ناقدانہ نظر، شیخ عبدالقادر کا مضمون ''نعت رنگ شاعری'' لیاقت حسین کا مضمون ''ہماری شاعری اور انشا

پردازی" و دیگر ارباب نثر کے تنقیدی مضامین اس بات کے غماز ہیں کہ مخزن کی صحت مند تنقیدی روایت جس پر چے نے اپنائی وہ اپنا ادبی مقام بنانے میں کامیاب ہوا۔ ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ مخزن نے نئی تنقیدی جہت عطا کی جو رومانیت کے ساتھ ساتھ بصیرت افروز بھی تھی اور بے لاگ تبصرے کی جرات بھی رکھتی تھی۔ مخزن کے ادبی مضامین عقلیت و مادیئت سے منحرف ہو کر "ادب لطیف" کا حسین مرقع بن کر اُبھرے۔ جذبے اور تخیل کی آویزش مخزن کا خاصہ ہے۔ رومانوی اندازِ نثر لامتناہی تخیلات کے جلو میں قادری کی سماعت و بصارت کو خوش کن لمحات عطا کرنے کے ساتھ ساتھ بصیرت افروز پیغام سے آشنا بھی کرتا ہے۔ لفظوں کا بہاؤ، ترنم کا لوچ اور تخیل کی پرواز کا ایک طرف تو مصنف کے نکتۂ نظر کو عروج عطا کرتا ہے تو دوسری طرف رومانوی نثر کو براہ راست پیام رسانی سے بھی بچالیتا ہے۔ مخزن کی رومانوی نثر دلنشین ہونے کے ساتھ ساتھ دلسوز و دلنواز بھی ہے۔ سجاد حیدر یلدرم کا نثر پارہ "حضرتِ دل کی سوانح عمری" سجاد کی عاشقانہ فریاد ہے۔ جملوں کی بے ربطگی اور اسلوب کا جوش و ولولہ قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ حسن و عشق اور جدید تقاضے زندگی اور اس کے نشیب و فراز علم و دانش اور انسانی بساط پر سجاد حیدر یلدرم کا یہ نثر پارہ ان کی قلمی مہارت کی ایک عمدہ کوشش ہے اور مخزن اور جدت کا عکاس بھی۔ اپنے عنوان کے رومانوی ہونے کے ساتھ ساتھ لفظوں، جملوں اور خیالات میں جمالیاتی حسن یلدرم نے سمو دیا ہے۔ نثر پارہ ملاحظہ ہو:

> "میری ملہجی آنکھوں کا اُن آنکھوں سے ملنا تھا، کہ سینکڑوں، ہزاروں نثروں کی پے در پے بوچھاڑ پڑنے لگی، مگر آنکھ کو اس وقت عین اس بوچھاڑ کی وقت بھی اپنی بوقیصری پر اصرار تھا۔
>
> یہ تو ہم پر بہتان ہے، تیر و یر کیا، (نکھوں میں آنسو بھر لا کے) ہم کچھ نہیں جانتی" اور ہزاروں تیر برسا دیئے۔"[۴]

مشتاق دہلوی کا مضمون "دی روز امروز و فردا کا قصہ" سرور جہاں آبادی کا "زندگی جاوید پھول" سید علی سجاد کا "فریب جہاں"، سید سرفراز حسین کا مضمون "منظر گورستان"، بشیر احمد کا "سال نو"، ستارہ صبح تنہائی و دیگر مضامین رومانیت کی لہر سے مزین ہیں اور لفظوں کا حسین امتزاج ان نثر پاروں کو مرقع نگاری کا روپ اور لوچ دار لہجہ عطا کرتا ہے۔ مخزن کے نفیس اور مترنم لہجے کی تائید ڈاکٹر عبدالودود یوں کرتے ہیں:

> "مخزن کی "رومانیت"، "ادب لطیف" میں ایک خاص مقام رکھتی ہے۔ اس میں پاکیزہ تحریریں شائع ہوتی تھیں۔ شرر اور دلگداز کی رومانیت کے مقابلے میں مخزن کی رومانیت بلند نظریات کی حامل ہے۔ اس میں شائع ہونے والے مضامین میں خیالات کی پاکیزگی

ہے۔ زندگی کا رجائی نکتہ نظر چھایا ہوا معلوم ہوتا ہے۔"۴

مخزن اور اُردو لازم و ملزوم تھے۔ مخزن اور اُردو کی باہمی رفاقت نے عوام میں اُردو زبان کا ذوق و شوق پیدا کیا مخزن نو مشق مصنفوں کی املائی و زبانی کمزوری کے مالک اشخاص کی حوصلہ افزائی بھی کرتا رہا۔ اُردو زبان کی آبیاری کرنے والا مخزن اس لیے بھی لائق تحسین ہے کہ اگر اس دور میں اُردو زبان پر توجہ نہ دی جاتی اور مخزن میں اُردو زبان کی ترویج و ترقی کے حوالے سے معیار کو اعلیٰ و ارفع نہ بنایا جاتا تو اُردو زبان شاید اتنی جلدی وسعت بیان کے لحاظ سے مقبول و معروف نہ ہوتی۔ انگریز سے متاثر معاشرے میں اُردو کی شمع روشن کرنا یہ عبدالقادر کا ہی حوصلہ تھا اور اس حوصلہ کے ساتھ علم ارباب علم و دانش کا ساتھ بھی مخزن کے لیے آکسیجن ثابت ہوا۔ یوں مخزن ایک خبر، ایک روایت، ایک جدت بن کر اُبھرا اور آنے والے دور کے رسائل کے لیے سنگ میل ثابت ہوا۔ قدسیہ کریم اپنے مقالے "مخزن ایک تحقیقی جائزہ" میں لکھتی ہیں:

> "مخزن کے اجراء کے وقت سر عبدالقادر کے پیش نظر چند اہم باتیں تھیں ایک تو یہ کہ اُردو ہماری قومی اور ملکی زبان ہے اور زبان بھی کسی قوم کے کلچر اور ثقافت کی آئینہ دار ہوتی ہے اور ترقی کے لیے اُردو کو ترقی یافتہ زبانوں کا ہم پلہ ہونا چاہیے اس وقت اُردو ادب کو جو کچھ بھی دیا جا چکا تھا وہ توقع سے کم تھا۔"۴

مخزن میں ترجمہ کی روایت نے بھی جنم لیا اور ترجمہ کیے ہوئے مضامین مخزن میں وسعت علم کا پیش خیمہ ثابت ہوئے۔ جبکہ آگے چل کر دیگر رسائل نے بھی ترجمہ پر غور و فکر کیا۔ مخزن کی پالیسی یہ تھی کہ جو بھی مضامین لکھے جائیں علمی ہو یا معاشرتی، ادبی ہو یا تاریخی اس دور کے مسلمانوں میں شعور و آگہی پیدا کرنے کا سبب بنتے رہیں نیز انسانی صلاحیتوں کو کام میں لانے کا درس بھی عطا کرتے رہے۔ مخزن کے معاون مدیر شیخ محمد اکرام کے مزاحیہ و معلوماتی مضامین قارئینِ مخزن کو علمی دلچسپی کے ساتھ ساتھ ذہنی ترفع بھی عطا کرتے ہیں۔ ٹوپی یا ڈوپٹہ مضامین کی مثال دی جا سکتی ہے۔ اس دور کے ادباء دور کی کوڑی لاتے تھے مخزن کا لکھاری منافقت کے بیج نہیں بوتا تبھی مخزن کی تحریریں زندہ اور متحرک تحریریں نظر آتی ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید مخزن کی جدیدیت کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> "انہوں نے مخزن کے پہلے اداریہ میں تقلیدی رویوں کی مذمت کی، تصنع نگاری کے خلاف آواز اُٹھائی اور ادباء و شعراء کو فطرت کی زبان میں تخلیق کاری کو دی ..... اس نے مروجہ ڈگر سے علیحدہ روش اختیار کی اور جذبے اور تاثیر کو ملکوتی زبان میں پیش کیا تو اس عہد کے بیشتر نئے لکھنے والے مخزن کی طرف راغب ہو گئے۔"۵

رسالہ ''مخزن'' معیاری تھا۔ مضامین معیاری، اسلوب معیاری، اور رفاقت مدیر بھی معیاری اس لیے معیاری وقت کے مطابق میعاری ترسیل نے اس پرچے کی قدر میں بھی اضافہ کیا۔اور آنے والے پرچوں کے لیے مخزن سنگ میل بھی ثابت ہوا۔حسن نظامی کا مضمون ''نقاب اور گھونگھٹ'' میں حسن نظامی لکھتے ہیں:

> ''خود ہمارا جسم نقاب ہی ہماری ظاہری زندگی گھونگھٹ ہی جو نظر باز ہیں۔ پردۂ انقلاب اور حجاب گھونگھٹ اُٹھنے کے متمنی رہتے ہیں اور اُن کی یہ آرزو عوام میں عرفان کہلاتی ہی۔''[۲]

نئے اسلوب کے تحت مختصر مضمون میں لفظوں سے مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے مخزن کا ادبی ذوق کا شہرہ سارے ملک میں پھیل گیا۔مخزن کی کشادہ نظری نے اس رسالے کو چار چاند لگادیئے۔تاریخی مضامین کسی ماہر علم شناس کے تحقیقی ذہن کے تراشے ہوئے قلمی نقوش ہوتے ہیں جو ہر دور اور ہر عہد میں اپنی اہمیت رکھتے ہیں۔مخزن کے تاریخی مضامین حقائق وشواہد کے ساتھ ساتھ رومانوی لب ولہجہ کے عکاس ہیں معیشت کسی بھی قوم کی ترقی میں ریڑھ کی ہڈی کی مانند ہوتی ہے۔مخزن میں بھی ہنر کاری کے حوالے سے اکثر مضامین ملتے ہیں اور دیگر رسائل کی طرح مخزن کے معاشی مضامین اقتصادیات ملک کی نوک پلک سنوارنے میں مددگار ثابت ہوئے۔دینی ومذہبی بھی مخزن میں نظر آتے ہیں۔ایسے مضامین انیسویں صدی کے آغاز کی ضرورت تھے کیونکہ سامراجی قوتیں اپنے ہر حربے کو استعمال کر کے دین اسلام سے مسلمانوں کو گمراہ کرنے کی کوشش میں لگی ہوئی تھی اور ایسے مضامین جن کا آغاز مخزن نے کیا آج بھی امریکہ و طاغوتی طاقتیں اُمۃ مسلمہ اور علمائے دین اسلام پر عتاب نازل کر رہی ہیں اور ایسے مضامین استحکام وایمان کے ساتھ مسلمانوں کی آنکھیں کھولنے کے لیے اہم ہیں۔علامہ اقبال بھی مخزن سے وابستہ ہوئے اور مخزن کے لیے اُن کا پہلا مضمون ''بچوں کی تعلیم وتربیت'' اور قومی زندگی ودیگر مضامین شائع ہوئے۔

مختصر یہ کہ مخزن کے تخلیق کاروں نے ادب کے بدلتے منظر میں صفحہ اول کا کردار ادا کیا اور اسلوبیات کے نئے رنگ سے ادبی دنیا کو متعارف کرایا اور اُردو زبان، ادب اور کلچر کے فروغ کے لیے ایک نیا جہاں تخلیق کیا جس میں شعری زبان میں نثر کا ہاتھ تھام کر سرسید کے اسلوب کے اثرات میں مقید ادبی ماحول کو چھٹکارا دلوانے کی کامیاب جستجو وکوشش کی۔حریت وآزادی اور ضمیر کی آواز بلند کی ذرائع ابلاغ کے ذریعے تعلیم وتربیت، زراعت و صنعت وحرفت تحقیق وتنقید، سماجی، اخلاقی ومعاشرتی، تاریخی وسائنسی، جغرافیائی موضوعات پر کماحقہٗ روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر انور سدید مخزن کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''مخزن کی ادبی عطا سے پورے ایک عہد نے استفادہ کیا اور اسے بیسویں صدی کی ادبی صحافت کا ایک منارۂ نور تسلیم کیا گیا۔''[۳]

زمانہ: رسالہ ''زمانہ'' کا پہلا پرچہ فروری ۱۹۰۳ء میں منظر عام پر آیا۔اس کے مدیر شیو برت لال درمن تھے۔اس کے بعد نومبر ۱۹۰۳ء سے دیا نرائن نگم کی زیر ادارت ''زمانہ'' کانپور سے نکلنے لگا۔

دیر یندر پرشاد سکسینہ بدایونی، ''دیا نرائن نگم اور رسالہ ''زمانہ'' اور ''آزاد'' میں لکھتے ہیں:

> ''رسالہ زمانہ کا سب سے پہلا شمارہ فروری ۱۹۰۳ء میں مطبع قیصری پریس بریلی میں بہ اہتمام داروغہ مہاراج پرشاد منیجر و پبلیشر طبع ہوا تھا۔اس کے سب سے پہلے ایڈیٹر منشی شیو برت لال درمن ایم اے تھے..... ان کی ادارت میں زمانہ ماہ فروری ۱۹۰۳ء سے ماہ اکتوبر ۱۹۰۳ء تک شائع ہوتا رہا۔''۸

فروری ۱۹۰۳ء میں ''زمانہ'' کے شمارے میں ''زمانہ'' مقاصد اور پالیسی کے حوالے سے لکھا ہے۔

دیا نرائن نگم نے نومبر و دسمبر کے مشترکہ شمارے ۱۹۰۳ء سے ادارت سنبھالی اور رسالہ ''زمانہ'' کانپور سے جاری ہونے لگا۔ گویا بریلی سے جو سفر شروع ہوا۔اس نے کانپور آ کر قدم جمائے اور علمی، ادبی، سائنسی، معاشی، لسانی، سماجی، تحقیقی اور تنقیدی مضامین کا سنگ میل بن کر آنے والے رسائل کے لیے معیاری اور اعلیٰ نثر کی راہ دکھائی۔ ''زمانہ'' کا اپنا پریس تھا اور ''زمانہ'' کے حوالے سے دیر یندر پرشاد منشی دیا نرائن نگم کا زمانہ جنوری ۱۹۰۳ء میں رسالہ کی ایڈیٹری کی تبدیلی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''ہم نے اپنی طرف سے زمانہ کو ملک میں مفید اور جامع میگزین بنانے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھیں گے مگر ہماری کوششوں کی کامیابی بہت کچھ اہل ملک کی قدر دانی اور حوصلہ افزائی پر منحصر ہے..... زمانہ محض شاعری اور انشا پردازی کے ساتھ رہن نہ رکھ دیا جائے کیونکہ ملک میں ایسے رسالوں کی ایک کافی تعداد موجود ہے۔ جو زبان اُردو کے لیے عمدہ کام کر رہے ہیں۔ زمانہ میں حتیٰ الوسع ترقی زبان کا خیال لیے ہوئے اصلاح خیالات، درستی مذاق، توسیع معلومات ترقی اتحاد وغیرہ کا زیادہ خصوصیات سے التزام رکھا گیا ہے۔''۹

زمانہ کے مضامین بلند پایہ اور معیاری ہوتے تھے۔نومبر و دسمبر ۱۹۰۳ء میں لکھنے والے اصحاب اہل قلم پروفیسر مرزا محمد جاں، چکسبت، سید محمد ہادی، منشی بھگت رام، منشی کالی چرن تھے۔رسالہ کا حجم ۷۲ صفحات اور اعلیٰ کاغذ کا پرچہ ۵ آنے اور معمولی کاغذ ۴ آنے علاوہ محصول ڈاک تھا۔ زمانہ کے لکھنے والوں میں حصہ اول کے لکھنے والے نذیر احمد، مولوی ذکاء اللہ، حالی، شبلی، مولوی عزیز مرزا، بابو گنگا پرشاد، مادھو رام وکیل شام تھے۔ حصہ دوم کے لکھنے والوں میں منشی نوبت رائے، نظر منشی سورج دائم، اقبال ورما، شرر، چکسبت، نواب جعفر علی اثر، موہن سنگھ دیوانہ، جے آر

رائے، مدحن قادری، حامد اللہ افسر، امرناتھ جھا، وحیدالدین سلیم، علی عباس حسینی و دیگر اکابر ادب شامل ہیں۔ حصہ سوم کے لکھنے والوں میں محمد یحییٰ تنہا، قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی، مرزا عظیم بیگ چغتائی، پنڈت شیونرائن شمیم، سید مقبول حسین، ڈپٹی لال نگم، سید وقار عظیم، احتشام حسین، سلطان حیدر جوشو دیگر احباب شامل ہیں۔ راقم نے زمانہ میں لکھنے والوں کے ادوار کو سیشن کے حوالے سے نہیں بلکہ شخصیات کے حوالے سے تقسیم کیا ہے۔

زمانہ میں لسانی مضامین لکھنے والوں میں سلیم جعفر کا نام بہت اہم ہے انہوں نے ادب، زمانہ وقواعد کے حوالے سے جو مضامین لکھے ان میں لفظ، حرف، فارسی و سنسکرت قواعد کی مطابقت فارسی مصدروں کے قاعدے اُردو کے رسم الخط میں تصاویر بنا کر اُردو کے خط کی ابتدا و ارتقا اور سہل خط کے حوالے سے بات کی ہے۔ لسانی مضامین میں شرر کا مضمون ''ہندوؤں کا تعلق اُردو سے'' خشک ہے۔ اُردو کی ابتدا کے حوالے سے شرر اپنے علمِ تحقیق کے مطابق اُردو کو آرین زبان کہتے ہیں، سامی نہیں۔ لیکن یہ تحقیق محدود تھی اور آگے چل کر شیرانی نے ''پنجاب میں اُردو'' لکھ کر پنجابی کو اُردو کا ماخذ قرار دیا ہے۔ ''حروف والفاظ'' کے حوالے سے سید مقبول حسین کے لسانی مضمون میں لکھا ہے کہ ابتدا سے نفوس مقدسہ کی تحریروں سے کلمات کا اظہار ملتا ہے اور اہل مصر کے ہاں اشکال سے جو ماضی الضمیر بیان کیا جاتا ہے۔ ان کی اشکال دی گئی ہے۔ پھر سنسکرت، چینی، عربی، فارسی کے اختلافات لسانی کو زیر بحث لا کے اُردو کو عربی و سنسکرت ہندی فارسی کے توسل سے مشترک قرار دیا ہے۔

علمی کھوج اور لسانی و تحقیقی مضامین رسالہ ''زمانہ'' کے خاصہ تھے گنگا پرشاد کے مضامین ''اُردو زبان کی ترقی میں ہندوؤں کا حصہ'' اور ''اُردو زبان اور انگریز'' بھی اہم ہیں جبکہ دیا نرائن نگم کا مضمون ''ہندوستانی زبان کی ترقی'' میں ہندی اور اُردو کی رقابت و تنازعات کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ حامد اللہ افسر کا مضمون ''اُردوئے جدید'' تنقیدی مضمون ہے جبکہ ''اُردو زبان اور ہندی الفاظ'' شیام موہن لال کا تحقیقی مضمون ہے جس میں اُردو زبان میں ہندی کے الفاظ کی شمولیت کو تحقیق سے ثابت کیا گیا ہے۔ ''زمانہ'' نے لسانی تحقیق میں اہم کردار ادا کیا ہے اور یہ دیا نرائن نگم ہی کی کوششوں اور دلچسپی کا نتیجہ ہے کہ لسانی تحقیق میں امکانات روشن ہوئے اور ایک تحقیق کی بنیاد پر دوسری تحقیق کی عمارت کھڑی کی گئی اور یوں مزید لسانی بحث آگے چل کر سامنے آئی۔ ڈاکٹر انور سدید اپنی کتاب ''پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ'' ابتدا تا ۱۹۸۸ء میں لکھتے ہیں۔

> ''زمانہ کی ایک عطایہ بھی ہے کہ اس نے اُردو زبان کو ملک کی مقبول زبان اور موثر ذریعہ اظہار کے طور پر قبول کیا ہے اور ہندوؤں کے قریب لانے کی کوشش کی۔''[۱۰]



''زمانہ'' میں جو ادبی مضامین شائع ہوئے وہ علمی، تحقیقی، تنقیدی، مزاحیہ سنجیدہ ہونے کے ساتھ ساتھ زبان کے رچاؤ اور سنجاؤ کو اپنے اندر سموئے نظر آتے ہیں۔ زمانہ میں لکھے گئے تمام ادبی مضامین فعال معاشرے کے فعال اور متحرک شخصیات کے قلم سے نکلی ہوئی وہ تحریریں ہیں جو دائمی ادب کے زمرے میں آتی ہیں اور ماضی کا عصرِ حاضر سے اور حاضرِ حاضر کا مستقبل سے ناطہ جوڑتے ہیں۔

پریم چند ''زمانہ'' کے خاص الخاص لکھنے والوں میں سے تھے اُنہوں نے زمانہ میں کئی ادبی، سیاسی، تعلیمی، سماجی مضامین لکھے۔ پریم چند کے تحقیقی ولسانی، ادبی و تاریخی مضامین کی علمی بصیرت نے ان کو ادیبوں کے جھرمٹ میں سرفہرست رکھا ہوا ہے۔ ''ہنسی'' پر لکھا ہوا پریم چند کا مضمون ''لفریب ہونے کے ساتھ ساتھ سادہ، سہل زبان، میں ادبی چاشنی میں گھلا نظر آتا ہے۔ تحقیقی اسلوب میں ہنسی کی ابتداء اور جانوروں کی حرکات وسکنات کو بھی ہنسی کے زمرے میں پیش کیا ہے۔ پریم چند کا ''کالیداس کی شاعری'' اور ''یوسف زلیخا'' کا تحقیقی وتنقیدی مضمون ہے۔ تنقیدی مضامین دورِ اول سے ہی ''زمانہ'' میں نظر آتے ہیں اور زمانہ کے تنقیدی مضامین لکھنے والے تنقیدی اُصول کے بدلتے تقاضوں سے اپنے مضامین کی نوک پلک بھی سنوارتے رہے۔ پریم چند کی تنقیدی مضامین ان کے ذوقِ سلیم کے ترجمان رہتے۔ ا۔ز۔ لکھنوی کے مضامین مثلاً سعدی، شیرازی، منیر شکوہ آبادی، میر تقی میر، مومن وغیرہ پر جو مضامین زمانہ کی زینت بنے وہ نہ صرف ان شعراء اور موضوع پر مکمل گرفت رکھتے نظر آتے ہیں بلکہ ان کے مضامین تنوع اور وسعت سے لبریز ہیں اور ''زمانہ'' کے عروج میں ستون کا کام دیتے ہیں مضامین کے زبان مدہم اور دلکش سے اور ا۔ز۔ لکھنوی زمانہ کے مستقل لکھنے والوں میں سے تھے۔

''زمانہ'' کے لکھنے والے معتبر ناموں میں سے ایک نام سید وقار عظیم کا بھی ہے۔ جنہوں نے ''سید عبدالولی عزلت'' پر تحقیق مضمون لکھا۔ جبکہ محمد یحییٰ تنہا، کا مضمون دلی کا مسند وفات ہو یا مولوی عبدالحق کا ''ماحول اور اسکا اثر''، عبدالقادر کا ''حالی اور غزل''، سید مسعود و ادیب رضوی کا ''میر انیس کے کلام میں صنعتوں کا استعمال'' یا مقبول میں، وصل گرامی، مالک رام کے تحقیقی معرکے اور جستجو وکھوج، یہ سب نئے تنقیدی زاویوں اور تحقیقی مرحلوں کی ترجمانی کرتے نظر آتے ہیں۔ ''سرسید مرحوم'' الطاف حسین حالی کا مضمون اگست ۱۹۰۶ء میں زمانہ میں شائع ہوا جو سرسید کی برسی سے ایک سال پہلے پڑھا گیا اس مضمون کے آغاز میں حالی لکھتے ہیں:

> ''جس رسم کو ادا کرنے کے لیے آج سب لوگ یہاں جمع ہوئے ہیں یہ اس شخص کی برسی کی تقریب ہے جسے پچاس برس متصل ملک اور قوم کی خیر خواہی اور اسلام کی خدمت گزاری اور باوجود سخت مخالفتوں کے جو مسلمانوں کی طرف سے اخیر دم تک اس کو پیش آتی رہیں وہ

اپنے ارادوں میں نہایت استقلال کے ساتھ ثابت قدم رہا۔۔۔۔۔اور جو مسلمانوں کی بھلائی اور خیر اندیشی کی ابتداء سے باندھا تھا اس کو دم واپسیں تک پورا کرتا رہا میری مراد اس شخص سے ہے جو سرسید احمد خاں مرحوم ہیں اور جن کی وفات کو آج پورے آٹھ برس گزرے ہیں۔"[۱۱]

حالی کا یہ مضمون درد و گداز کے ساتھ ساتھ محبت و احترام میں ڈوبا ہوا ہے اور سرسید کے کاموں کو قلم بند کرنے کے ساتھ ساتھ ادارت کی لہر ان کے ہر لفظ سے ٹپکتی نظر آتی ہے۔ "زمانہ" نے اس مضمون کو شائع کر کے ہندوستان کے لوگوں میں احساس ذمہ داری کو اُجاگر کیا "زمانہ" کے مضامین عوام کے مزاج اور سبھاؤ اور رچاؤ کو اعتماد عطا کرتے تھے۔ سرسید کا مضمون بھی حب الوطنی کی بہترین مثال ہے۔ رسالہ زمانہ کے ادبی مضامین فرد واحد کا مطمع نظر ہی بیان نہیں کرتے بلکہ قارئین کے لیے تحقیق و جستجو اور تنقید و تقابل کے دوراں کرتے ہیں اور ادب جو نباض زندگی سے حقیقت کا ترجمان ہے اس کی آبیاری کرتے نظر آتے ہیں دیا نرائن نگم ایک اعلیٰ ذوق کے حامل شخصیت کے مالک تھے وہ انسان کی صلاحیتوں کا اندازہ بھی لگا لیتے ہیں اور اس کے معترف بھی ہوا کرتے تھے وہ زمانہ سے قدر شناسی بھی کروانا جانتے تھے سال بہ سال زمانہ کی تزئین و آرائش کرنے میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھتے اور گاہ بہ گاہ "زمانہ" کے مصنفین کی حوصلہ افزائی بھی کرتے رہتے۔ زمانہ کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس نے نمبر بھی نکالے مثلاً سرسید نمبر، حالی نمبر، قومی نمبر وغیرہ مالک رام کے مضامین بھی "زمانہ" کی قدر بڑھاتے ہیں اور زمانہ شروع ہی سے نئی جہتوں کا علمبردار رہا اور دیا نرائن نگم اس کی وضع انوکھی اور توجہ طلب بنانے میں مسلسل جدوجہد کرتے رہے۔

ظرافت نگاری کی اُردو ادب میں کمی نہیں بیسویں صدی کے مصنفین کے ہاں ظرافت نگاری اپنے جوبن پر نظر آتی ہے۔ زمانہ نے بھی ظرافت نگاری کو جلا بخشی ہے۔ سید محمد عبد القادر سروری کا مضمون "ادب اور ظرافت نگاری" ہے جس میں ظرافت کے اُردو ادب میں استعمال کی وضاحت کی قاضی احمد میاں جوناگڑھی کا مضمون "انگریزی ادبیات اور ہندوستان" ہے اور مرزا عظیم بیگ چغتائی کا مضمون میری شہسواری بھی فن ظرافت کا اعلیٰ ترین نمونہ ہیں۔ جبکہ "ذخیرہ شکایت" میں سراج لکھنوی نے غزل کے مضامین کی وکالت، پھڑکپن اور مبالغہ و تصنع پر بات کی ہے۔ اُردو زبان کے تحفظ پر "زمانہ" نے عہد ساز کام کیا اور زمانہ میں لفظوں کی اہمیت اور ان کی تصحیح کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ لفظ منتر پر حامد حسن قادری کا مضمون ہے۔ اور لفظ "سہی" پر سلیم جعفر کی تحقیق ہے جبکہ "بھان متی" لفظ کا تجزیہ پروفیسر فدا علی خان نے کیا ہے۔ سائنس کائنات کے سربستہ رازوں کو کھولتی ہے اور توہمات کی دنیا سے انسانوں کو انہیں سچائی اور عدم سچائی ہے اُصولوں پر متعارف کرائی ہے۔ "زمانہ" میں سائنس اور اس کے معلوماتی جدید

سائنسی اور ٹیکنالوجی کے فوائد اور نقصانات پر بحث کرتے ہیں۔عبدالرزاق کانپور کا مضمون ''سائنس کی بربریت'' میں سائنس کے فوائد ونقصان کا احاطہ کیا ہے: لکھتے ہیں:

> ''اب جبکہ سائنس نے یہ ممکن کردکھایا ہے کہ دور دراز کے فاصلے سے انسانی ہلاکت کا سامان مہیا کیا جائے تو کسی ملک کو اس کے مہلک زدہ سے بچانے کی کوشش کرنا فضول ہے۔اس لیے مسیحائی ذرائع کی جنگ سے قوموں کو محفوظ رکھنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ قانوناً اس کی ممانعت کردی جائے۔ایسا نہ کیا گیا تو یورپ اپنے سائنس دانوں کی ایجادات سے خود ہی تباہ ہو جائے گا۔''[۱۲]

پروفیسر مہدی حسن ناصری کا مضمون ''عرب اور سائنس'' تحقیقی مضمون ہے زمانہ میں سائنسی مضامین تحقیق کی خارجی و بیرونی شواہد کو مدِنظر رکھ کر لکھے گئے ہیں عزیز آسیونی کا مضمون ''مچھر'' ہے جس سے مچھر کی ابتدا اور ارتقا پر سائنٹفک وطبعی نظر ڈالی ہے۔معیشت کسی بھی ملک کے اُتار چڑھاؤ میں اہم کردار ادا کرتی ہے اور معاشی مضامین کی بھی قوم کی معیشت کو سہارے کا ذریعہ ہوتے ہیں ''زمانہ'' میں جو معاشی مضامین شائع ہوتے رہے وہ صنعتی وزراعتی مشکلات، مسائل اور ان کے حل وابتداء اور پھر عروج کے حوالے سے بات کرتے اور سمجھاتے نظر آتے ہیں، اقبال بہادر سکسینہ کا مضمون ''سرمایہ کا چلن''، ''روپیہ پیسے کی طاقت''، ''آب پاشی'' ہندوستانی معاشی اقتصادی ترقی و ترسیع میں مددگار معاون ثابت ہوتے ہیں لالہ جپت رائے کا مضمون ''زر'' اور شیخ ضیاء الحق کا مضمون ''مل کے پولیٹیکل مقالے'' فراق کورکھپوری کا مضمون ''کیا ہندوستان خوشحال ہو رہا ہے؟'' بھی اقتصادی پالیسیوں کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔زمانہ دسمبر ۱۹۳۳ء میں ''آپ بیتی'' میں دیانرائن نگم لکھتے ہیں:

> ''آج بھی زمانہ کو ملک کے سبھی چیدہ اہلِ قلم کی فیاضانہ امداد واعانت حاصل ہے۔آج بھی اس کے صفحات ہر قسم کے سنجیدہ مباحث کے لیے اسی کشادہ دلی سے کھلے ہوئے ہیں جیسے کہ تیس سال پہلے۔''[۱۳]

تہذیب وتمدن کسی بھی قوم کے عروج و زوال میں اہم کردار ادا کرتے ہیں اور اگر رسم و رواج میں بگاڑ پیدا ہو جائے تو معاشرہ انتشار زوال کا اشکار ہو جاتا ہے اور اس عدم توازن کا اثر عوام کے مزاج اور اوصاف پر پڑتا ہے رسالہ زمانہ میں جو معاشرت وسماج پر مضامین ملتے ہیں وہ نسلی، مذہبی، سیاسی، معاشرتی، لسانی تعصّبات سے کسی حد تک مبرا ہیں۔ان مضامین کے لکھنے والے لالہ لاجپت رائے، حسن نظامی، حسن عسکری، چاندنی بیگم، گنگا چرن، منوہر لال، جوتشی کے نام شامل ہیں زمانہ کے یہ مضامین سماج کی کھوکھلی جڑوں کی بیخ کنی کرتے اور نئی کونپلوں کو آبیاری

کرتے نظر آتے ہیں۔ کیونکہ اٹھارویں صدی میں کئی تہذیبوں نے برصغیر پاک و ہند پر یلغار کی اور اس تہذیب کے اختلاط سے مثبت و منفی رجحانات نے جنم دیا جن کی عکاسی اور تدارک میں ''زمانہ'' ہے اہم کردار ادا کر رہا تھا۔ ''قوم سرگرمیوں کی روح'' لالہ جپت رائے کا فکریہ مضمون ہے ''عزت کے تول'' حسن نظامی کا اور ''قومیت یا وطنیت'' اختر شیرانی کا مضمون ہے۔ تعلیم کی افادیت اس میں مضمر ہے کہ تعلیم، اخلاق سنوارنے کا درس بھی عطا کرتی ہے۔

''زمانہ'' میں تعلیم کے کئی موضوعات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ زندگی کے ہر پہلو پر زمانہ میں قلم اُٹھایا گیا ہے اور حسن عسکری کا مضمون فلسفہ حسن و جمال میں حسن و جمال کے معیار و توصیف پر بات کی گئی ہے۔ جبکہ مولوی عبد الحق کا مضمون ''پروپیگنڈا'' میں لفظ پروپیگنڈا کے منفی اثرات و رجحات اور رویے پر بات کی ہے آج دنیا ایک گلوبل ویلج سے اور ذرائع ابلاغ کی ترقی نے فاصلوں کو سمیٹ دیا ہے لیکن بیسویں صدی کے آغاز میں فاصلوں نے ملک کی تاریخ اور علمیت سے نا آشنا رکھا ہوا تھا ایسے میں ''زمانہ'' ہمیں مختلف ملکوں کی سیر کراتا ہے اور اکثر مضامین امت پرشاد نگم نے لکھے ہیں لیکن رام چندر، عزیز مرزا، شیونرائن، ہری پرشاد، نذیر احمد خاں، جے آر۔ رامے، مولانا عبد الرزاق کانپوری، سید محمد فاروق چڑیا کوٹی وغیرہ کے مضامین بھی دنیا کے ممالک کے حالات سے باخبر رکھتے ہیں۔

رسالہ ''زمانہ'' کے مضامین شہروں اور مقامات کی بھرپور علمیت کے ساتھ ان کی اہمیت کو واضح بھی کرتے ہیں کشمیر اور سوئٹزرلینڈ پر پنڈت شیونرائن شمیم کے مضامین ہیں جاپان پر امت پرشاد نگم کا مضمون اور نذیر احمد خاں کا مضمون ملتا ہے جبکہ امت پرشاد نگم کا آئرلینڈ اور افغانستان پر مضمون ملتے ہیں۔ تاریخی مضامین بھی زمانہ کی پہچان ہیں اور قلعہ کانجر پر جے آر ٹھاکر کا مضمون ہے یا ورنگل پر سعید احمد قادری کا مضمون ملتا ہے زمانہ کے تاریخی مضامین ٹھوس تاریخی شواہد کے ساتھ ساتھ تاریخی اسلوب میں لکھے گئے ہیں۔ مصوری پر زمانہ کے مضمون نگاروں نے اہم علمی فن پارے تخلیق کیے ہیں۔ پریم چند کا مضمون ''مصوری'' تحقیقی و تنقیدی مضمون ہے۔ جس میں ہندوستانی مصوری کے آغاز و ابتدا پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس دور میں اجنتا کے غاروں کی تصاویر کے حوالے سے پریم چند نقاشوں اور مصوروں کو سراہاتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''یہ تصاویر اس زمانے کی طرزِ معاشرت، آداب و اخلاق اور رسم و رواج کے مسبوط تاریخ ہیں۔ ان تصاویر میں اعضا کا تناسب، انداز کی بے تکلفی اور جذبات کی واقعیت بدرجہ اتم موجود ہے۔ یورپ کے مبصران فن نے چند تصاویر کی دل کھول کر داد دی ہے۔''[۱۴]

جگشیو رناتھ ورما بیتاب کے مضامین ''ازمنہ وسطی میں ہوں'' ''مغل مصوری، راجپوت، مصوری، عصر جدید میں ہندی مصوری، ''تاج محل بنانے والے کون تھے'' بھی فنون لطیفہ کے پرت کھولتے اور مشاہدات زندگی کی عکاسی

کرتے نظر آتے ہیں۔ ''زمانہ'' کے مضامین میں نفس مضمون ٹھوس مدلل اور حقیقی زندگی کے ترجمان نظر آتے ہیں اور خیال کی اعلیٰ سطح کو اسلوب کی ارفع کاوشوں سے مزین کردہ مضامین طویل یا مختصر ہو، ان کی دلچسپی اور اہمیت کم نہیں ہوتی۔ اُردو زبان کے فروغ میں زمانہ کا جو ہاتھ رہا اس کا تذکرہ ہم کر چکے ہیں ''زمانہ اور ترقی اُردو'' سر شیخ عبد القادر کا مضمون ہے جو فروری ۱۹۲۸ء کو زمانہ میں شائع ہوا یہ ایک اہم مضمون ہے۔ یہ مضمون زمانہ کی جشن جوبلی پر لکھا گیا اور زمانہ کو پچیس سال ہوئے تھے اور اس مضمون میں زمانہ کی صلاحیتوں اور خدمات کو سراہتے ہوئے شیخ صاحب لکھتے ہیں:

> ''ادبیات کا چبوترہ ہی وہ چبوترہ ہے جہاں ہندو مسلمان خلوص سے اور بلا تصنع یکجا کھڑے ہو سکتے ہیں اور نگم صاحب کی کوششوں سے اوراق زمانہ پچیس سال سے کم از کم سینکڑوں اہل قلم کے اس ملاپ کی شہادت دے رہے ہیں۔ اسی تفریق اور ضرب اور تقسیم کے زمانے میں جمع کا حساب صرف ادبی رسالوں ہی میں ملتا ہے۔''۱۵

زمانہ میں بے لوث، وفادار اور محنتی اکابرین ادب جلوہ گر ہوتے رہے اور ان کی وضع داری ادبی شائستگی نے زمانہ کے موضوعات کو چار چاند لگا دیئے۔ زمانہ حالات کی مشکلات اور مہنگائی کے باوجود ہر دور میں شائع ہوتا رہا اور اُردو ادب کی خدمت کرتا رہا۔ منشی دیا نرائن نگم پر عبدالرزاق قریشی کا مضمون ہے جس سے وہ لکھتے ہیں:

> ''زمانہ کے چالیس سال کی جلدیں ایسے ایسے بلند پایہ مضامین سے بھری پڑی ہیں جو اُردو زبان کے لیے گراں بہا دولت ہیں۔ ادب کا کوئی سنجیدہ شعبہ ایسا نہ ہوگا جس پر نہایت پر مغز مضامین موجود نہ ہوں۔ ادب، شعر، تاریخ، مذہب، تہذیب و تمدن، مصوری، موسیقی، سنگ تراشی، معاشیات، طبیعات، اثرات، لسانیات، نفسیات، طنزیات، مضحکات، سیاسیات، فلسفہ، اخلاقیات، روحانیات وغیرہ تمام موضوعات پر بڑے بڑے عالموں اور ماہروں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے---- حق یہ ہے کہ ''زمانہ'' نے کیفیت و کمیت دونوں کے اعتبار سے اُردو زبان کی ایسی گراں قدر خدمت انجام دی ہے۔ جس کے بارے میں وہ کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی اور جس سے ہمیشہ آئندہ نسلیں استفادہ کرتی رہیں گی----''۱۶

اُردوئے معلیٰ: حسرت موہانی نے اپنے رسالے ''اُردوئے معلیٰ'' کے ذریعے سیاسی مضامین کی اشاعت سے مسلمانوں میں بیداری و آزادی کی لہر پیدا کی۔ ان کی قیادت نے ''اُردوئے معلیٰ'' جیسے جریدے کو ادبی اُفق کا مایہ ناز جریدہ بنا دیا۔ یکم جولائی ۱۹۰۳ء کو علی گڑھ سے ''اُردو معلیٰ'' کا پہلا پرچہ حسرت نے نکالا یہ ولایتی کاغذ پر حجم ۵۲

صفحہ تقطیع ۲۰×۲۶/۸ تھا۔ مطبع احمد علی گڑھ میں طبع ہوا۔ اوراس مطبع کے مالکان رشید احمد، سعید احمد تھے۔ ''اُردوئے معلیٰ'' کی اشاعت پر اس رسالے کے مندرجہ ذیل اصول وقواعد بنائے گئے:

''۱۔اُردوی معلیٰ ۴۸ صفحوں پر انگریزی مہینے کی پہلی تاریخ کو علی گڑھ سے شائع ہوا کریگا۔

۲۔مضامین نثر ہر قسم کے ہوں گے یعنی سوانحی و تاریخی، علمی (فلسفیانہ) فلسفیانہ، اخلاقی، تمدنی، ادبی، تنقیدی۔

۳۔یہ مضامین نہ حد سے زیادہ خشک ہونگے نہ حد سے زیادہ ہلکے اورانکی ترتیب ایسی ہوگی جو ہر قسم کے مذاق کو گوارہ ہو۔

۴۔نظم ونثر دونوں میں حتی الامکان صحتِ زبان کی سختی کے ساتھ لحاظ رکھا جائیگا۔

۵۔اس رسالہ کا مقصد صرف ایک ہے یعنی درستی مذاق چنانچہ اسی لحاظ سے اُمور مندرجہ ذیل کی پابندی کی جاوگی۔

۶۔اس مقصد اصلی کے علاوہ چند اور ضمنی مقاصد بھی ہیں مثلاً قدر دانی اہل کمال وامداد زبان اردو جو تجویزیں ہمارے ذہن میں ہیں اُن کا اظہار انشاءاللہ تعالیٰ رفتہ رفتہ ہوتا رہیگا۔''[۱۷]

اُردوئے معلیٰ میں ادبی، سائنسی، مذہبی، اخلاقی تنقیدی، تحقیقی اور سیاسی مضامین کی اشاعت ہوتی تھی۔ حسرت موہانی کی سیاسی وادبی شخصیت کا جائزہ لیں تو حسرت نے وارداتِ عشق اور کیفیات قلب کا بھی پاس رکھا اورسیاست وصحافت کو عبادت سمجھ کر ''اُردوئے معلیٰ'' کا چراغ بھی روشن کیا۔ نامساعد حالات کے باوجود حسرت نے جیل کی صعوبتوں کو بھی اپنے آہنی عزم کی بنا پر برداشت کیا، لیکن انگریز کی عیارانہ چالوں پر اپنے جریدے میں ضرب کاری بھی لگاتے رہے۔اس پاداش میں اخبار کی اشاعت بھی متاثر ہوئی لیکن حسرت نے ایک طرف تو صحافتی اخلاق کی پاسداری کی اور دوسری طرف اپنے جریدے سے مسلمانوں کی بیداری کا بھی کام کیا۔اُردوئے معلیٰ کا سیاسی لحاظ سے لہجہ ''باغیانہ'' رہا کیونکہ وہ جان گئے تھے کہ ہندوستان کے باسیوں کی نجات اس میں ہے کہ وہ انگریزوں کی غلامی کا طوق گلے سے اُتار پھینکیں اور جلد آزادی کی فضا میں سانس لیں۔اس بنا پر حسرت نے کسی بھی دباؤ یا ڈر سے ''اُردوئے معلیٰ'' کی پالیسی کو تبدیل نہ کیا۔حسرت نے نڈر اور بیباک انداز بیان اختیار کیا۔ اُردوئے معلیٰ ایک طاقت ور جریدہ تھا۔جس نے لوگوں کو اکٹھا کیا اوران میں سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت بیدار ہوئی اور لوگ غلطیوں، کوتاہیوں اور نادانیوں پر شرمندہ ونادم ہو کر انگریز سامراج کے طاغوتی رویوں کو پہچاننے لگے۔اُردوئے معلیٰ کی پالیسی ہند، مسلم اتحاد، ادب کی پاسداری اور اُردو زبان کے تحفظ پر کسی قسم کا سمجھوتا نہ کرنا تھا۔حسرت موہانی کانگریس سے متاثر تھے اور کانگریس کے لیڈر بال گنگا دھر تلک کی ذات نے حسرت کو اپنا گرویدہ بنالیا تھا۔ سیاسی طور پر حسرت

ہندو مسلم کے اتحاد کے حامی تھے۔اور وہ سمجھتے تھے کہ کانگریس واحد وہ جماعت ہے جو ہندوستان کے مسائل سے بخوبی واقف ہے اوران کا حل بھی نکال سکتی ہے۔سیاسی مضامین کی پہلی کڑی ''مسلمان اور پالٹکیس'' شیخ عبداللہ کا مضمون ہے جوفروری ۱۹۰۴ء میں ''اُردوئے معلیٰ'' کے توسط سے سامنے آتا ہے جومولوی سید غلام جبار صاحب وکیل حیدر آباد کے خط بہ عنوان ''کیا مسلمانوں کو کسی پولیٹیکل ایسوسی ایشن کی ضرورت ہے'' کے جواب میں لکھا گیا اورغور وفکر وتدبر سے مسلمانوں کی شیخ صاحب نے سیاست کی اہمیت بتائی ہے شیخ صاحب لکھتے ہیں:

> ''انسان کی تمدنی زندگی میں سب سے اعلیٰ اور موثر وہ تعلق ہے جو مابین حاکم اورمحکوم کے قائم ہے علمی یا اخلاقی اثرات باعث ترقی ہیں۔لیکن پولیٹیکل اثر باعثِ زندگی ہے۔تمدنی اورشائستہ زندگی کا سب سے پہلا زینہ پولیٹیکل اتحاد ہے۔[۱۸]

''اُردوئے معلیٰ'' شروع سے ہی مسلمانوں کی سیاست میں شمولیت کا پیغام دیتا ہے اور مسلمانوں میں سیاسی بیداری پیدا کرنے کا خواہاں رہا ہے۔حسرت اپنے مضمون ''مسلمان نیشنل کانگریس اور پولیٹیکل ایجیٹیشن'' میں مسلمانوں کی کانگریس میں مشمولیت کا سیاسی فیصلہ بھی سنا دیتے ہیں۔حسرت کہتے ہیں:

> ''آج سے چند ہی سال قبل تک مسلمانوں کی مسلمہ پالیسی یہ تھی کہ ہمکو پالٹکیس میں مطلق حصہ نہ لیکر حکمران قوم کے انصاف پر کامل اعتماد کرنا چاہیے لیکن آج اس قسم کے خیالات کو تعلیم یافتہ مسلمان اپنے نام کے ساتھ منسوب کرنا بھی گوارہ نہ کریں گے۔اس سے کیا ثابت ہوتا ہے؟ یہی کہ جسطرح زمانے نے پہلی حالت کو دوسری حالت میں تبدیل کردیا، اسیطرح سے دوسری حالت کو تیسری اور اس سے بھی بہتر حالت میں ضرور تبدیل کردیگا۔''[۱۹]

''مسلمان اورپالٹکیس'' میں حسرت موہانی ہندوستان ریویو کا ترجمہ کرتے ہوئے کانگریس کی حمایت میں لکھتے ہیں۔حسرت اوران کے رفقا اپنے سیاسی مضامین میں مسلمانوں کو سیاسی ومعاشرتی تحفظ دلانے کی جدوجہد میں مصروف عمل نظر آتے ہیں اور انفرادی و اجتماعی طور پر مسلمانوں کے پست معیار کو بلند کرنے کی مسلسل سعی کرتے ہیں۔حسرت کا سیاسی میدان حیاتِ انسانی کے مسائل سے وابستہ تھا اُردوئے معلیٰ کے سیاسی افکار میں حسرت سیاسی کرب سے گزرتے ہیں اوراسکی روداد سے اُردوئے معلیٰ کو سجاتے ہوئے اپنی ذمہ داری کو بھی نبھاتے ہیں کہ ''اُردوئے معلیٰ'' حریت، سیاست اور علمیت کا نقیب جریدہ ہے۔صحت مند ادب مفلوک الحال انسان کو شعوری و لاشعوری جرأت اظہار عطا کرتا ہے۔اورحقیقت پسندی سے متعارف ہوکر مصنفین ادب عروج وزوال کی داستان رقم

کرتے ہیں۔اُردوئے معلیٰ کے ادبی مضامین حسرت موہانی ضیاء الحسن کاکوروی، سجاد حیدر ریلدرم، محمد فاروق دیوانہ، چکسبت، مولوی ذکا اللہ، اسلم جیراج پوری، سید حیدر طباطبائی، سید احمد رضا خان صاحب، احسن ماہردری، مولانا عیش امرہوی، ابو الکلام آزاد، وصل گرامی جیسے اکابر ادب کے نوک قلم سے تحریر ہوئے۔اُردوئے معلیٰ میں حسرت نے ''تذکرہ اشعراء'' کا سلسلہ شروع کر کے ''کلاسیکی ادب'' کو زندہ کیا۔شاہ حاتم، امانت کی اندر سبھا، سودا، قائم، مومن و دیگر شعرا کے کلام وصفات کا احاطہ کر کے اصلاحی و ادبی رویے کو فروغ دیا اور نامور شعرا کے شاگردان مثلاً شگفتہ، اشرف و دیگر شعراء کو بھی ''اُردوئے معلیٰ'' میں متعارف کرا کے دنیائے ادب کو معیاری اور معتبر شعراء سے روشناس کرایا۔

حسرت نے اپنے ''رسالے'' اُردوئے معلیٰ کے ذریعے تحقیق اور معتبر تحقیق کے امکانات کو روشن کیا اور نو آموز محققین کے لیے تحقیق میں کئی جہتیں واں کیں۔اُردوئے معلیٰ نے شعر و ادب کے حوالے سے تعصّبات کو ہوا نہیں دی اور نہایت اعلیٰ ظرفی سے ہر قلمکار و فن پارے کی قدر متعین کی۔غزل ہو یا فارسی غزل، ''مصنفین اُردوئے معلیٰ'' نے غزل کے مقام اور حیثیت کو نہ صرف تسلیم کیا بلکہ ان کی آبیاری بھی کی۔اُردوئے معلیٰ کی ادبی پالیسی میں موازنہ بھی شامل تھا اور صحت مند موازنہ ادبا و شعرا کی صحت مند قدر متعین کرتے ہیں۔حکیم برہم کا مضمون ''شرر اور سرشار'' میں شرر اور سرشار کی ناول نگاری کا صحت مند موازنہ کیا گیا ہے۔اور شرر کی انشا پردازی کی بنا پر شرر کو سرشار پر فوقیت دی ہے۔مولوی عبدالحق نے ''احسن اللہ خاں بیان'' پر جو تحقیقی مضمون لکھا اس میں احسن اللہ پر تحقیق کے ساتھ ساتھ اُردوئے معلیٰ میں خشک اور سیاسی مضامین کے ساتھ ساتھ کہیں لطیف احساسات سے بھرپور مضامین بھی مل جاتے ہیں۔سجاد حیدر ریلدرم کا نثر پارہ ''ایک مغنیہ کی التجا'' تخیلاتی نثر پارہ ہے جس میں زندگی، محبت، روح و نشاط وغیرہ کے حوالے سے بات کی گئی ہے انشاء کی زبان نہایت پر لطف ہے۔نمونہ نثر ملاحظہ ہو:۔

> ''گا کہ زندگی کیا ہے؟ سنا کہ روح کیا ہے؟ محبت کیا ہے؟ تا کہ میں سمجھوں اپنی اس نازنین روح کے ساتھ جو پھولوں کے خوشبو کی طرح عطر پاش ہے۔''[۲۰]

اُردوئے معلیٰ کی پالیسی میں اُردو زبان'' کی ترقی و ترویج کے لیے تگ و دو کرنا اور کس مصلحت اندازی سے کام نہ لینا بھی شامل تھا۔اُردوئے معلیٰ نے اُردو زبان کی نشو و نما کے لیے بھرپور کام کیا۔صدیقی صاحب کا لسانی مضمون ''غلط اور صحیح اُردو'' کے لکھے جانے کے حوالے سے جو اعتراضات کیے گئے تھے۔ان کا لسانی اسلوب میں جواب دیا ہے۔امداد اثر امام کے لسانی مضامین و دیگر مضامین مثلاً اصلاحِ پنجاب بھی اُردو زبان کے حوالے سے موثر

اور جامع مضامین ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید "پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ" ابتدا تا ۱۹۸۸ء میں لکھتے ہیں:

> "اُردوئے معلیٰ ان کے سیاسی تصورات کا نقیب بھی تھا اور ان کے ادبی خراج کا آئینہ دار بھی۔ چنانچہ اس پرچے میں مولانا کی سیاسی تنقید بھی چھپتی تھی اور قدیم شعراء کے حالات حیات اور ان کے دواین کو بھی نمایاں جگہ ملتی تھی "اُردوئے معلیٰ" نے تنقید میں حق گوئی، بیباکی اور راست فکری کی روایت کو فروغ دیا۔ مولانا حسرت موہانی نے اس رسالے کو سیاسی ادبی تاریخی اور تنقیدی معلومات کا خزینہ بنا دیا۔ اس کا بیشتر حصہ مولانا حسرت خود لکھتے تھے۔ ادبی کتب، رسائل اور گلدستوں پر فنی اور بے لاگ تنقید "اُردوئے معلیٰ" کی ایک نمایاں خصوصیت تھی"[۲۱]

اُردوئے معلیٰ میں نثری مضامین اخلاقی، تمدنی سوانحی و تاریخی بھی نظر آتے ہیں اور اخلاقی مضامین حسرت کے جریدے میں سچی انسانی عزت و حرمت، انسانی ہمدردی انسانی محبتوں، انسانی تہذیب و تمدن اور انسانی ترقی کے خواہاں ہیں۔ "اُردوئے معلیٰ" میں شائع ہونے والے یہ مضامین طبع زاد بھی ہوتے تھے اور ترجمہ بھی مثلاً سید محمد ہادی مچھلی شہری نے رسالہ اسپیکٹر کا ترجمہ ارتقا کی خوبی اور پسندیدگی" کیا ہے۔ "علم سیکھنا اور سیکھنا افسانکی مقتضائے طبیعت ہے۔" ابن خلدون کے مضمون کا ترجمہ ہے جو سید ہدایت الحسن موہانی نے کیا ہے۔ بیسویں صدی کے بدلتے تناظر میں انسانی قدریں پامال ہو چکی تھیں۔ "اُردوئے معلیٰ" نے ان قدروں کے ناقدری کے خلاف آواز اُٹھائی اور مفلوک الحال انسان کو جینے کا ڈھنگ سکھایا۔ مارچ ۱۹۰۴ء میں شائع ہونے والا مضمون "خودغرض اور اسکی وسعت" علی محمود کا مضمون ہے جس میں انسانی مفاد پرستی اور اس کے نتائج پر بھرپور تنقید ملتی ہے۔ اس طرح اگست ستمبر ۱۹۰۵ء میں حبیب اللہ شیروانی کا مضمون "استقلال" میں مصمم ارادے کو کامیابی کا سرچشمہ قرار دیا گیا ہے جبکہ نومبر ۱۹۱۴ء میں محمد مقتدی خاں نے "تقریر و تحریر کا ڈھنگ" مضمون لکھا ہے جس میں تحریر و تقریر کی اہمیت اور اُصول واضح کیے ہیں۔ "خودغرضی اور اسکی وسعت" کا اقتباس ملاحظہ ہو:

> "خودغرضی کے صاف اور سارے معنی اپنے نفع کا خیال ہے۔ مگر یہ خیال نیکی اور ایمانداری سے جس حد تک ہو، اس میں کوئی برائی نہیں، مگر اگر اسکی اُن تدبیروں سے، جس نے وہ اپنے نفع کو حاصل کرتا ہے۔ لوگوں کو دھوکہ، نقصان اور تکلیف پہنچے تو وہ گناہ ہو جاتا ہے۔ اور ایسی ہی تدبیروں پر "خودغرضی" کا پورا اطلاق ہوتا ہے۔ گو اسکی وہ خودغرضیاں کتنی ہی باریک اور پیچیدہ کیوں نہوں۔"[۲۲]

سائنسی و علمی مضامین کی اشاعت کا مقصد ہندوستان کو جدید سائنس اور ٹیکنالوجی سے متعارف کرانا تھا۔

اگست ۱۹۰۳ء میں لطافت حسین کا مضمون ''بیالوجی'' کے ذریعے بیالوجی کے مطالعے اور اسکی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مولوی ذکا اللہ کا مضمون زمین کے حوالے سے پرمغز مضمون ہے۔ ''براہین ثلاثہ'' جو دسمبر ۱۹۰۴ء میں اُردوئے معلی میں شائع ہوا:

> ''مسئلہ ثقل ایسا دقیق مسئلہ ہی کہ جبتک کوئی جید شرقی عالم اس کے جاننے کے دو تین سال تک جدوجہد نہ کرے وہ اس کی تجہ میں کما حقہ ہی۔ جہاں تک مجھی علم ہی تقید میں حکماء اسلام میں سے کسی کو مسئلہ کشش ثقل پر علم نہیں تہا۔ مگر ہاں ایک مسلمان حکیم کا ذہن رسا اس مسئلے پر دور تک پہنچا تہا کہ اسنے یہ بیان کیا کہ اشیاء کو جس قدر اوپر لیجاؤ اُسیقدر اُنکا وزن گھٹتا جاتا ہی۔ یہ بات بیشک مسئلہ کشش سے متعلق ہی۔ مگر وہ یہیں تک پہنچ کر رہگیا آگے نہ چلا۔ اس کا نام مجھے بوجہ پیرانہ سالی یاد نہیں آتا اور کاہلی کتابوں میں تلاش نہیں کرنے دیتی''[۲۳]

عبدالغفار صاحب کا مضمون لٹریچر اور سائنس، عبدالغنی صاحب کا مضمون ''تاروپیڈ'' اور مولوی عبد اللہ کا مضمون ''علم الجبل'' مسلمانوں اور خاص کر اہل عرب کی ایجادات پر روشنی ڈالتا ہے فراہم کرتے ہیں۔ اسلم جیراج پوری کا مضمون ''جغرافیہ اور اہل عرب'' ایک تحقیقی مضمون ہے جس میں اہل عرب اور مسلمانوں کا جغرافیہ پر جو کام کیا گیا ہے اس پر تفصیلی ہوا وفراہم کیا گیا ہے۔ اُردوئے معلی ایک سیاسی جریدہ تھا اور سیاست اور معیشت لازم وملزوم ہیں۔ اُردوئے معلی میں معاشی مضامین ہندوستان کی معاشی حالات کے بھرپور عکس اپنی عوام کو دکھاتے ہیں۔ قاضی تلمذ حسین کا مضمون ''تجارت ہند'' میں انگریزوں کے مال کے بائیکاٹ کا تذکرہ کیا گیا ہے اور فیاض علی شاہ کا مضمون ''زمینداران ہندوستان کے موجوں حالت اور انکا افلاس'' بھی اہم مضمون ہے۔

مختصراً کہہ سکتے ہیں کہ حسرت موہانی کی ولولہ انگیز قیادت میں اُردوئے معلی نے علمی، ادبی سیاسی، اخلاقی رویوں کی نہ صرف بھرپور عکاسی کی بلکہ ہندوستان نے رہنے والوں کو متحد رہنے کا درس بھی دیا اور انگریز کے استحصالی رویے پر کڑی تنقید بھی کی۔ اُردوئے معلی میں ادب عالیہ کی شمولیت نے تحقیقی خراج کے معیار کو بلند تر کیا اور سماجی علوم سے انسانی نبض پر ہاتھ رکھ کر کردار سازی کے عمل سے گزرے اور سائنسی علوم کی پیش رفت نے جدید ٹیکنالوجی سے متعارف کرایا۔ حسرت اور ''اُردوئے معلی'' بیسویں صدی کے نقیب بھی ہیں اور خطیب بھی، معلم بھی ہیں اور رہبر بھی جو رہزنوں کے خلاف کلمہ حق بھی کہتے ہیں۔ دارورسن کو گلے سے لگاتے بھی ہیں۔ اور بے باک صحافت سے انگریز سامراج کو جھکنے پر مجبور بھی کردیتے ہیں۔

الناظر: الناظر ظفر الملک علوی صاحب نے لکھنو سے دفتر: رسالہ الناظر فلاور لکھنو سے نکالا اور اسکی تصدیق خود ایڈیٹر صاحب جولائی ۱۹۰۹ء میں نکالا یوں کرتے ہیں:

> "ایک خوابیدہ گروہ کو بیدار کرنے اور ایک محسوس ضرورت کو رفع کرنے کے لیے رسالہ الناظر کے اجراء کی ہمت کی جاتی ہی اور اگر ہماری امیدون کے مطابق پبلک نے ہمارے مساعی کی قدر کر کے ہماری عزت افزائی کی اور مساعدت زمانہ نے ہماری کشتی کو ناگہانی و اتفاقی حادثات اور غیر معمولی و خلاف توقع سانحات کی بلاخیز اور تہہ کن موجون کے تھپیڑون سے بچا لیا تو عجب نہین کہ ہم کامیابی کے ساحل سے ہوتے ہوئے مقاصد کے دور دراز بندرگاہون تک پہنچکر گوہر مراد حاصل کر کے اُردو کی خدمگزاری کا فخر حاصل کرلین۔"[۲۴]

الناظر علمی وادبی رسالہ تھا اور اس جریدے کو اپنے دور کے معروف و مشہور قلم کاروں کا تعاون حاصل تھا۔ علمی وادبی رسالہ ہونے کے ساتھ ساتھ عورتوں کے علمی ذوق کو نکھارنے کا فریضہ بھی "الناظر" سرانجام دے رہا تھا۔ الناظر کے لکھنے والوں میں منشی احسان علی فصیح، مفتی محمد انوار الحق، مولوی ضیاء احمد رضا، حامد حسن قادری، نذیر احمد علیگڑھ، عطیہ فیضی، سید علی حیدر طباطبائی، پنڈت نرائن شمیم، مولوی محمد یحیٰ تنہا، خواجہ عبد الروف عشرت، سلطان حیدر جوش، قاضی احمد جونا گڑھی، سید مسعود حسن ادیب، مولوی عبد الماجد دریا آبادی، مولوی عنایت اللہ، رشید احمد صدیقی، مرزا فرحت اللہ بیگ، مقبول حسن علی عباس حسینی، محمد اجمل، نور الحسن ہاشمی، مرزا محمد عسکری، وقار عظیم جیسے نامور نثر نگار شامل تھے۔ الناظر کسی حد تک علمی و تاریخی جریدہ تھا اور الناظر کے علمی و سائنسی مضامین پر اکتاہٹ کے الزام کے ساتھ ساتھ مذہبی مضامین پر بحث و مناظرہ کا الزام لگایا گیا لیکن الناظر کی پالیسی کے حوالے سے خود اگست ۱۹۲۵ء میں ایڈیٹر صاحب لکھتے ہیں:

> "الناظر یقیناً علمی وادبی رسالہ تھا، ہے اور انشاء اللہ رہیگا۔ مذہبی تبلیغ اور سیاسی مناظرہ اسکے دائرہ عمل میں نہ کبھی داخل تھا اور نہ اب ہے۔ لیکن وہ مذہب سیاست کو خیر ممنوعہ بھی نہیں تصور کرتا ہے۔"[۲۵]

علم انسانی خیالات میں ترفع پیدا کرتا ہے اور تربیت و تہذیب میں مددگار و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ الناظر کے علمی وفلسفیانہ و سائنسی مضمون ایک طرف تو معلومات فراہم کرتے ہیں اور دوسری طرف حسن عمل سے بھی آشنا کرتے ہیں۔ الناظر میں دین اسلام، عقلیت اور فلسفہ، وجدان پر بھی مضامین شائع ہوتے تھے۔ حامد حسن قادری

کا مضمون ''فن طبابت و جراحی مصر قدیم میں'' ہے۔

''الناظر'' ادبی سے زیادہ تاریخی و علمی جریدہ تھا۔اور اسلامی تاریخ و تاریخی شخصیات کی سوانح اور کارناموں پر الناظر میں روشنی ڈالی جاتی تھی۔ ''معتصم باللہ'' محمد حسین رنگین صدیقی نے لکھا ہے اس کے سوانحی کارناموں پر تاریخی لب ولہجہ میں بات کی ہے اور تاریخی روایات وشواہد سے مزین ہے۔نثر پارملاحظہ ہو:

> ''معتصم سخن گو ہونے کے علاوہ سخن فہمی میں بھی کمال رکھتا تھا اور ہارون رشید کی طرح اس کے دروازے پر بھی شعراء کا جمگھٹ ہوا کرتا تھا۔''۲۶

علمی مضامین میں ''شہرت و ناموری'' نذیر احمد علیگ کا مضمون ہے ''عورت کی عزت'' مسٹر امیر احمد علوی کا معاشرتی مضمون ہے جس میں عورت کی بقا اسکی حیا اور عصمت میں پوشیدہ بتائی ہے۔ضیا الدین برنی ''فلسفہ قوت اداری'' ہے اور اسکی خاص بات یہ ہے کہ اگست ۱۹۱۲ء میں شائع ہونے والے مضمون کو علامہ اقبال کی نذر مطالعہ کرنے کے لیے لکھا گیا ہے۔یہ علمی اصطلاحات سے بھرپور ایک جامع مضمون سے لکھتے ہیں:

> ''وہ لوگ جنکی قوت ارادی نسبتاً طاقتور ہے،ایسے اشخاص دنیا میں عام طور پر کامیاب نظر آتے ہیں۔سوسائٹی کے لیے ان کا وجود بہت غنیمت ہی۔سوسائٹی کی باگ ہی ان لوگوں کے ہاتھ مین ہونی چاہیے جو اپنی مرضی کے مالک ہیں۔''۲۷

نیکی اور بدی یا عذاب وثواب سید احمد دہلوی کا معاشرتی مضمون ہے جس میں انسانی کردار کے وصف کو اعلیٰ صفات کا حامل بنانے کا موضوع ہے۔ترجمہ کسی بھی زبان کی نشوونما میں اہم کردار ادا کرتا ہے اور ترجمے کے ذریعے جہاں علم کی توقیر بڑھتی ہے وہاں علوم وفنون ذہنوں کو جلا بخشتے ہیں۔''الناظر'' میں بھی مضامین ترجمہ کیے گئے ہیں۔ الناظر میں خواتین کی جو اہمیت دی گئی اور اُن کے علمی ذوق کو سراہا گیا۔بیگم صفدر علی کا مضمون ''آزادی'' اگست ۱۹۰۹ء میں خواتین کی آزادی کے حوالے سے آزادی کے صحیح مفہوم و معنی سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ خواتین بیسویں صدی کے آغاز میں نئی نئی آزادی کے مفہوم سے آشنا ہو رہی تھی آزادی کے حدود اور مفہوم پر ایک مدلل مضمون ہے۔جبکہ عطیہ فیضی کا مضمون ''مدرسہ النسواں'' ہے ستمبر ۱۹۰۹ء میں شائع ہوا اور جس میں عورتوں کے دارالمطالعہ کے قیام اور عمارت کے نقشہ کے حوالے سے بیان کی گئی ہے۔عطیہ فیضی لکھتی ہیں:

> ''مدرسے اور دارالاقامۃ کی عمارتیں اس ترکیب سے بنائی اور آراستہ کیجائیں کہ وہ تمام ضروریات جو مذکورہ الصدر مضامین سے متعلق ہوں باحسن وجوہ پوری ہوسکیں۔''۲۸

معاشی بدحالی ہندوستان کے باسیوں کے لیے عذاب مسلسل رہی اور اس دور کے رسائل میں معاشی

بحرانوں کا تذکرہ جابجا ملتا ہے۔الناظر کے معاشی مضامین ہندوستان میں کساد بازاری اور معاشی مسائل پر ہیں۔ مثلاً ''تجارت'' ابوالحسن لہٰ آبادی کا مضمون ہے جس میں مسلمانوں کے تجارتی عروج و زوال کی داستان رقم ہے۔ نورالرحمٰن کا مضمون ''ہندوستانی مفلسی کے اسباب اور اس کے دافعیہ کی تدابیر'' میں زراعت، صنعت وحرفت کے حوالے سے پیش رفعت نہ ہونے پر ہندوستانیوں کا تجارت میں خسارہ اور تعلیمی فقدان کا تذکرہ ہے۔ادب جذبات و احساسات کے اظہار کا نام ہے لیکن ان کے لیے ادیب وشاعر تشبیہات واستعارات سے کام لیتے ہیں کبھی کبھی فصاحت وبلاغت کے بھی جوہر دکھاتے ہیں۔گویا ادب حقیقت کا ایسا ترجمان ہے جو حقیقت کو فصیح الفاظ میں پروکر قاری وسامع تک پہنچاتا ہے۔الناظر میں ادبی مضامین کی بہتات نہیں ہے لیکن جو بھی ادبی مضامین الناظر کی زینت بنے ہیں وہ ایک طرف تو کلاسیکی ادب کو زندہ رکھنے میں مددگار ومعاون ثابت ہوتے ہیں اور دوسری طرف اُردو زبان کی وسعت وترویج کا سبب بنتے ہیں۔احمد علی شوق قدوائی کا مضمون ''اُردو کا علم وادب'' ہے جبکہ سید تفضل حسین نازؔ کا مضمون ''اُصول تنقید'' ادب عالیہ کو کسوٹی پر پرکھنے اور تنقیدی شعور اور تخلیقی تنقید پر عمدہ مضمون ہے۔بیسویں صدی کے پس منظر میں ادبی اقدار کو جدید تحقیق کے مطابق زندہ رکھنے میں دیگر رسائل کی طرح الناظر نے بھی حصہ لیا ہے۔ مولوی سید مظہر علیم کا تحقیقی مضمون ''اُردو کا سب سے پہلا شاعر کون ہے'' میں اُردو کی ابتداء کب ہوئی اور پھر اُردو شاعری کی کھوج، ابتداء کا جائزہ لے کر بابا فرید شکر گنج بخش کی نظم کو قرار دیا ہے اور اسکی مثال بھی دی ہے۔

وقتِ سحر وقتِ مناجات ہے
خیز دراں وقت کہ برکات ہے

پھر شیرانی نے جو تحقیق کی ہے اس کا حوالہ بھی دیا ہے اور امیر خسرو کے کلام میں خالص ہندی اور کچھ ہندی فارسی کا ملا رجحان ہے اور سلطان قلی قطب شاہ، وجہی، وجدی وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے۔الناظر میں تحقیقی وتنقیدی مضامین محمد یحییٰ تنہا، فرحت اللہ بیگ، عبدالماجد دریا آبادی، رشید احمد صدیقی وقار عظیم و دیگر اکابرین ادب کے ہیں ''نالج''، تسلیم، ذوق پر محمد یحییٰ تنہا نے مضامین لکھے اور حالی کے سوانح وکلام پر تبصرہ کیا ہے اور ولی کے کلام کا تنقیدی جائزہ بھی لیا ہے۔محمد یحییٰ تنہا کا مضمون سے رشید احمد صدیقی کا مزاحیہ مضمون ''شیطان کی آنت'' ہے جبکہ رشید احمد صدیقی کا سنجیدہ مضمون ''خلط مبحث'' ہے۔مرزا فرحت اللہ بیگ کا مضمون ''۱۲۶۱ھ میں دہلی کا ایک مشاعرہ'' فرحت کی پہلی کاوش کی صورت میں الناظر میں جلوہ گر ہوتا ہے اور اسلوب وموضوع کے اعتبار سے یہ مضمون ادب کا شاہکار ہے۔لسانی مضامین کے ذریعے ''الناظر'' نے اُردو زبان کی پیروی کی اور ''زبانِ اُردو کی بیکسی اور بے وارثی'' میں

احسان علی فصیح نے اُردو زبان میں اغلاط کا حوالہ دیا ہے مثلاً ایک اخبار میں نئی اُپج لکھا تھا جبکہ ''اُپج'' ہونا چاہیے۔ روزمرہ اور محاورات کے بگاڑ اور انگریزی الفاظ کی ملاوٹ کی تباہ کاریوں پر لکھتے ہیں:

> ''کچھ اپنا روزمرہ اور محاورات بگاڑ کے اور کچھ انگریزی الفاظ و محاورات ملا کے زبان اُردو کو تباہ کیا اور کر رہے ہیں۔ اب تو یہ حالت ہے کہ نثر کا کیا ذکر نظم اُردو میں بھی انگریزی الفاظ و محاورات شریک تھے۔''۲۹

محمد مسلم عظیم آبادی کا مضمون ''اصطلاحات علمیہ'' میں مصطلحات علمیہ کی اہمیت وضوابط پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ مولوی عبدالحق کی رائے دی ہے کہ پہلے مصطلحات علمیہ مدون ہوں پھر علوم وفنون پر کتابیں لکھوائی جاتیں ہیں۔ دربار اودھ کے چند تاریخی مرقعے بھی تحقیقی مضمون ہے جو آوازِ بازگشت نے لکھا ہے جبکہ ''اُردو کی نثر'' سید مقبول احمد کا اُردو کی ابتداء وارتقا پر پُرکشش روشنی ڈالی ہے جبکہ ''اُردو نثر میں فارسی ترکیبیں'' سید مسعود حسین ادیب کا لسانی مضمون ہے جس میں تحقیق سے فارسی ترکیبوں کا اُردو میں مستعمل ہونے پر قواعد واصول بیان کیے ہیں۔ مارچ ۱۹۳۵ء میں وقار عظیم کا مضمون ''افسانہ اور اس کی فنی ترتیب'' سامنے آتا ہے۔ الناظر پر اکثر اعتراضات بھی ہوا کرتے تھے اور اسکے اکثر مضامین کو متنازعہ بھی قرار دیا جاتا تھا۔ اور الناظر جریدے پر خشک اور اکتاہٹ پیدا کرنا، جریدے کا الزام بھی تھا لیکن الناظر جو کہ کسی حد تک علمی و تاریخی جریدہ تھا ادبی مضامین بھی اس میں اعلیٰ پائے کے ہوتے تھے اور تاریخ اسلام پر مبنی مضامین بھی الناظر کی زینت بنے۔ مغربی ادبا و شعرا پر بھی معلوماتی مضامین ''الناظر'' کے ذریعے قارئین ادب کو معلومات فراہم کرتے تھے۔ جیسے ''رابرٹ براوننگ'' اعظم کریوں کا مختصر تعارف رابرٹ براوننگ کا ہے۔ اسکا آغاز کتنا مختصر مگر جامع ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''رابرٹ براوننگ وکٹوریہ کے آخری دور کے مشاہیر شعراء میں گزرا ہے۔ آج کل انگلینڈ میں بعض نقاد براؤننگ کو تمام انگریزی شعرا میں سب سے زیادہ مانتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ براؤننگ کو اب تک لوگوں نے اچھی طرح سے سمجھا ہی نہیں لیکن وہ زمانہ قریب ہے جب لوگ اسے لارڈ ٹینسن سے بھی بلند مقام پر جگہ دینے کے لیے مجبور ہوں گے۔''۳۰

الناظر کو مالی و سیاسی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا لیکن پھر بھی مدیر ظفر الملک نے حوصلہ اور استقامت کے ساتھ اس رسالے کو چلایا لیکن ۱۹۳۷ء میں الناظر میدان ادب کے منظر نامے سے ہٹ جاتا ہے آج بھی یہ رسالہ اپنی قدر و قیمت کی بنا پر دنیائے ادب میں ایک اہم رسالے کی حیثیت رکھتا ہے۔

معارف: سید سلیمان ندوی نے جولائی ۱۹۱۶ء کو دارالمصنفین سے ایک جریدے کا آغاز کیا، اس جدیدے کا

نام ''معارف'' تھا۔معارف ہر ماہ کی پندرہ تاریخ کو نکلتا تھا۔اس کے اغراض و مقاصد مندرجہ ذیل تھے:

> ''فلسفہ حال کے اصول اور اس کا معتد بہ حصہ پبلک میں لایا جائے عقائد اسلام کو دلائل عقلی سے ثابت کیا جائے، علوم قدیمہ کو جدید طرز پر از سر نو ترتیب دیا جائے، علوم اسلامی کی تاریخ لکھی جائے، اور بتایا جائے کہ اصل حصہ کہاں تک تھا اور مسلمانوں نے اس پر کیا اضافہ کیا، علوم مذہبی کی تدوین اور اس کے عہد بعید کی ترقیوں کی تاریخ ترتیب دیجائے، اکابر سلف کی سوانح عمریاں لکھی جائیں جن میں زیادہ تر اُنکے مجتہدات اور ایجادات سے بحث ہو، عربی زبان کی نادر الفن اور کمیاب کتابوں پر دیبو لکھا جائے۔اور دیکھا جائے کہ ان خزانوں میں ہمارے اسلاف نے کیا کیا زر و جواہر امانت رکھے ہیں اور سب سے آخر لیکن سب سے اول یہ ہی کہ قرآن کے متعلق عقلی، ادبی، تاریخی، تمدنی اور اخلاقی مباحث جو پیدا ہو گئے ہیں اُن پر محققانہ مضامین شائع کیے جائیں۔''[۳۱]

معارف ایک علمی جریدہ تھا اس لیے جلد ہی دینی و علمی طبقات میں اس رسالے کو مقبولیت عام حاصل ہوئی۔ معارف میں شائع ہونے والے مضامین میں تنوع، جدت اور وسعت تھی اور دینی و علمی مضامین ہونے کی بنا پر یہ مضامین قارئین ادب کے تزکیہ نفس بھی کرتے ہیں اور اخلاقی تربیت و تطہیر ان مضامین کا خاصہ ہیں۔تحقیق و تنقید معارف کے مضامین کی بنیاد ہے اور منطق ماخذ، آگہی، افادیت، ابلاغ، فلسفہ، علم و عرفان ان مضامین میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ معارف ''جہاں قدیم اسلامی روایت کا عکاسی ہے وہاں اپنے دور کی نوجوان نسل کو بھی دینی و علمی تعلیمات سے بہرہ ور کرتا رہا۔خلیق انجم جولائی ۱۹۲۸ء کے حوالے سے سید سلیمان ندوی کی رائے لکھتے ہیں:

> ''معارف کا مطمع نظر کیا ہے؟ لفظی اور معنوی ہر حیثیت سے اعتدال، مضامین میں ادبیت بھی ہو مطبقت بھی تحقیق و کاوش بھی ہو اور حسن و لطافت بھی مشرقیت بھی ہو اور مغربیت بھی، جدت بھی ہو اور قیامت بھی، فلسفیت بھی ہو اور مذہبیت بھی، عقلیت بھی اور نقلیت بھی۔''[۳۲]

''معارف'' کے عام لکھنے والوں میں سید سلیمان ندوی، عبد اسلام ندوی، پروفیسر عبد القادر، صاحبزادہ ظفر حسن خاں، پروفیسر سید نواب علی، مولانا اہم حمید الدین، سعید انصاری، سید مناظر احسن گیلانی، ابو القاسم سرمد، سید حسن برنی، مولوی سید نجیب اشرف ندوی، مولوی محمد محفوظ الحق، سید مقبول احمد، حامد حسن قادری، صوفی تبسم، غلام مصطفٰے، مقصد ولی الرحمٰن، مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی، قاضی احمد میاں جوناگڑھی، غلام مصطفٰے خاں شامل ہیں۔ ''معارف'' نے قرآن مجید کی فضلیت اور اہمیت سے قارئین ادب اور خاص کر نوجوان نسل کو متعارف کرانے میں اہم

کردار ادا کیا۔ معارف نے تحقیق سے ثابت کیا کہ قرآن مجید سے مستفید ہو کر ہی مسلمانوں نے علمی و سائنسی کامیابیاں حاصل کیں اور اخلاقی اور روحانی تربیت بھی کلام پر عمل پیرا ہو کر مسلمانوں نے حاصل کیں۔

انیسویں صدی علوم وفنون کے جدید اور روشن دور کی صدی تھی۔ وہاں مغربی تہذیب کی چکاچوند سے نوجوان نسل کے گمراہ ہونے کی بہت حد تک مواقع میسر تھے۔ ''معارف'' کے ذریعے سید سلیمان ندوی نے قرآن پاک کے موضوعات اور نبی آخر الزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی حیات طیبہ کے درخشاں پہلو کا احاطہ کر کے نوجوانوں کو یہ باور کرایا کہ جدید علوم قرآن مجید فرقان مجید ہی دین منبع ہے۔ یہ کتاب اُم الکتاب ہے۔ اور نبی آخر الزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سیرت واخلاق حسنہ پر ہی کاربند رہ کر ہم ترقی کی منزل طے کر سکتے ہیں۔ ''معارف'' کے یہ مقالات تحقیقِ جانفشانی کے متقاضی تھے۔ اسی لیے تحقیق وجستجو سے قرآن وسنت کے ہر ہر پہلو پر ان مضامین میں روشنی ڈالی گئی، یوں ہندوستان نے باسیوں اور خاص کو نئی نسل کو صراط مستقیم کا راستہ دکھانے میں ''معارف'' نے اپنا کردار احسن طریق سے نبھایا ہے۔ مثلاً ''معارف'' میں عمارات کے حوالے سے سب سے پہلے مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر قسط وار مضمون ''حریم قدس'' عبدالسلام ندوی کا مضمون ہے اور عمارات الاسلام کے حوالے سے عبدالسلام ندوی لکھتے ہیں:

> ''ڈاکٹر لیبان جو تمدنی تاریخ کا عالم خصوصی ہے، اپنی کتاب سر تطور الامم میں لکھتا ہے: ''یہ پتھر کی کتابیں (یعنی عمارتیں) تمام دنیا کی کتابوں سے زیادہ صاف، واضح اور آسان ہیں اور انکی زبان کبھی دروغ گوئی سے آلودہ نہیں ہوتی۔
>
> اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ معارف میں عمارات الاسلام کا ایک مستقل باب قائم کیا جائے جس کے سلسلہ میں اسلامی عمارت پر محققانہ مضامین شائع ہوتے ہیں۔
>
> اسلام میں تمدن وتہذیب کا سنگ بنیاد مذہب نے رکھا اس لیے نہ صرف تبرکاً وتیمناً بلکہ تاریخی حیثیت سے بھی انکی ابتداء مسجد نبوی سے کرتے ہیں۔''[۳۳]

نوجوان نسل جو مغربیت سے متاثر تھی اُن کے لیے غیر مسلم تاریخ دان کی مثال سے بھی عمارات کی گواہی کو معتبر قرار دے دیا ہے۔ مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد میں روشنی کا حسین انتظام کیا ہوا تھا۔ اس کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''اگرچہ خود رسول اللہ صلعم کے گھر میں فقر وافلاس کی وجہ سے چراغ نہیں جلتا تھا تاہم خدا کے گھر میں کیونکر اندھیرا رہ سکتا تھا؟ صحابہؓ کرام کھجور کی شاخوں کی مشعل بنا کر لاتے تھے اور مسجد میں روشنی کرتے تھے مدت تک یہ حالت رہی۔ اس کے بعد حضرت تمیمؓ کا ایک

تجارت پیشہ غلام جس کا نام فتح تھا زیتون کا تیل اور قندیل لایا اور مسجد میں روشنی کی آپ نے دیکھا تو فرمایا کس نے یہ روشنی کی ہے؟ غلام کا نام معلوم ہوا تو اس کا نام بدل کر سراج رکھدیا جسکے معنی چراغ جلانے والے کے ہیں۔"۳۴

عبد الماجد کا مضمون تشکیک اور مذہب، عبد السلام ندوی کا مضمون "عباسیہ اور اشاعت اسلام" حسن برنی کا مضمون "ہندوستان کے ایک قدیم محدث اور ادیب" سلیمان ندوی کا "سنت" مولوی ابو اعلیٰ صاحب مودودی کا مضمون "لباس کا مسئلہ" عبد الماجد دریا آبادی کا اسلام اور امن و دیگر دینی موضوعات علم و آگاہی کے ساتھ ساتھ ایک وضع نصب العین بھی مسلم نوجوانِ ہندوستان کو عطا کرتے ہیں۔ "معارف" میں ایک سلسلہ مضامین مشاہیر اسلام شخصیات اور اُن کے کارہائے نمایاں کا تھا۔ محققین معارف اپنے مضامین میں ان شخصیات کے تعارف اور خداداد صلاحیتوں پر محققانہ بحث کر کے ایک طرف تو مسلمانوں کے لازوال کردار کا عکس دکھاتے اور دوسری طرف ان مشاہیر اسلام شخصیات کے بارے میں جو بھی غلط فہمیاں اور پروپیگنڈے مشہور تھے ان کی وضاحت کر کے اصل صورت حال سے قاصر عوام الناس کو مطلع کرتے تھے۔ سعید انصاری کا مضمون حکیم ابن زکریا رازی ہیں سعید انصاری رازی کے حوالے سے یہ انکشاف کرتے ہیں:

"چیچک کی ابتدائی وجود کی سب سے معتبر شہادت اُس بیان میں موجود ہے جو نویں صدی عیسوی کے ایک عرب طبیب رازی نے لکھا ہے۔ جس نے صرف طریقہ سے بیان کی، اور اس کا طریقہ علاج بتایا اور اسکے لیے ہدایتیں دیں۔"۳۵

مولوی اقبال احمد کا مضمون، سلطان صلاح الدین، سید سلیمان ندوی کا مضمون، مولانا حمید الدین، سید حبیب الرحمٰن شروانی کا مضمون قاری عبد الرحمٰن محدث، مولوی شاہ معین الدین کا مضمون حضرت ابو ہریرہؓ، ہماریوں کا علمی ذوق، اکبر کا علمی ذوق، جہانگیر کا علمی ذوق، سید صباح عبد الرحمٰن کے مضامین میں شاہ معین الدین احمد ندوی کا مضمون "تابعین اور ان کے علمی کارنامے"، مولانا سید مناظر احسن کا مضمون مولانا معین الدین اجمیریؒ اور سید وحید احمد ندوی کا مضمون جابر بن حیان و دیگر مضامین نامور مسلم شخصیات پر لکھے گئے ہیں تا کہ نوجوان نسل ان کے فیض و برکات اور کارہائے نمایاں سے مستفید ہو سکے اور اسلامی تاریخی روایت اور شخصیات سے آگاہی حاصل کر سکے۔ "معارف" کے محققین نے دنیائے اسلام کے ساتھ ساتھ دنیائے ادب پر بھی نظر کی اور قدیم نسخوں کی بازیابی فن تحقیق کے مروجہ اُصولوں کے تحت کر کے اُردو ادب کو قیمتی اور نایاب نسخے فراہم کیے۔ اس کے علاوہ یورپ اور ہندوستان کے کتب خانوں کا تعارف بھی معارف کا اہم تحقیقی کام ہے جس سے اس دور کے نوآموز محققین کے لیے

تلاش و جستجو کے نئے امکانات روشن ہوئے ہم یہاں چند تحقیقی کاوشوں کا حوالہ دیں گے۔مولانا عبد السلام ندوی کا مضمون ''اشرف علیخان فغان'' کے صاحبِ دیوان ہونے کا تحقیقی مضمون سے سید نجیب اشرف ندوی نے ''کتب خانہ خدا بخش خاں کی نادر کتابوں'' پر تحقیق کی ہے۔قاضی احمد میاں جوناگڑھی نے اپنے مضمون ''دیوان نظامی کے قلمی نسخے'' میں نظامی کے اصل نسخوں کا سراغ لگانے کی کوشش کی نصیر الدین ہاشمی نے ''انڈیا آفس کی کٹیلاگ میں دکھنی محظوظات کی فردگذاشتیں'' اور محمد سراج الدین کا مضمون ''نادر نظامی یعنی سوانح حیات آفغاہ'' بھی اہم مضامین ہیں۔ معارف کے تنقیدی، تاریخی، ادبی، تحقیقی، معاشرتی، دینی مضامین فکر انگیز عبارت اور علمی متانت سے بھرپور ہیں معارف نے فہم و ادراک کے دروا کیے۔تحقیق کو دینی بصیرت سے ہم آہنگ کیا۔ڈاکٹر انور سدید معارف پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''رسالہ ''معارف'' جولائی ۱۹۱۶ء میں مولانا سلیمان ندوی کی ادارت میں جاری ہوا۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ کا ترجمان تھا اور اس کا مقصد مذہب و فلسفہ و فکر کی ترجمانی اور نئی تحقیق اور تازہ خیالات کا فروغ عام تھا۔اس رسالے نے علومِ مذہبی کے ارتقا کو منظر عام پر لانے، اکابر سلف کی سوانح عمریوں کو مرتب کرنے اور حکمتِ اسلامی پر تحقیقی مضامین پیش کرنے میں فوقیت حاصل کی، مباحث، انتقاداتِ ادب میں اپنے بلند معیار کو برقرار رکھا۔''۳۴

مختصر یہ ہے کہ ادارہ دارالمصنفین جو اعظم گڑھ میں شبلی کے قدردانوں نے اُن کی وفات کے بعد ۱۹۱۴ء میں قائم کیا اس کے تحت نکلنے والے جریدے معارف نے مسلمانوں کی اقتصادی، تعلیمی، اخلاقی زبوں حالی کا بھرپور تجزیہ اپنے مضامین کے ذریعے کیا اور علوم اسلامیہ پر معارف ایک انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتا ہے۔

کہکشاں: رومانیت کا علمبردار ایک اور رسالہ ''کہکشاں'' ستمبر ۱۹۱۸ء میں منظرِ عام پر آیا۔ یہ رسالہ سید امتیاز علی تاج نے نکلا۔اس کی ادارت میں سید امتیاز علی تاج کے ساتھ عبدالمجید سالک معاونت کرتے تھے۔کہکشاں میں جذباتی احساس کے ساتھ ساتھ نئے غنائیہ لہجے کا عکس نظر آتا لیکن کہکشاں کا علمی و ادبی معیار اس رنگ و آہنگ میں بھی اپنا معیار بلند ہی رکھتا ہے۔ادبی رنگ نے کہکشاں کو نمو بخشی اور اسلوبی حسن کہکشاں کی میراث ہے۔افسوس سے کہنا پڑتا ہے۔کہ کچھ مالی مجبوریوں کی بنا پر کہکشاں نے تقریباً ڈھائی سال عمر پائی۔ کہکشاں ستمبر ۱۹۱۰۸ء میں نکلا اور جولائی ۱۹۲۱ء میں تاج صاحب نے اسے بند کردیا۔سید امتیاز علی تاج ''کہکشاں'' کے مقاصد پہلے شمارے میں یوں بیان کرتے ہیں:

"ہم اسے لحاظ صوری و معنوی تمام دُنیائے ادب کا بے نظیر پرچہ بنائیں گے۔ اعلیٰ درجے کے مضامین معقول معاوضہ دیکر لکھوائیں گے۔ رسالے کی ظاہری شان و شوکت کیلئے اسے مشاہیر و مناظر کی تصاویر سے مزین کرینگے۔ اُردو ادب کی ترقی کیلئے ہر ممکن کوشش کریں گے۔"۳۷

کہکشاں کے مضامین رومانوی لب و لہجہ میں لکھے گئے لیکن لفظوں کا چناؤ مترنم ہونے کے ساتھ ساتھ سادہ لب و لہجہ کا عکاس ہے۔ ڈاکٹر مسکین علی حجازی "پنجاب میں اُردو صاصحافت کی تاریخ" میں کہکشاں کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"ہر شمارے میں حسب ضرورت کوئی عملی یا ادبی مضمون تحریر کرتے تھے۔ کہکشاں میں خواجہ حسن نظامی مولانا راشد الخیری اور منشی پریم چند ایسے اہل قلم کی تحریریں بھی شائع ہوتی تھیں۔"۳۸

کہکشاں میں اس دور کے نامور ادیبوں کی نگارشات شائع ہوئیں امتیاز علی تاج کہکشاں میں "ہم خود" کے عنوان سے لکھتے ہیں:

"کہکشاں ماہِ ستمبر ۱۹۱۸ء سے جاری ہی۔ اور اس وقت سے اب تک ملک کے بہترین انشا پردازوں کے نتائج افکار سے مزین ہوتا رہا ہے۔ سید سجاد حیدر بی اے، خواجہ حسن نظامی، مولانا راشد الخیری، مولانا نیاز فتح پوری ..... مولانا حسرت موہانی، منشی پریم چند ..... وغیرہ اصحاب کے اسمائے گرامی ایسے ہیں کہ ان پر کوئی علمی و ادبی رسالہ بجا طور پر ناز کر سکتا ہے۔"۳۹

امتیاز علی تاج "کہکشاں" کے اسلوب پر خاص توجہ دیا کرتے تھے اس رسالے کا اسلوب "ادبِ لطیف" کا عکاس اسلوب ہے۔ رومانیت اس کے رگ و پے میں سرائیت کی ہوئی نظر آتی ہے۔ جنگ بہادر لال نگم کے نثر پارے "چاندنی رات میں، کا کچھ حصہ ملاحظہ ہو:

"اے چاندنی راتوں کے خوابیدہ منظر تجھے خبر ہے کہ کائنات کی بیداریوں میں میرے سکون کا کس قدر حصہ میرے دل کی کتنی راحتیں انتظار کے شریں ترین لمحوں میں گزر جاتی ہیں۔ صرف اس اُمید پر کہ ان منور ناروں کی چھاؤں اور مہتاب کی ٹھنڈی روشن کرنوں میں میرا دل کس رفتار کی پذیرائی کا متمنی نظر آتا ہے۔"۴۰

امتیاز علی تاج کا اسلوب بھی زبان کو نکھارنے کے ساتھ ساتھ حسن و جمال کے پیکر میں ڈھالتا نظر آتا ہے۔

روشن آرا راؤ امتیاز علی تاج کے اسلوب کے حوالے سے لکھتی ہیں:

"امتیاز علی تاج کا اسلوب تحریر اس مخصوص دور کے مطابق تھا جس میں رومانوی ادب اپنے عروج پر تھا۔"[۴۱]

کہکشاں میں علمی و ادبی مضامین کے ساتھ ساتھ سائنسی مضامین بھی ملتے ہیں مولوی سید ممتاز علی کا حیاتیات پر لکھے گئے طویل مقالے کا جزوی موضوع "بکتریا" ہے جو جراثیم پر ایک قسط وار مضمون ہے۔ "بکتریا" کے مضمون کے نثر پارہ ملاحظہ ہو:

"دوسرے نباتات و حیوانات کی طرح ان اجسام کی زندگی کے لیے بھی آکسیجن کی ضرورت ہے یہ کبھی تو ان کو آس پاس کی ہوا سے مل جاتی ہے اور کبھی اپنی اور غذاؤں سے حاصل ہوتی ہے۔"[۴۲]

مختصر یہ کہ کہکشاں اپنی مدت کی کمی کے باوجود ایک معیاری پرچہ تھا اور اس کے مضامین اہم ہونے کے ساتھ ساتھ رومانیت کے عکاس تھے۔

شباب اُردو: خان حسین احمد خان نے "شباب اُردو" اپریل ۱۹۲۰ء کو مطبع کریمی لاہور سے جاری کیا۔ اسکے اعزازی مدیر شیخ عبد القادر تھے اور جوائنٹ مدیر قلندر علی خاں، ملک برکت علی اور پروفیسر عباس خاں تھے۔ حصہ نسواں کی مدیر خان حسین احمد کی بیٹی خورشید سلطانہ تھیں۔ "شباب اُردو" کے لکھنے والوں میں خان حسین احمد خاں، قلندر علی خان، عشرت لکھنو، حکیم احمد شجاع، نیاز فتح پوری، چوہدری خوشی محمد، امتیاز علی تاج، سجاد حیدر یلدرم، حامد اللہ افسر، ثاقب کانپوری و دیگر اہل قلم شامل تھے۔ حصہ نسواں میں لکھنے والی خواتین خورشید سلطانہ، زبیدہ سلطانہ، سبزہ بیگم، زیتون، قیصرہ بیگم، وغیرہ نمایاں خواتین تھیں۔

ڈاکٹر محمد ہارون قادر نے "شباب اُردو" کے حوالے سے اپنی کتاب "شباب اُردو تجزیاتی مطالعہ" جو کہ اُن کے پی ایچ ڈی کے مقالے کا ایک باب ہے اس میں شباب اُردو کے تین ادوار بنائے ہیں:

پہلا دور:	۱۹۲۰ء تا ۱۹۲۳ء
دوسرا دور:	۱۹۲۴ء تا ۱۹۲۷ء
تیسرا دور:	۱۹۲۸ء تا ۱۹۴۰ء

مقالے کی طوالت کے پیش نظر ہم ان ادوار کے حوالے سے "شباب اُردو" کا جائزہ نہیں لیں گے۔ بلکہ

مجموعی طور پر شباب اُردو کا مطالعہ کریں گے۔ ''شباب اُردو'' کے پرچے کا سائز ۲۰x۲۲/۱۶ تھا اور فی پرچہ آٹھ آنے قیمت تھی۔ ''شباب اُردو'' انشائے لطیف کا عکاس ہے۔ رومانوی لب ولہجہ کا نمائندہ یہ جریدہ زبانِ مرصع میں لکھا گیا ہے اور تخیلاتی موضوعات، پرجوش جذبات سے مزین ''شباب اُردو'' زیادہ سے زیادہ لوگوں کی اپنی طرف متوجہ کرنے والا رسالہ تھا۔ اس جریدے نے سحر انگیز ماحول سے قارئین ادب کو متعارف کرلیا۔ ''شباب اُردو'' کی نثر میں شعریت اور گھلاوٹ نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر عبدالودود ''اُردو نثر میں ادبِ لطیف'' میں لکھتے ہیں:

> ''رومانی فن کار ایک دوسرے ہی دُنیا میں نظر آتے ہیں۔ ان کا اصل موضوع مطالعہ فطرت ہوتا ہے۔ یہ اجنبی اور ان دیکھی دُنیا کے خواہش مند ہوتے ہیں۔''۴۳

جون ۱۹۲۴ء میں غلام فرید قمر کا مختصر نثر پارہ ''ماں'' ملاحظہ ہو۔

> ''آدمیوں میں ماں کی محبت نقلی ہے۔ شفقت کی مورت ہے اور آزمائش کا گھر ہے۔ قدرت اس کا بار بار امتحان لیتی ہے مگر ماں کبھی فیل نہیں ہوتی۔''۴۴

مندرجہ بالا نثر پارہ ''ماں'' کے کردار کی جو تصویر ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ اس میں ماں کی عظمت کے اعتراف کے ساتھ ساتھ قاری کے دل میں لفظوں کی حسن کاری سے قلبی و ذہنی طمانیت کا احساس بھی بیدار ہوتا ہے۔

''شباب اُردو'' میں ہر موضوع پر مضامین ملتے ہیں۔ علمی و ادبی، معاشی و سیاسی مضامین کے ساتھ ساتھ اخلاقی و سائنسی مضامین بھی ''شباب اُردو'' میں نظر آتے ہیں اور ان مضامین کا اندازِ تحریر رومانوی ہے۔ مولوی عبدالستار فاروقی کا نثر پارہ ''دولت'' قاضی امانت علی تسکین کا ''مجھے دے جو میں مانگتی ہوں'' شوکت فہمی کا ''نا اُمید نہ ہو'' دیوانہ بریلوی کا ''قوس وقزح کا نظارہ'' ایم ایم بشیر کا ''نیرنگ روزگار'' ترلوک چند کا ''تصور''، مرزا محمد جعفر کا ''شاعر'' تلوک چند کا ''گلاب کا پھول'' لفظی حسن کاری کا بہترین نمونہ ہیں۔ سبزہ بیگم کا نثر پارہ ''گنہگار ہوں میں'' ملاحظہ ہو:

> ''میری کشتی ڈوبنے کو ہے۔ موجیں مجھ پر تھپیڑے مارتی ہیں۔ بادِ نسیم جو مجھ سے اٹکھیلیاں کیا کرتی تھی وہ بھی میری راہ روی کے لیے گریزاں ہوگئی۔ میری نیا پار لگا دے۔ سختی ہوں کہ تو کھیون ہار ہے مینے تسلیم کیا۔۔۔۔۔ گنہگار ہوں میں۔''۴۵

''شباب اُردو'' میں تراجم بھی کہیں کہیں نظر آتے ہیں ''تفریحات شب'' لی ہنٹ کے ایک مضمون کا ترجمہ ہے۔ جو محمد عزیز الحسن قریشی نے کیا ہے۔ اور یہ ترجمہ نہیں طبع زاد لگتا ہے۔ ترجمہ کا نمونہ ملاحظہ ہو:

> ''ہم شب کے وقت مکان کی طرف بڑی گشت لگانے والے ہیں اور اس سبب سے ہماری چوکیداروں، چاندنی رات، کیچڑ کی چمک اور اس ساعتِ دلفریب کے دوسرے لوازمات سے بڑی ملاقات ہے۔ خوش قسمتی سے ہم شب میں چہل قدمی کرنے کے شائق ہیں۔''۴۶



''شباب اُردو'' میں تاریخی مضامین لکھنے والوں میں اہم نام سید انوار علی نقوی اور سید وزارت علی کا ہے۔ اللہ بخش بلوچ اور شمس اللہ قادری کے مضامین بھی ملتے ہیں۔ شباب اُردو کے ان تاریخی مضامین میں تاریخ بولتی، کہتی اور سنتی نظر آتی ہے۔ یہ مضامین تاریخی اسلوب میں تاریخی دستاویز ہیں۔ سید انوار علی نقوی کے مضامین مثلاً ''غار ہائی ایلورا'' ''بحر الکاہل ایک ملک'' دکن کا قدیم شہر، شوکت شاہجہانی، سید وزارت علی کے مضامین مثلاً سلطان محمود غزنوی، انقلاب روس، مصری عورتیں، شمس اللہ قادری، کے مضامین چار نیار، قدیم عربوں کا علم الاصنام، اللہ بخش بلوچ کے مضامین احمد شاہ ابدالی و دیگر تاریخی مضامین ایسے مضامین ہیں جو اس دور میں جب میڈیا مضبوط نہیں تھا۔ ان رسائل کے ان مضامین کی توسط سے کبھی کسی ملک، کسی شخصیت، کسی شہر کے حوالے سے معلومات فراہم کی جاتی تھیں۔ نیز ہندوستان کے باشندوں اور تاریخی عمارتوں پر بھی مضامین ملتے ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ انیسویں صدی کے آغاز میں یہ رسائل باخبر ادارے تھے جو اندرونِ ملک اور بیرون ملک کی معلومات بہم پہنچاتے تھے۔ سید انوار علی نقوی کا مضمون ''دکن کا ایک پرانا قلعہ'' کا نثر پارہ ملاحظہ ہو:

> ''مینار کے گرداگرد غور سے دیکھی سے معلوم ہوتا ہے کہ نیلی اور خوبصورت دھاریاں و دیگر نقش ونگار بھی تھے جو انقلاب زمانہ سے مٹ گئے۔ اب دُھندلے سے معلوم ہوتے ہیں شاید ایک عرصہ کے بعد اتنے بھی نہ رہیں۔''[۴۷]

شمس اللہ قادری کا مضمون حیدر آباد کی مشہور عمارت، ''چار مینار'' حیدر آباد دکن کی مشہور عمارت پر مضمون ہے۔ یہ بھی تاریخی اسلوب کا حامل نہایت مختصر مضمون ہے۔ ''شباب اُردو'' میں خواتین نے بھی مضامین لکھے۔ یہ مضامین مختصر ہونے کے ساتھ ساتھ علمی، سائنسی، ادبی، معاشرتی، ادبی و اخلاقی ہیں، خان حسین احمد خاں کی صاحبزادیوں کے مضامین بھی شباب اُردو کی زینت بنے۔ زبیدہ سلطانہ کا مضمون ''ہماری مغلانی'' میں لفظوں سے مزاح پیدا کیا گیا ہے۔ اور مغلانی بی کا پورا نقشہ بڑے خوبصورت انداز میں کھینچا گیا ہے۔ بیگم فیض احمد فیض کے مضامین ''عورت کی ذمہ داری'' اور ''سیرت المومنین'' جبکہ مسز مقبول کا مختصر ماتمی نثر پارہ افسردگی اور بے کسی کا عکاس ہے:

> ''اختر میرے پیارے اختر کہتے ہیں تو چاند کا ٹکڑا تھا۔ تو گلاب کا پھول تھا، آخر غروب ہوگیا۔ موت کی بادِ صرصر کو آگ لگجائے تو کملا گیا۔ آ..... اختر آ۔ ایک بار اپنی صورت دکھا۔''[۴۸]

سبزہ بیگم کا مضمون جہاز رانی، قیصرہ بیگم کا سرائے فانی، زیتون بانو کا مضمون ''مشاہیر ہند'' انور بیگم کا ''عہد

سلف کے ساتھ عجائبات" گلزار بیگم "گنہگار ہوں میں" و دیگر خواتین کے مضامین و انشائیہ شباب اُردو میں علمیت کے ساتھ ساتھ انشائے لطیف کا حسین مرقع ہیں۔ اخلاقیات اور ادب کا گہرا رشتہ ہے کوئی معاشرہ اخلاقیات سے بے بہرہ ہو کر نظم و نسق برقرار نہیں رکھ سکتا۔ سید حسن جعفری کا مضمون "دوستی" نثار کا مضمون "میرا گہوارہ" سید فخر عالم فاضل کا مضمون "رانڈ بیوہ" قلندر علی خاں ولی کا مضمون "فیشن میں بال" نقی محمد خاں کا مضمون جسم اور اخلاق، سید محمد اسد علی کا مضمون "وقت"، میر عالم علی کا مضمون "نیشن" و دیگر مضامین جہاں معاشرے پر بصیرت افروز نظر ڈالتے نظر آتے ہیں وہاں پر جوش جذبات اور تشبیہات و استعارات سے مزین بھی ملتے ہیں کیونکہ "شباب اُردو" کی نثر رنگینی حسن کی نثر ہے۔ نثار کا مضمون "میرا گہوارہ" زندگی کے نشیب و فراز کی مرصع کہانی ہے۔ کتنا دلنشین ہے:

> "اللہ اللہ کیا وقت اور کیا سماں تھا۔ جبکہ دایاں اماں میرے گہوارے کے قریب بیٹھی ہوئی اللہ آمین کی لوریاں خوش الحانی سے سنا کر مجھے سلانا چاہتی تھیں اور میں اُن قدرتی آسمانی چراغوں کے کھیل میں سرپا محو تماشا تھا۔"[۴۹]

معاشرہ پر طنز و مزاح کے مضامین بھی شباب اُردو میں جابجا نظر آتے ہیں۔ طنز میں نشتر پنہاں سوا کرنا ہے اور مزاح میں غم و خوشی کی دونوں لہریں چل رہی ہوتی ہیں۔ شباب اُردو میں "داڑھی" پر کئی مضامین ملتے ہیں۔ قدسی صاحب کا مضمون "ریش مبارک" ہے۔ اسرار عثمانی کا "ریش شریف" اور محمد یعقوب خاں کا مضمون بھی ریش مبارک ہے۔ یہ مضامین داڑھیوں کی وضع قطع، اقسام کے حوالے سے پر مزاح مضامین ہیں۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ داڑھیوں کے حوالے سے اکثر و بیشتر مضامین مختلف رسائل میں نظر آتے ہیں شباب اُردو بھی اس لہر سے بچ نہ سکا۔ جبکہ چیف ایڈیٹر احمد حسن خاں کا مضمون "مرثیہ گو شاعر" اس دور کے "رسالوں کے طوفان" پر طنز ہے ایسے اصحاب جو رسائل نکالنے کے اہل نہیں انکے رسائل کی غیر معیاری مواد پر گہرا طنز اس مضمون میں نظر آتا ہے اور اپنے دور کے اہل قلم پر تبصرہ بھی ہے۔ شباب اُردو میں علم و ہنر کے حوالے سے بھی موضوعات پر قلم اُٹھایا گیا ہے۔ علمی و سائنسی مضامین اس دور کے رسائل کی ضرورت تھے اور شباب اُردو میں بھی سائنسی مضامین کے ذریعے جدید سائنسی ایجادات کی نشاندہی کی جاتی تھی۔ شیبانی کا مضمون "منڈیل کیمرہ" اُنکا سائنسی مضمون نومبر ۱۹۲۴ء میں شائع ہوا جو کہ اس دور میں کیمرے میں جو نئی تکنیک مستعمل ہوئی اس کی افادیت اور بناوٹ پر تحقیق کی گئی ہے:

> "اب امریکہ میں شہر جگاگو کے ایک فیرفنا پک کمپنی نے مینڈل کیمرے ایسے ایجاد کیے ہیں۔ جن میں تصویر بجائے شیشے کے تصویر کے کاغذ پر براہ راست لیجاتی ہے اور اس کیمرے کے نیچے ایک خانہ لگا ہوتا ہے جس میں عرق بھر دیا جاتا ہے تصویر لیتے ہی فوراً

کیمرے اندر ہی تصویر کا کاغذ اس عرق میں ڈبویا جاتا ہے اور ایک منٹ ڈوبے رہنے کے
بعد باہر نکال کر صاف پانی سے دھو کر فوراً تصویر تیار ہو جاتی ہے۔"۵۰

"ایلومنیم" دید کور کا تحقیقی مضمون ہے جس میں ایلومنیم کے برتنوں میں کھانے کے مضمر اثرات کا تحقیقی جائزہ لیا گیا ہے محمد ظفر کے مضامین "زمین گردش نہیں کرتی" "زندگی سو سال کے بعد" ارباب زکریا خان کا مضمون "دنیا کی عمر" و دیگر مضامین سورج، چاند، ستارے اور زمین کے حوالے سے کئی سائنسی مضامین ان سیاروں میں ہونے والی تبدیلیوں پر ملتے ہیں۔ جو "شباب اُردو" کے تحقیقی مزاج کی نمائندگی کرتے ہیں۔ شاکر کا مضمون "آنکھ" طب کے حوالے سے آنکھ کی ساخت اور آنکھ کے کام کے حوالے سے ہے اور اشکال کے ذریعے آنکھ کی ساخت کی وضاحت کی گئی ہے۔ ادب ہمارے مزاج کا آئینہ دار ہے اور "شباب اُردو" میں جو ادبی مضامین نظر آتے ہیں وہ بھی انشائے لطیف کے نمائندہ مضامین ہیں۔ منشی فضل الدین فیاض کے مضمون "کلام رند" میں تنقید میں رومانوی اثرات نمایاں ہیں۔ نثر کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

"مگر آہ! حرف گیر عیوب کو چن چن کر شا کی تشہیر و تذلیل کا سامان جمع کر دیتے ہیں اور
خوبیوں کی طرف سے آنکھوں پر اس طرح ٹھیکری رکھ لیتے ہیں۔ گویا ان کا وجود ہی نہیں۔
حالانکہ دیوانِ رند کی سیر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک سراپا بہار گلزار ہے جس میں
رنگا رنگ پھول کھلے ہوئے ہیں۔"۵۱

اعجاز اللہ آبادی کا قسط وار مضمون "سحر البیان" ہے۔ الفاظ کی شان و شوکت سحر انگیز نثر کا نمونہ پیش کرتے ہیں جس سے تنقید آرائش و زیبائش بن کر رہ جاتی ہے۔

"میر حسن کا اندازِ بیان ایسا ہے کہ اگر غم کی حالت بیان کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ
یاس و حرماں کی تصویر پیش کر رہے ہیں۔ دل خود بخود بھر آتا ہے رنج و غم کا بادل گھنگھور گھٹا
کی طرح سامنے آجاتا ہے۔ اگر خوشی کا منظر دکھانا چاہتے ہیں تو ایسے الفاظ اور فقرے
استعمال کرتے ہیں کہ مسرت و شادمانی کی لہریں رگوں میں دوڑنے لگتی ہیں۔ فضائے آسمانی
طرب انگیز ہو جاتی ہے۔"۵۲

شباب اُردو میں ادبی مضامین لکھنے والے شیخ عبد القادر کے مضامین "اُردو لکھنے میں آسان" "ہندوستان کی ایک زبان" "اُردو زبان بوڑھی یا جوان" مولانا سید احسن علی مارہروی کی "اُردو املا" فاروق شاہپوری کا "کلام ذکی دہلوی"، اللہ بخش بلوچ کے تحقیقی مضمون "پنجابی شاعری"، "ملتانی شاعری"، عبد الحلیم شرر کا مضمون "زبان عرب اور دنیا پر اس کا اثر، احمد ولی خاں رازی کا مضمون "منشی ولایت علی خاں" "عزیز صفی پوری"، خاں حسین احمد خاں کا

مضمون، ''مولانا محمد حسین آزاد''، عابد علی عابد کا ''آزاد مرحوم'' و دیگر تحقیقی و تنقیدی سوانحی مضامین شباب اُردو میں نظر آتے ہیں۔ انجمن آراء نے فریدوں پر ایک مختصر تحقیقی تعارف پیش کیا ہے اور اسکا آغاز جستجو اور تجسس کے میدان واں کرنا ہے۔ آغاز میں لکھتی ہیں:

> ''مجھے ایک قلمی پرانی کتاب دستیاب ہوئی ہے یہ مصور اور مطلا ہے۔ اس کا نام ''نامہ خسرواں'' ہے۔ یہ بادشاہان ایران کی از آغاز آبادیاں تا انجام ساسانیاں داستان ہے۔ یہ نہایت خوشخط نسخہ ہے۔ کسی یاقوت رقم ایرانی کاتب کی لکھی ہوئی ہے۔''۵۳

مختصر یہ کہ شباب اُردو ایک رومانوی رسالہ ہے اور مخزن کے تتبع میں نکالا گیا۔ اس میں اُردو زبان کے تحفظات پر مضامین بھی ملتے ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید ''پاکستان میں رسائل کی تاریخ ابتداء تا ۱۹۸۸ء تک'' میں لکھتے ہیں:

> ''شباب اُردو مصور ادبی رسالہ تھا۔ جو ۱۹۲۰ء میں لاہور سے خان محمد حسین نے جاری کیا اس رسالے کو شیخ عبد القادر، خواجہ دل محمد اور خان عبد العزیز کا تعاون حاصل تھا۔ ''مخزن'' اور ''ہزار داستان'' کی طرح شباب اُردو نے بھی تخلیقی اصناف ادب کی گراں قدر خدمت سرانجام دی۔''۵۴

رسالہ اردو: انجمن ترقی اردو کا مجلّہ ''رسالہ اردو'' اورنگ آباد دکن سے جنوری ۱۹۲۱ء میں شائع ہوا۔ مولوی عبدالحق بابائے اردو اسی رسالے کے بانی تھے۔ یہ رسالہ سہ ماہی تھا ۱۹۲۱ء تا ۱۹۲۶ء تک دکن سے شائع ہوا اور پھر ۱۹۲۶ء تا ۱۹۴۸ء تک دلی سے نکلا۔ ۱۹۴۹ء سے انجمن ترقی اردو کراچی سے جاری ہوا۔ اس رسالے کے اغراض و مقاصد میں اہم مقصد یہ تھا کہ اسے خالص ادبی و تحقیقی رسالہ بنایا گیا اور اس میں زبان و ادب کے مختلف شعبوں اور پہلوؤں پر بحث ہوتی تھی۔ اور گمنام ادبی تخلیقات کا کھوج لگا کر اسے قارئین ادب اور نو آموز محققین کے سامنے پیش کیا جاتا رہا۔ مولوی عبدالحق نے اپنے رسالہ ''اردو'' کی توسط سے کئی نامور محقق و مدون دنیا ادب سے متعارف کرائے۔ خود بھی بابائے اردو مولوی عبدالحق نے کسی ماہر محقق کی مانند بہت سے گمنام فن پاروں کو تحقیق و جستجو اور بری مہارت سے دریافت کر کے دنیائے ادب کو لازوال شہ پارے عطا کئے۔ رسالہ ''اردو'' کی یہ خاصیت رہی کہ اس میں تحقیقی مقالات، لسانی مطالعات، اردو زبان کے نظریات، شعراء کے حالات، فارسی ادب پر مقالے، نئے دریافت شدہ متون اتنے دریافت شدہ شاعر، ادباء تہذیب و ثقافت، تاریخ و تنقید غرضیکہ ہر قسم کا مواد مہیا کیا گیا ہے۔ مولوی صاحب نے کئی فن پاروں کے مقدمے لکھے جن میں ''چمنستان شعرائے قدیم اردو''، حسن شوقی، ملا وجہی کی

''سب رس''، ''قطب مشتری'' و دیگر مقدمے شامل ہیں۔ نئے متون کی دریافت مولوی صاحب کا شوق تھا اور اردو ادب کی ضرورت بھی۔ ''مثنوی خواب وخیال'' کے مقدمے میں لکھتے ہیں کہ میرا مثنوی کے تتبع میں نواب مرزا شوق نے ''مثنوی بہار عشق'' لکھی اور اس کے طور پر دونوں کے اشعار کی امثال بھی دیتے ہیں۔ مثنوی کے حوالے لکھتے ہیں:

> ''اب جو یہ مثنوی ہمارے سامنے موجود ہم بلاشبہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ مثنوی کا ماخذ اور نمونہ تھی اور اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا حالی کا قیاس کس قدر صحیح تھا''۵۵

رسالہ ''اردو'' کا مقصد زبان اور اس کے اصول وقواعد کی نشاندہی کرنے کے ساتھ ساتھ اردو کی ابتدا و پرداخت اور تنقید وتحقیق میں غیر جانبداری اور صداقت تھا۔ مولوی عبدالحق رسالہ ''اردو'' کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

> ''مختصر یہ کہ میں چاہتا ہوں کہ یہ رسالہ اردو زبان اور ادب کی ایسی مفید اور محققانہ بحثوں سے مالا مال ہو کہ شائقین ادب اسے غور سے اور شوق سے پڑھیں اور فائدہ اٹھائیں اور اہل ملک کے ذوق پر اس کا اچھا اثر ہو اور وہ دن آئے کہ لوگ اس کے پرچے ڈھونڈتے پھریں۔''۵۶

مولوی عبدالحق کا رسالہ ''اردو'' تدوین وتحقیق، تنقید وتخلیق میں معیاری مضامین کا عکاس ہے۔ اردو زبان کی تشریح وتوضیح کے ساتھ ساتھ محققانہ بحثیں بھی رسالہ اردو نے کی۔ عمیق مطالعہ کے بلند پایہ مضامین بھی شائع کیے۔ تحقیق وتدوین ساتھ ساتھ چلتی ہیں اور ہر مدون محقق بھی ہوا کرتا ہے۔ تحقیقی مزاج رکھنے والا ہی تدوینی کاموں پر عبور رکھتا ہے۔ مولوی عبدالحق کا تدوینی کام دنیائے تحقیق وتدوین کے لیے مشعل راہ ہے۔ قدیم دواین پر مولوی عبدالحق کا کام مایہ ناز ہے مثلاً ''قدیم اردو شوقی، کے حوالے سے مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ حسن شوقی عادل شاہی شعرا میں سے تھا۔ ابن نشاطی قصہ ''پھول بن'' میں جن مشہور شعراء کا ذکر ہے۔ مولوی صاحب نے ملا وجہی کی سب رس کو گمنامیوں کے میدان سے نکال کر دنیائے ادب کے افق پر روشن ستاروں کی مانند جگمگایا۔ روشن آراء اپنے مقالے ''ادبیات اردو کے ارتقاء میں رسائل کا کردار'' میں مولوی عبدالحق کے تدوینی کام کے حوالے سے لکھتی ہیں:

> ''مولوی عبدالحق نے قدیم دکنی کی کئی اعلیٰ درجے کی عظیم کتابیں تصحیح فرہنگ الفاظ کے ساتھ چھپوائیں چنانچہ اردو میں ایسے کئی تحقیقی مقالات لکھے جو اس مجلّے کے شمارے میں شائع ہوئے۔''۵۷

رسالہ ''اردو'' نے تحقیقی فتوحات کو ایک اعلیٰ مقام عطا کیا۔ نئے شاعر و ادباء دریافت کیے۔ اسی سلسلے میں

رسالہ ''اردو'' کی انفرادیت نے اس جلد ہی مقبولیت سے ہمکنار کیا۔ محقق حقائق کی تلاش کے ساتھ ساتھ حقائق کی تردید و تصحیح کرتا ہے اور پھر ان حقائق کی وضاحت بھی کرتا ہے۔ رسالہ ''اردو'' کے اکثر مضامین محقق کے ان اوصاف کے عکاس ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید اپنی کتاب ''پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ'' میں رسالہ اردو کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''''اردو'' نے ادب میں اظہار کا علمی انداز پیدا کیا، تحقیق میں طلب، صداقت اور تلاش حق کو اہمیت دی اور اختلافی امور کو صبر و عمل سے قبول کرنے کی طرح ڈالی۔''۵۸

رسالہ ''اردو'' کے توسط سے کئی نئے شاعر دریافت کیے گئے مثلاً مرزا فدا علی کا قسط وار مضمون ''اردو کے ان پڑھ شاعر'' ایسا مضمون ہے جن میں ایسے شاعروں کا تذکرہ بھی ملتا ہے جن میں سے کئی ایک شعراء اپنا نام بھی لکھنا نہیں جانتے تھے۔ لیکن شاعری میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ مثلاً شفیق، فیاض، طالب، عابد، آباد، احمد، امراء علی، بشیر، بنیاد وغیرہ کی شاعری پر مختصر تحقیقی روشنی ڈالی گئی ہے۔ قاضی عبدالودود کا تحقیقی مضمون ''سال وفات جرات'' بھی تحقیق کی گتھیوں کو سلجھاتا ہے۔ رسالہ ''اردو'' کے تحقیقی مواد میں کہیں بھی جذباتی تانے بانے کا شائبہ نظر نہیں آتا۔ تحقیق ''اردو'' سائنسی لائحہ عمل اختیار کر کے کسی بھی فن پارے کی اصل حقیقت تک پہنچتے ہیں۔ ان محققین نے تحقیق کی نئی مہارت اور نئی سمتوں کو ہویدا کیا۔

رسالہ ''اردو'' کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ اسے مولوی عبدالحق جیسا محنتی و قابل محقق و مدبر ملا۔ جن کھ تحقیقی مزاج نے رسالہ ''اردو'' کے مضامین کے ذریعے نو آموز محققوں کو روشناس بھی کرایا اور مواقع بھی فراہم کیے۔ مثلاً سید محی الدین زور کا مضمون ''دکنی مرثیے انڈیا میں'' اپنے دور کا کارآمد، بیش قیمتی تحقیقی مضمون ہے۔ اس دور میں ایسے معلوماتی و تحقیقی مضامین اردو ادب میں گراں قدر اضافے کا سبب بنے۔ رسالہ اردو میں شائع ہونے والے اکثر مضامین مستند کتابوں کی شکل میں منظر عام پر آتے ہیں۔ مثلاً باغ و بہار، کا مقدمہ بھی مولوی صاحب کا لازوال شاہکار ہے۔ اسی طرح مولوی صاحب کا ایک اور مضمون ''اردو زبان کے قدیم کتبے'' مختصر ہونے کے باجود مولوی صاحب کے تحقیقی مزاج، غیر معمولی ذہانت، اعلیٰ نظری، شاقی و مہارت و دیانت اور لسانی مہارت کا عکاس ہے۔ مولوی صاحب کے مطابق فارسی زبان میں کتنے ہوتے ہیں یہاں تک کہ اکثر حکیم بھی نسخے فارسی زبان میں لکھتے ہیں۔ مولوی صاحب لکھتے ہیں:

> ''میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب مجھے بعض قدیم عمارتوں پر قدیم اردو یا ہندوستانی زبان کے کتنے نظر آئے۔ اس زبان کا سب سے قدیم کتبہ مجھے احمد آباد کی ایک چھوٹی سی

مسجد میں ملا۔"۵۹

تنقید کا منصب یہ ہے کہ نقاد بے لاگ تنقید کرنے کے ساتھ ساتھ ذوق سلیم کا بھی مالک ہو۔نئی سوچ، نئے رویے اور نئی تحریک کو جنم دینا بھی تنقید کا اہم منصب ہے۔رسالہ "اردو" میں کسی بھی تخلیق کے حسن وقبیح میں توازن، اعتدال کے ساتھ ساتھ تنقیدی شعور کو بھی مدنظر رکھا جاتا تھا۔جناب صغیر احمد صدیقی کا مضمون "کلام چکسبت پر ایک تنقیدی نظر" سید حسن برنی کے مضامین "سعدی"، "حافظ شیرازی" وقار عظیم کا مضمون "کلام اثر" و دیگر مضامین ان ناقدین کی ذہانت اور متانت کے عکاس ہیں۔اور فن پارے میں پوشیدہ تنقیدی اصولوں کو بھی اجاگر کرتے ہیں۔حسن برنی نے سعدی پر جو تنقید کی ہے وہ تحقیق وتنقید کی دو پہلی جھالر میں ملفوف ہے۔وقار عظیم کا مضمون "کلام اثر" رسالہ اردو کا پہلا طویل تنقیدی مضمون ہے جس میں وقار عظیم نے اپنی خداداد صلاحیتوں کا اعتراف کلام اثر کے عمیق مطالعے، انداز فکر امیں تجزیے کے ساتھ ساتھ کرایا ہے۔رسالہ اردو نے تراجم کے رجحان کو بھی فروغ دیا اور مولوی عبدالحق نے بھی تراجم اور ان کی اہمیت کو تسلیم کیا اور رسالہ "اردو" نے معیاری تراجم کا ڈیل ڈول ڈالا۔حاجی احمد فخری کا طویل ترین مضمون ہے۔جس میں ترجمہ کی اہمیت، ضرورت تعریف، زبان وبیان کے ساتھ ساتھ امثال کا ترجمہ کیا ہے۔فرحت اللہ بیگ نے "بوستان خیال" کا ترجمہ سات جلدوں میں کیا ہے۔

لسانیاتی مطالعات بھی اردو کے اہم موضوع رہے ہیں رسالہ "اردو" تحفظات اردو میں پیش پیش رہا ہے۔ بے باک اور نڈر مولوی عبدالحق نے اپنے رسالے "اردو" کو جرات و دیانت کا علمبردار بنایا اور علمی متانت کا نقیب بنایا۔اردو زبان کے تحفظ، نام اور اردو زبان میں مختلف زبانوں کی پیوندکاری پر بھی مضامین ملتے ہیں۔رسالہ "اردو" کے لسانی و تحقیقی تفکرات اور موضوعات پر مضامین نو آموز محققین کے لیے نئی مہارت اور نئے راستے کھولتے ہیں۔ لسانیات کے حوالے سے مولوی عبدالحق نے زبان اردو کے تحفظ کے لیے اس جریدے کو وقف کردیا۔شوکت سبزواری کا مضمون "اردو الفاظ عامہ کی آپ بیتی" پروفیسر حافظ محمود شیرانی کے لسانی مضامین بھی اردو کی زینت بنے۔ مولوی عبدالحق کے مضامین لسانی نے اردو زبان کا مقام، مرتبہ بھی متعین کیا اور زبان اردو کو معتبر بھی کیا۔رسالہ "اردو" کے مضمون نگاروں نے ثقافت اور تہذیب، اقدار و روایات پر بھی قلم اٹھایا ہے۔پنڈت کشن پرشاد کا مضمون "ہمارا پرانا اور نیا کلچر" ہے جس میں پرانی تہذیب کے رسم و رواج اور مغربی تہذیب سے رسم و رواج اور کلچر میں تبدیلی پر کڑی تنقید ملتی ہے۔ڈاکٹر انور سدید "پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ" میں لکھتے ہیں:

> "رسالہ "اردو" کو ایک مخزن المخازن کی حیثیت حاصل ہے کے مضامین نوادرات کی حیثیت اختیار کرچکے تھے۔اور اب کے ان گت موضوعات پر بنیادی حوالے کے طور پر استعمال

کیے جاتے ہیں۔"[۶۰]

رسالہ "اردو" خالص تحقیقی وتدوینی، لسانی رسالہ تھا اور اس دور میں رسالہ "اردو" میں لکھنے والے آگے چل کر بڑے محقق و مدون، نقاد ثابت ہوئے۔ فرحت اللہ بیگ، قاضی عبدالودود، مرزا فدا علی، حافظ محمود شیرانی، سید حسن برنی، محمد یحیٰی تنہا، حکیم سید شمس اللہ قادری، محمد مجیب، طالب آبادی، سید مقبول حسین و دیگر ارباب نثر شامل ہیں۔ مولوی عبدالحق "بابائے اردو" نے اردو زبان کے لڑکھڑاتے قدموں کو استحکامت سے ہمکنار کیا اور آج اردو زبان بلاخوف وخطر اپنی جنگ خود لڑ سکتی ہے۔ اگرچہ مغربی وہندی ثقافت و زبان کی یلغار آج ایک بار بھی اردو زبان کی شناخت پر حملہ آور ہو چکی ہے لیکن اردو زبان میں اتنا دم خم ہے کہ ان آندھیوں میں اپنا چراغ روشن رکھ سکتی ہے کیونکہ اردو زبان ہی ہمارے اتحاد اور یگانگت کا سبب ہے۔ رسالہ "اردو" سے جو تحقیقی وتدوینی کام شروع ہوا آج بھی جاری وساری ہے۔ نئے رسالے آج دنیائے تحقیق وتدوین میں اپنا رنگ دکھا رہے ہیں اور تحقیق وتدوین کی آبیاری کر رہے ہیں۔ مولوی صاحب کی سالاری میں چلنے والا محققین کا قافلہ تازہ دم سواروں سے نئی نئی منزلوں کی جستجو میں سرگرداں رہتا ہے۔ اور جب تک یہ دنیا قائم ہے یہ قافلہ یونہی چلتا رہے گا۔

ہمایوں: میاں بشیر احمد نے اپنا رسالہ "ہمایوں" اپنے والد گرامی جسٹس شاہ دین ہمایوں کی یاد میں جنوری ۱۹۲۲ء میں نکالا۔ اس جریدے کے ایڈیٹر خود میاں بشیر احمد اور سب ایڈیٹر مولانا ناجور نجیب آبادی تھے اور علامہ اقبال اور سر عبدالقادر کی مشاورات سے گاہے بگاہے بشیر احمد مستفید ہوتے رہے۔ ہمایوں کے اغراض و مقاصد مندرجہ ذیل بنائے گئے۔

۱۔ ہم عصر رسائل سے مقابلہ بازی کے رجحان کی نفی کرنے کے ساتھ ساتھ ان رسائل کے ادبی وفنی مزاج سے باہمی ربط واتحاد رکھنا اور ہمایوں و دیگر رسائل کی خوبیوں و کمزوریوں پر تنقید برائے اصلاح کرنا۔

۲۔ ایسے نئے لکھاریوں کی حوصلہ افزائی کرنا جن کی ادبی وفنی تحریریں ابھی منظر عام پر نہیں آئیں اور جو لکھاری لکھنے کی صلاحیت رکھنے کے باوجود موقع نہ ملنے کی بنا پر تخلیقی عمل سے کتراتے رہے۔

۳۔ اُردو زبان کے پاکیزہ اور صحت مند رجحان کے فروغ پر زور دینا۔

۴۔ گمنام سائنسی، ادبی، تاریخی وفلسفیانہ گمنام تحریروں وشخصیات کو منظر عام پر لانا۔

ابتدا میں رسالہ "ہمایوں" کے لکھنے والوں میں میاں بشیر احمد، مولانا ناجور نجیب آبادی، شیخ عبدالقادر، نیاز فتح پوری، رائے بہادر شیونرائن شمیم، میاں محمد شفیع، خواجہ حسن نظامی، مرزا محمد سعید، عبدالعزیز فلک پیما، خلیقی دہلوی،

مولانا وحید الدین سلیم، سید مقبول احمد، سجاد حیدر یلدرم، سید ابو محمد ناقب کانپوری و دیگر نثر نگار شامل تھے۔ ''ہمایوں'' کا پہلا پرچہ بشیر احمد نے اپنے والد جسٹس شاہ دین ہمایوں کی سوانح پر شائع کیا۔ ''ہمایوں'' کی ابتدائی تحریریں رومانی اثرات کی حامل تحریریں تھیں۔ ادبِ لطیف کی پاکیزہ لطافت سے بشیر احمد نے ''ہمایوں'' کو مزین کیا۔ ''ہمایوں'' کے برجستہ، اسلوب، وسعت نظر اور دلکشی و تازگی مضامین نے اس دور میں جمالیات و رومانیت کو فروغ دیا۔ ''بزم ہمایوں'' میں اس جریدے کے مقاصد کا اعلان میاں بشیر احمد رنگ و آہنگ سے بھرپور نثر میں یوں کرتے ہیں:

> ''ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنالے اور لوگوں کو اپنی ریاضت نفس سے عمل کی تلقین کرے لیکن جہاں موجودہ تعمیرات کو اپنے زورِ تقریر سے متزلزل کر دینے کا خیال پیدا ہوا وہاں سمجھ لیجئے کہ محفل ادب کی شمع ہدایت گل ہوگئی اور ملک و ملت کی اجتماعی ترقی مسدود!۔''[۱۱]

لیکن اپنے دور میں ہمایوں نے یہ اہم کردار ادا کیا کہ اس نے ''ادب لطیف'' کے حسن کو بھی برقرار رکھا اور مقصدیت و افادیت سے بھی گریز نہیں کیا ''ہمایوں'' نے رکاکت اور ابتذال سے بھرپور تخلیقی مواد سے خود بھی اجتناب کیا اور دیگر ہم عصر رسائل کو بھی پاکیزہ ادب لطیف کی طرف راغب کرنے کے لیے جدوجہد کی۔ ڈاکٹر عبد الودود رسالہ ''ہمایوں'' کے پاکیزہ اسلوب کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''ہمایوں ایسے ادب لطیف کا علم بردار تھا جس میں پاکیزگی ہو اور زبان عام فہم و سلیس ہو تا کہ عام صلاحیت کا آدمی بھی محظوظ ہو سکے۔ ناظرین صف لطف اندوز ہی نہ ہوں، بلکہ کچھ فائدہ بھی حاصل کریں ہمایوں کے اس نقطہ نظر سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ ادب لطیف کے مصنفین اور ادب لطیف شائع کرنے والے رسائل ایک ہی معیار پر نہیں پرکھے جاسکتے۔ عریانی سے معمور، ایسی تحریر کو ہی جس میں الفاظ کی بازی گری نمایاں ہو، ادب لطیف نہیں سمجھنا چاہیے۔ پاکیزگی خیال اور سادگی زبان کا خیال رکھ کر بھی ادبِ لطیف کے کامیاب نمونے پیش کیے گئے ہیں۔ تخیل کی بلند پروازی اور خیال کی رومانیت تحریر کو لطیف بنا دیتی ہے ہمایوں کے صفحات پر ایسے نمونے بکثرت دیکھے جاسکتے ہیں۔ افسوس کہ ادب لطیف کی پرانی شراب کا خمار کس طرح کم نہیں ہوا۔ ہمایوں کی آواز بہت کم لوگوں نے سنی۔ اس نے نظریات کو قبولِ عام حاصل نہ ہو سکا۔ اگر ''ہمایوں'' کے جدید نظریات کا استقبال کیا جاتا تو ادب لطیف یقیناً ہی ایک دور میں قدم رکھتا۔ اس کی ترقی میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوتا۔ حد سے زیادہ مصنوعیت ''ادب لطیف'' کے زوال کا سبب بنی۔''[۱۲]



''ہمایوں'' میں سجاد حیدر یلدرم، بشیر احمد، عبدالعزیز فلک پیما، حسن نظامی، خلیقی دہلوی و دیگر تخلیق کاروں نے اپنے مختصر نثر پاروں ندرتِ خیال اور مرصع زبان کے اشتراک سے ایسا نثر پارہ بنادیا جو قاری کے ذہن کو حظ و مسرت مہیا کرنے کے ساتھ ساتھ ایک صحت مند، بھرپور اور خوشگوار افادیت سے روشناس کراتا ہے۔ عبدالعزیز فلک پیما کے نثر پارے ''متوالے''، ''خودمختار رقاصہ''، ''مروجہ اُردو شاعری''، ہوا، ''تسلیاں''، خلیقی دہلوی کے نثر پارے ''درۂ موت''، ''تدبیر منزل''، بشیر احمد کے خیالات، ''تیرے لیے''، ''موت سے نہ ڈر''، خواجہ حسن نظامی کے نثر پارے ''ٹھیکری کا نصیب''، ''رونا بھی ایک زبان ہے''، ''ٹیلیفون اور ہمزاد''، ''ادب لطیف'' کی شگفتہ تحریر اور سادہ اسلوب میں پوشیدہ فکر نو کے عکاس ہیں۔ رسالہ ہمایوں میں آزاد کے دورانِ جنون میں لکھے گئے ''خیالات پریشاں'' بھی نظر آتے ہیں جو آزاد کے خلل دماغ کے باوجود ان کی فصیح زبان اور جوہر قبل کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں دسمبر ۱۹۲۵ء میں ''جذبات آزاد'' کے عنوان سے جو بے ربط نثر پارہ ہمایوں میں شائع ہوا اس کا اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''ہم ہر کام کو اُسکے وقت پر کرتے ہیں اور ہوتا ہے، وہ ایسا ہی ہوتا ہے کہ وہی، جب ہم اس وقت کو طول دیں، تم کہو گے دیر ہوئی، وہ دیر نہیں ہماری مصلحت ہے۔ ہم اپنے حکم کے مالک ہیں، جب چاہتے ہیں کرتے ہیں، تم ہو بندگی میں، جب ہم تمکو دیتے ہیں تم لیتے ہو اور نہ دیں تو خود بھی کچھ نہ کچھ کرتے ہو! وہ ہمارا نہیں تمہارا ہوتا ہے مگر وہ ہماری دی ہوئی عقل سے ہوتا ہے۔''[۱۳]

بشیر احمد نے اپنے جریدے ہمایوں کو ''ادبِ لطیف'' سے ہی آراستہ نہیں کیا بلکہ سادہ ادبی نثر سے بھی مزین کیا۔ ہمایوں کے تخلیق کار کھوج و جستجو سے گمنام فن پاروں کو منظر عام پر لائے اور ناقدین ادب نے بھی ہمایوں کی وساطت سے فن پاروں کی قدر متعین کرنے میں عدل و انصاف کو مدنظر رکھا۔ لہٰذا یہ کہنا درست ہوگا کہ ہمایوں نے جہاں انشائے لطیف کو فروغ دیا وہاں صداقتوں، ریاضتوں اور متوازن تقابل کا بھی ترجمان رہا۔ ہمایوں کا پہلا پرچہ جہاں حسن نظامی کے مختصر مضمون ''شاہانِ تیمور'' کی آخری قبر'' سوز و گداز، لفظوں کی پرکاری اور تخیلاتی و تصوراتی نثر کا ترجمان ہے وہاں سر عبدالقادر کا تحقیقی مضمون ''پنجاب میں اُردو'' تحقیقی اصطلاحات، تحقیقی اسلوب و تحقیقی مزاج کا نمائندہ مضمون ہے۔ جبکہ محمد شفیع کا مختصر مضمون ''تعلیم''، تعلیمی فقدان پر معاشرتی المیہ کا عکاس ہے۔ ''ہمایوں'' نے مولانا تاجور نجیب آبادی کی ادارت میں ۱۹۲۲ء تا ۱۹۲۶ء تک سفر طے کیا اور مولانا تاجور کے بعد ''ہمایوں'' کی ادارت منصور احمد نے سنبھال لی اور مولانا حامد علی خاں بھی ہمایوں کے معارف مدیر کی حیثیت سے سامنے آئے۔ جنوری ۱۹۲۸ء میں مولانا حامد علی ماں کی صلاحیتوں کا اعتراف ''بزم ہمایوں'' میں کیا ہے مولانا تاجور نجیب آبادی کے



دورِ ادارت میں انور سدید کی رائے میں ہمایوں کا مزاج کلاسیکی تھا اور خشک مضامین سامنے آئے جبکہ مولانا حامد علی خاں کے دور میں مضامین کے موضوعات میں تنوع و وسعت پیدا ہوئی اور سپاٹ اور خشک اندازِ بیان کی جگہ شگفتہ، دلچسپ اندازِ تحریر نے ''ہمایوں'' میں جگہ پائی۔ مولانا حامد علی خاں نے سالناموں کا آغاز بھی اس جریدے میں کیا ۱۹۴۴ء میں یوسف ظفر بھی معاون ادارت میں شامل ہو گئے۔ ۱۹۴۷ء تک ''ہمایوں'' سے وابستہ رہے۔ اس دور کے لکھنے والوں میں حامد اللہ اختر، سید عابد علی عابد، صوفی تبسم، مقبول احمد پوری، منظور سروش، خواجہ احمد فاروقی، پروفیسر حمید احمد خاں، اعظم کریوں، شیخ محمد اکرام، مرزا عظیم بیگ چغتائی، مرزا فرحت اللہ بیگ، سید عبد اللہ، فراق گورکھپوری، ظہیر کاشمیری، نصیر الدین ہاشمی، شوکت سبزواری، سید وقار عظیم و دیگر نثر نگار نے ہمایوں میں تحقیقی و تنقیدی مضامین لکھے۔ بشیر احمد کی مغربی ادب سے شناسائی نے بھی ''ہمایوں'' کو جدید خطوط پر گامزن کیا۔ ڈاکٹر مسکین علی حجازی رسالہ ''ہمایوں'' کی جدت کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''ادبی صحافت میں ہمایوں نے بعض جدتیں پیدا کیں۔ اور ایسے موضوعات کا احاطہ کیا جو اس سے پہلے ادبی رسائل کے لیے اجنبی تھے۔ اگرچہ ''ہمایوں'' عملی سیاست سے کنارہ کش رہا لیکن نظریاتی سیاست پر لاتعداد مقالات شائع کیے۔ متمدن دنیا کی مختلف جدید تحریکوں پر مبسوط مضامین شائع کیے تا کہ قارئین عالم تمدن کی رفتار کا صحیح اندازہ کر سکیں۔ مغربی ادب کے تراجم اور مغربی فن مصوری کے نمونے کثرت سے شائع کیے لیکن شرقی ادبیات اور شرقی فنون کو بھی برابر کا حصہ دیا۔''[۶۴]

''ہمایوں'' کے اغراض و مقاصد میں ''اُردو زبان کے تحفظات'' مقصد اولین تھا۔ اسی لیے تلفظ، زبان اور صحت املا کی طرف بھی ''ہمایوں'' میں بھرپور توجہ دی گئی۔ ''ہمایوں'' نے اُردو زبان کے فروغ کے لیے آواز بلند کی ادھر مارچ ۱۹۲۲ء میں جس پہلے انعامی مضمون کا جریدے میں اعلان کیا گیا اس کے لیے عنوان تھا ''اُردو ہندوستان کی ملکی زبان کیونکر بن سکتی ہے''۔ یہ عنوان ''اُردو بچاؤ، اُردو پھیلاؤ اور اُردو کو وسعت دو'' کے نظریے کے فروغ کا سبب بنا۔ سر عبد القادر کا مضمون ''پنجاب میں اُردو'' تحقیقی مضمون ہے جس میں پنجابی اور اُردو کو ماں جائی نہیں قرار دیا ہے۔ سر عبد القادر لکھتے ہیں:

> ''اول تو پنجاب کی اپنی زبان اُردو سے بہت ملتی جلتی تھی یہ زبانیں گویاں ماں جائی نہیں تھیں ----- بے شمار لفظ اور محاورے ہیں جو دونوں زبانوں میں مشترک ہیں ----- اس وقت مثال کے طور پر چند لفظوں کا مقابلہ کافی ہوگا ذرا غور سے اوپر کی چند سطروح کو دیکھئے کیا نظر آتا ہے:۔

اُردو یا ہندوستان	پنجابی
ملتی جلتی	ملدی جلدی
ماں جائی	ماں جائی
بچھڑی	وچھڑی
آملیں	آن ملیاں۔"۶۵

اہل زبان حضرات کے مضامین کی وساطت سے "ہمایوں" نے سادہ و سلیس اسلوب کو فروغ دیا مولانا وحید الدین سلیم کا مضمون "ہندوستان کا عام زبان"، ناظر دہلوی کا مضمون "ہندوستان کی ملکی زبان، سید مقبول احمد کا مضمون "اُردو ملکی زبان کیونکر بن سکتی ہے"۔ "احسن مارہروی کا مضمون "تاریخ امثال"، برجموین و ناتریہ کیفی کا مضمون "لفظ" و دیگر مضامین کی اشاعت کا مقصد "ہمایوں" کے ذریعے زبان اُردو کی آبیاری کرنا اور اُردو زبان کو بیان و اسلوب و موضوعات میں جدت و تنوع بخشنا تھا۔ "ہمایوں" نے تحقیقی مضامین کے ذریعے گمنام فن پاروں کی دریافت میں دیگر رسائل کی طرح اہم کردار ادا کیا۔ آغا حیدر حسن دہلوی نے ابن نشاطی کی مثنوی "پھول بن" کے مختلف نسخوں کی جگر کاوی سے جانچ پڑتال کر کے اساسی نسخہ کی مدد سے مرتب کیا اور یوں "ہمایوں" کی وساطت سے منظر عام پر لائے۔ محمد سعید کا مضمون "ہندی بھاشا کا جدید ادب" نصیر الدین ہاشمی کا مضمون "قدیم اُردو (دکھنی) میں تاریخ کا ذخیرہ" و دیگر تحقیقی مضامین اس بات کے شاہد ہیں کہ "ہمایوں" نے حقائق کی معتبر تلاش کو تحقیقی مضامین کی بنیاد قرار دیا اور تحقیقی مضامین کے لیے ہمایوں نے "تقابلی مطالعے" کو اہم گردانا۔ شروع سے ہی "ہمایوں" کا تنقیدی مزاج قارئین ادب میں اعلیٰ ذوقِ سلیم پیدا کرنے کا خواہاں رہا اور تاثراتی و تقلیدی تنقید کی "ہمایوں" نے ہمیشہ حوصلہ شکنی کی اور تنقید کے فعال اور متحرک نظام کو "ہمایوں" نے اپنے تنقیدی مضامین کے ذریعے واضح کیا۔ ناجور کا مضمون "اُردو شاعری اور بلنیک ورس کے ذریعے" اردو شاعری میں ہونے والے نئے تجربات کا ناقدانہ تجزیہ ہے۔ "ہمایوں" نے اپنے تنقیدی مضامین کے ذریعے ناقد کو یہ احساس دلایا کہ اُسے فہم اور ادراک کے ساتھ ساتھ مستقل مزاجی کا مالک بھی ہونا چاہیے تب ہی وہ کسی فن پارے پر بے لاگ تنقید کرنے کا متحمل ہو سکتا ہے۔

وحید الدین سلیم کا مضمون "سودا کی ہجویہ نظمیں" خواجہ احمد فاروقی کا مضمون "غزل جدید کے رجحانات پر ایک سرسری نظر" ریاض احمد کا مضمون "نظم معریٰ کی ترویج"، سید فیاض محمود، عبد اللہ کا مضمون "اسد اور غالب" شوکت سبزواری کا مضمون "اقبال کے کلام میں شیطان کا تصور"، "اقبال اور وطنیت" ظہیر کاشمیری کا مضمون "اُردو نثر کا سماجی پس منظر" نصیر الدین ہاشمی کا مضمون "خواتین کی ناول اور افسانہ نگاری" فراق گورکھپوری کا مضمون "شاعری کا نیا

روپ''، سید وقار عظیم کا مضمون ''مختصر افسانے کے پچیس سال''، حفیظ ہوشیار پوری کا ''اُردو غزل کے پچیس سال''، سید عبداللہ کا مضمون ''پرانی سوسائٹی میں شاعر کا مجلسی مقام'' اہم تنقیدی مضامین ہیں ''ہمایوں'' میں نامور مزاح نگار مرزا عظیم بیگ چغتائی اور مرزا فرحت اللہ بیگ کے مضامین شائع ہوئے یہ مضامین حقیقت و تخیل کی رنگ آمیزی سے مزین مضامین ہیں۔ اور فرحت اللہ بیگ اور عظیم بیگ چغتائی کی پر مزاح تحریروں نے بھی ''ہمایوں'' کو زبان کی شیرنی و دلکشی عطا کرنے کے ساتھ ساتھ ''تخیلی مزاج'' سے بھی آشنا کیا۔ مرزا عظیم بیگ چغتائی کا مزاحیہ مضمون ''ممتحن کا پان'' پر مزاح ہونے کے ساتھ ساتھ سلیس، روزمرہ کے چٹخارے کا ترجمان مضمون ہے۔ ہمایوں میں شائع ہونے والے ظریف مضامین قاری کو حظ و لطف کے ساتھ ساتھ زبان کی سادگی اور سلاست سے بھی آگاہ کرتے ہوئے اُردو زبان میں اسلوب بیان کی وسعت کا بھی احساس دلاتے ہیں۔ ''ممتحن کا پان'' کا یہ نثر پارہ ملاحظہ ہو:

> ''لاحول ولاقوۃ'' میں نے بھی بات کاٹتے ہوئے کہا ''ذرا غور تو کیجیے کہ بکری کی طرح پتے
> چبانا..... قسم خدا کی میں نے اپنے ساتھی کو مخاطب کر کے کہا۔ '' یہ چھالیا بھی خوب ہے!!
> گویا ایندھن یا لکڑی چبا رہے ہیں۔''''[۶۴]

بشیر احمد نے اخلاقی زوال کو بھانپتے ہوئے اپنے تجزیے میں کردار سازی پر مضامین شائع کیے جو نوجوانوں کو غفلت سے بیداری کے ساتھ ساتھ محنت شاقہ کا درس بھی دیتے نظر آتے ہیں۔ مثلاً ابو محمد ناقب کانپوری کا مضمون ''افلاس ترقی کا ذریعہ ہے۔'' سلطان حیدر جوش کا مضمون ''راست بازی'' شیخ محمد ضیاء الدین عمس کا مضمون ''نیک ادارے'' مجتبیٰ حسین کا مضمون ''ناکامی'' و دیگر مضامین اخلاقی تربیت اور مضبوط کردار سازی میں معاون و مددگار ثابت ہوئے ہیں۔ ''ہمایوں'' نے شخصیات کے روایتی تعارف پر مضامین نہیں لکھے بلکہ ان شخصیات کے متحرک اور فعال کردار پر روشنی ڈالی تاکہ افرادِ معاشرہ پر ان شخصیات کی سیرت و کردار کے مثبت اثرات مرتب ہوسکیں۔ مولوی حمید احمد خاں کا ''اسوہ حسنہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم'' ذات کامل پر اسم مضمون ہے۔ حامد علی خاں کا مضمون ''مادام کیوری''، اختر دہلوی کا مضمون ''مسز سروجنی نائیڈو''، بشیر احمد کا مضمون ''نور جہاں''، حامد حسن عظمی کا مضمون ''محمد تغلق''، مولوی عبدالمنعم کا مضمون ''گلبدن بیگم''، محمد یوسف خاں سلیم کا مضمون ''ارسطو''، محمد ابراہیم مدہوش کا مضمون ''آرٹ اور ٹالسٹائی'' و دیگر اہم مضامین ''ہمایوں'' کی مستحکم کردار سازی کی پالیسی کے عکاس ہیں۔ ترقی پسند تحریک نے ''ہمایوں'' کو بھی متاثر کیا اور اس دور کی تحریروں کے نمائندہ نثر نگار ظہیر کاشمیری، ممتاز حسین، احتشام حسین، اختر حسین رائے پوری نے اپنے مضامین ''ادب اور سماج'' کے حوالے سے ہمایوں میں شائع کیے۔ ترقی پسند تحریک نے ہندوستان کے ادیبوں کو بھی جدت، تنوع اور نئے موضوعات کی طرف راغب کیا۔ ''ہمایوں'' نے جدید



تقاضوں کا ساتھ دینے کا عزم کیا لیکن اپنی اخلاقی روایت کو بھی ملحوظ خاطر رکھا اور جدید ادب کی "اچھوتی جدتوں" سے "ہمایوں" کو مزین کیا۔ تحریک پاکستان سے لگاؤ کے باوجود بشیر احمد نے "ہمایوں" کو سیاسی رسالہ نہ بننے دیا بلکہ ادبی مزاج کے حامل اس جریدے کو قومی موضوعات بھی دیئے اور یوں ادب اور سیاست کے درمیان توازن قائم رکھا۔

نگار: نیاز فتح پوری نے فروری ۱۹۲۲ء کو بھوپال سے نگار نکالا۔ جس کے معاون مدیر مخمور اکبر آبادی تھے۔ نگار کا مطلب ہے آئینہ جس میں ہر رنگ کے جلوے دکھائی دیتے ہیں۔ ہر جلوہ صداقت پر محیط ہوتا ہے خود شناسی کے عمل سے گزرتا ہے۔ آغاز میں نیاز فتح پوری لکھتے ہیں:

> "یہ درست ہے کہ ایک علمی و تاریخی رسالہ میں سوائے خشک مضامین کے اور کچھ نہیں ہوتا لیکن اور تو اس امر کی کوشش کی جائے کہ یہ رسالہ اس حد تک نہ پہنچنے پائے اور اگر موضوع کے لحاظ سے کوئی مضمون ایسا نظر آجائے تو اس کو دیکھنے کی کوشش کرنی چاہیے کہ اصل مقصود آپ میں اس ذوق کا پیدا کرنا ہے۔ رسالے کا ایک حصہ بالالتزام ادبی مضامین کے لیے بھی وقف ہوگا لیکن اس میں وہ تحقیقی و تنقیدی مضامین بھی شامل گئے۔"[۶۷]

نگار خالص رومانوی رسالہ تھا۔ لیکن اس میں علمی، ادبی، سیاسی، تنقیدی و تحقیقی مضامین بھی نظر آتے ہیں۔ نگار کا پہلا مضمون نیاز فتح پوری کا ہے مضمون کا عنوان "شعر" ہے جس میں شعر کی تعریف، شعر کی اہمیت، شعر کی تاریخ بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اس بات کی بھی تائید کرتے ہیں کہ شعر کا جمالیاتی رنگ انسانی قلب نظر کی کیفیات کو تبدیلی سے ہمکنار بھی کرتا ہے یہاں وہ کروچے ہم خیال نظر آتے ہیں۔ انور علی "اُردو صحافت" میں لکھتے ہیں:

> "انہوں نے اپنا مشہور ماہ نامہ "نگار" ۱۹۲۲ء میں آگرہ سے جاری کیا۔ ۱۹۲۳ء میں یہ بھوپال اور ۱۹۲۷ء میں لکھنؤ سے منتقل کیا۔ ان مکانی تبدیلیوں کے باوجود نیاز صاحب نے اولین دو برسوں ہی میں پوری ملک میں اپنے رسالے کی دھاک باندھ دی۔"[۶۸]

نگار کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ نیاز کی جب مضامین نہیں ملتے تو وہ خودی مضامین لکھ کر رسالے کو سہارا دیا کرتے تھے۔ پہلے شمارے میں نیاز کے کئی مضامین ملتے ہیں اور پہلا شمارہ معیاری ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ اور چونکا دینے والا شمارہ تھا۔ نگار کے لکھنے والوں میں اس دور کے معروف ادیب شامل تھے۔ امتیاز علی تاج، مولوی محمود علی، حامد حسن قادری، مخمور اکبر آبادی، لطیف احمد، سرفراز حسین، مالک رام، محمد حفیظ سعید، سید مقبول احمد، مجنوں گورکھپوری، سجاد حیدر یلدرم، عبدالمالک آروی، امتیاز علی عرشی، عبادت بریلوی، خواجہ احمد فاروقی، ابواللیث صدیقی، بدر اصلاحی خاں، ممتاز حسین، سید مسعود رضوی، احتشام حسین و دیگر ارباب نثر و دیگر اکابرین ادب نے اپنی فلمکاری کے

جوہر دکھلائے ہیں اور تخلیقی تجربے کی صداقت میں ڈوب کر وہ گوہر نایاب نکالے ہیں۔ جو ادب کی پیشانی پر آب تہہ بن کر چمکے۔ نگار نے اسلوب کی جدت وندرت کے ساتھ ساتھ رومانوی لب ولہجہ سے جدید نثر کی ترویج میں بھرپور حصہ لیا اور اپنے دور، اپنے عہد کا خاص شعور وآگہی رکھتے ہوئے نیاز نے نگار کی پالیسی وضع کی۔ امتیاز علی تاج کا نثر پارہ رومانوی لب ولہجہ اور جمالیاتی حسن کا حسین امتزاج ہے۔ ''اے مطربہ'' کا نثر پارہ ملاحظہ ہو۔

> ''کیا تیرے بربط میں کوئی ایسا نازک تار نہیں، جس کی لرزش آواز نہ اختیار کر سکتی ہو؟ جو کرخت آواز بننے سے قبل کی کیفیات کو روشن بنادے۔ کیا واقعی اس لحہ کا کوئی راگ نہیں ہے۔ جب صبح اپنی بند آنکھوں کو کھولنے کی تمنا کرتی ہو یا جب شام کا دامن افق پر ایک قرمزی وہم بنجاتا ہو۔''[۱۹]

نگار خالص ''ادب لطیف'' کا عکاس رسالہ تھا۔ نیاز ایسی نثر کو ترجیح دیتے تھے جو شعری حسن وجمال سے پر ہو اور جن کو پڑھ کر قاری نہ صرف حظ ومسرت حاصل کرے بلکہ اس کے جذبات بھی متحرک ہو اور اس میں ایک ولولہ تازہ بھی بیدار ہو۔ نیاز نے نگار کو جس نہج پر چلایا وہ معیاری تھا اسی لیے نگار کی تعریف وتوصیف جلد ہی پاک وہند میں ہونے لگی اور اسکا اعتراف خود ایڈیٹر نیاز نے کیا ہے۔ نیاز لکھتے ہیں:

> ''ملک میں جس شوق کے ساتھ نگار کی پذیرائی کی گئی وہ بہت اُمید افزا ہے۔ ارباب ذوق نے جس لطف سے کام کر کے اپنی قیمتی رائیں ظاہر کیں وہ ہمارے لئے وجد ومسرت ہیں۔''[۲۰]

نیاز فتح پوری کے جریدے نگار پر رئیس التحریر لکھتا ہوتا تھا واقعی نیاز سیاسی، ادبی، علمی، تحقیقی وتنقیدی معاشی و سائنسی ہر قسم کے مضمون لکھنے میں مہارت رکھتے تھے۔ نگار کے ادبی مضامین کا محرک جدید اُنیسویں صدی کا ماحول بھی بنتا ہے جو قدیم تہذیب وثقافت کا دلدادہ بھی تھا اور جدید ماحول کے اثرات سے ہم آہنگ بھی تھا تبھی انسان دوستی کا پرچار کرنے والا یہ جریدہ ادبی مضامین انسانی دوستی کا بھرم بھی رکھتے ہیں اور اس کے خلاف سازشوں کو بے نقاب بھی کرتے ہیں۔ غور وفکر تحقیق کا مرکزی ستون ہے اور حقائق کی بازیافت تحقیق کی اصل پہچان ہے۔ نیاز کی تحقیقی بصیرت میں فکر وتدبر کے ساتھ ساتھ وسعت بھی ملتی ہے۔ نگار میں شائع ہونے والے تحقیقی مضامین میں علم وفن کی جستجو کارفرما نظر آتی ہے۔ تحقیقی مضامین کی خاصیت یہ ہے کہ تحقیقی مضامین میں حدود وامکانات کا خیال رکھتے ہوئے مضمون کی ہیت اور مواد کو مدنظر رکھنا لازم ہوا کرتا ہے۔ جس دور میں رسائل کا آغاز ہوا بہت کم محققین اس شعور سے آگاہ تھے۔ نگار کا اہم مقصد معلومات اور جستجوئے تحقیق تھا اس لیے نگار نے ایسے محققین کی آبیاری کی جو مقاصد تحقیق سے شناسائی

رکھتے تھے۔نگار میں سوانحی تحقیق، ادبی تحقیق اور دستاویزی تحقیقات ملتی ہے۔فارسی ادب پر بھی تحقیق کے نمونے نگار میں نظر آتے ہیں مولانا امتیاز علی عرشی کا مضمون ''علامہ آصفی نظامی'' عمدہ تحقیق کا نمونہ نیاز کی محققانہ جستجو، قوتِ فیصلہ اور عمیق مطالعہ پر نیاز کے کئی تحقیقی مضامین نگار کی زینت بنے۔محی الدین زور کا تحقیقی مضمون غالب کی ''ذہنیت''سید عبدالقادر سروری کا مضمون ''فن افسانہ نگاری'' محمد حفیظ سید کا تحقیقی مضمون ''دکن کی اُردو شاعری'' عبدالباری آسی کا تحقیقی مضمون ''نظامی گنجوی نایاب گمشدہ دیوان'' نیاز کی تحقیقی کاوش ''بانکی پور کی لائبریری'' ڈاکٹر نذیر احمد کا تحقیقی مضمون ''فارسی کے ساقی نامے'' و دیگر مضامین علمی متانت کا بہترین نمونہ تھے۔اُس دور کے قارئین ادب اور آج کے محققین ادب کے لیے علم تحقیق کی راہیں ہموار کرتے اور تحقیق گراہیں کھولتے نظر آتے ہیں۔''بانکی پور کی لائبریری'' نیاز کی خدا بخش اور خدا بخش لائبریری پر تحقیق سے اس لائبریری کے حوالے سے خدا بخش نے جو خواب دیکھے ان میں سے ایک خواب احاطہ تحریر کر کے یہ ثابت کرنا چاہتی ہوں کہ علمِ نافع ہی سے کارِ جہاں چلتا ہے۔نیاز لکھتے ہیں:

> ''لائبریری کے پاس گلی لوگوں سے بھری ہوئی ہے۔جب میں گھر سے باہر نکلا تو لوگوں نے کہا کہ تم یہاں بیٹھے ہو اور رسولؐ اللہ تمہارا کتب خانہ دیکھنے تشریف لائے ہیں میں وہاں پہنچا۔لیکن رسول اللہ ﷺ اس وقت تشریف لے جا چکے تھے اور دو کتابیں حدیث کی میز پر کھلی ہوئی رکھی تھیں۔
> لوگوں نے مجھ سے کہا کہ رسول اللہ نے انہیں دیکھا ہے۔
> چنانچہ ان دونوں کتابوں پر خدا بخش نے یہ نوٹ کردیا کہ کبھی لائبریری سے باہر نہیں جاسکتیں۔''[۱۷]

اٹھارویں صدی سے جہاں جدید علوم وفنون نے دُنیا کو چونکایا وہاں تنقید کے بھی اغراض و مقاصد مثلاً تشریح، حکم اور تربیت نے بھی ادب میں اپنی جگہ بنائی۔فن نقد کے حوالے سے براہ راست معیار تنقید کے مزاج اور فلسفہ تنقید کی توسیع وتشکیل بھی نگار کے ناقدوں کا اول اُصول تھا۔محمد اکبر خان حیدری کا قسط وار تنقیدی مضمون کلامِ آزاد(انصاری) محی الدین قادری کا مضمون ''حالی اور اُردو نثر'' مالک رام کا مضمون ''غالب و ذوق'' مجنوں گورکھپوری کا مضمون فانی نیاز کا ''فن نقد'' و دیگر ناقدین ادب کے مضامین کے لیے اور دلپذیر ہیں اور تنقیدی جملوں میں رومانوی لہجہ، ترنم اور لوچ کے ساتھ ساتھ جمالیاتی حسن سے یہ مضامین پر ہیں فانی پر مجنوں گورکھپوری کا ناقدانہ انداز نظر ملاحظہ ہو۔

> ''فانی کے مزاج وطبیعت کا شاعر داغ اور امیر کے رنگ پر قناعت کر کے بیٹھ نہیں سکتا تھا۔

> وہ احساس و تاثر کی بڑی شدید صلاحیت اور فکر و تامل کا نہایت قوی میلان لے کر پیدا ہوئے تھے۔ چنانچہ داغ اور امیر سے بہت جلد طبیعت سیر ہوگئی۔ اب انہوں نے میر و غالب کی طرح رجوع کیا جن سے اُن کو فطری مناسبت بھی تھی۔ دوسرے دور کے شروع میں فانی کے ہاں میر کا مہذب اور سنجیدہ سوز و گداز غالب کی حکیمانہ بالغ نظری اور مفکرانہ درک و بصیرت کے ساتھ حل ہو کر ایک بالکل نیا مرکب بن گیا ہے جس کی مثال فانی سے پہلے اُردو غزل میں نہیں ملتی۔"۲۷

نیاز نے نگار کے تحقیقی و تنقیدی مضامین کے حوالے سے یہ طریقہ کار اختیار کیا ہوا تھا کہ کسی بھی نکتہ سے اختلاف یا اتفاق کرتے ہوئے، نیاز مضمون کے آخر یا شروع میں اس کا اظہار ضرور کرتے تھے۔ انیسویں صدی میں رسائل کی یہ خوبی تھی کہ وہ کسی کارآمد تحقیق کے صلہ و ستائش میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھتے تھے۔ نگار نے قسط وار مضامین کے سلسلہ بھی دیگر رسائل کی طرح جاری کیا۔ احسن الظفر کا مضمون "روحِ تنقید"، پروفیسر سراج احمد علوی کا قسط وار مضمون "میر و نظیر"، سید صفدر حسین کا قسط وار مضمون "رشید بعد انیس" و دیگر مضامین نگار میں نظر آتے ہیں۔

اُس دور کے رسائل کی یہ خوبی تھی کہ وہ رسائل کے شخصیات نمبر نکالنے لگے تھے۔ نگار نے بھی شخصیات نمبر نکالے۔ مومن نمبر، ظفر نمبر، ریاض نمبر و دیگر شخصیات نمبر کے اندازِ نقد کو ادبی بصیرت سے ہمکنار کیا۔ اس دور کے رسائل کا یہ جدید اندازِ فکر تھا اور اس میں ادیب یا شاعر کے سوانح، کلام اور دیگر موضوعات پر فکری و علمی انداز میں بحث کی جاتی تھی۔ یہ سلسلہ نگار و دیگر رسائل میں جب بھی تھا اور آج بھی جاری و ساری ہے۔ نگار کے سیاسی مضامین اقوامِ عالم کی ترقی و تنزل کے ساتھ ساتھ انقلاب عوام کی داستان رقم کرتے ہیں اور سائنس کے حوالے سے دیگر رسائل کی طرح نگار میں بھی ہمیں کافی معلوماتی مضامین نظر آتے ہیں۔ ابر کیا ہے؟ ہوا کیا ہے؟ سورج کے گرد زمین کیوں گھومتی ہے و دیگر سائنسی مضامین جہاں کھوج و پرکھ کے ذریعے محققین کو شوق و ولولہ اور ایک تازہ اُمنگ سے ہمکنار کرتے ہیں وہاں اپنے علمی مواد کے ذریعے قارئین ادب کی عملی تشنگی بھی دور کرتے نظر آتے ہیں اور سائنسی ترقی کے عکاس بھی ہوتے ہیں۔ اُردو زبان کی ترویج کے لیے بھی نگار نے مضامین کا سلسلہ شروع کیا۔ محمد یونس سعد کا مضمون "اُردو زبان"، عبد المالک کا مضمون "زبان اُردو کے ارتقائی منازل" اُردو زبان کے تحفظ و آبیاری کے لیے نگار کی اہم اور کارآمد کوشش ہے۔ نیاز نے رومانوی لب و لہجہ کو "نگار" کی ضرورت و زینت بنایا۔ ان کے ہاں "نگار" میں رومانوی ماحول اور فضا جابجا نظر آتی ہے۔ نگار تحقیقی، علمی و تنقیدی رسالہ ہونے کے باوجود "ادب لطیف" کے مصنفین کے نثر پاروں کا عکاس ہے اور "جمالیاتی حسن" اور رومانیت کی نیاز بھرپور حمایت کرتے ہیں۔ فروری ۱۹۲۲ء

سے نکلنے والا رسالہ ''نگار'' نیاز فتح پوری کی ایک ایسی کاوش تھا جس نے اُصولِ نقد کا تعین کیا۔ تحقیق کے حسن اور صحت کو بھی پامال نہ ہونے دیا۔ تاریخی شعور بھی اُجاگر کیا۔ رومانیت کو مشرق میں متحرک کیا۔ صناعی و فنکاری سے حسن تخلیق کو چمکایا۔ سائنسی اسرار و رموز سے اس کائنات کے پردے چاک کیے۔ معاشرتی گرہن سے چھٹکارا بھی دلوانے میں کوشاں رہا اور سیاسی بساط پہ کھیلی جانے والی عوامی زندگی کو داؤ پر لگنے سے نہ صرف بچایا بلکہ انقلاب، اتحاد، عقل و دانش، محنت و سچائی کے زریں اُصولوں سے بھی روشناس کرایا۔ رومانیت کی آفرینش سے صنائع و بدائع کو زیرِ قلم رکھا اور تخیل کی اعلیٰ و ارفع پرواز کی بنا پر اس مغرب زدہ رومانوی تحریک سے برصغیر پاک و ہند کے قلمکاروں کو روشناس کرایا۔ ''نگار'' کے مضامین کا شعور، علم و آگہی دورِ حاضر کے قاری کو نہ صرف اس دور کی سیر کراتا ہے بلکہ ماضی کے دفینہ، ادبی خزائن سے متعارف بھی کراتا ہے اور حال کی کھوج لگانے پر بھی آمادہ جستجو کرتا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید اپنی کتاب ''پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ'' میں نگار کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''نگار کی حکمت عملی و ادبی میں اگرچہ فکری اور معلوماتی موضوعات کو اہمیت حاصل تھی لیکن شعور و نثر کو تخلیقی اصناف سے صرفِ نظر تخلیقی جست نے اُردو کی رومانی تحریک کو فروغ دینے سے معاونت کی۔''۴۷

نگار کے لکھنے والوں نے اپنی قلم کاری کے جوہر دکھلائے۔ ایک عہد، ایک تحریک اور ایک تاریخ نیاز فتح پوری کے جریدے ''نگار'' میں اُبھری مچلی، اور معنی و مفہوم کے لیے در وا ہوئے۔ اظہار کو زبان ملی، اسلوب کو جمالیاتی احساس سے متعارف بھی کرائی گئی اور یوں نگار کے نگار خانے میں صد ہزار جلوے دکھائی دینے گئے۔ ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ نیاز کی ذہانت نگار ہے۔ اور نگار کی رونق نیاز ہیں اور جب تک رسائل سے استفادہ کیا جاتا رہے گا نیاز و نگار دونوں زندہ رہیں گے۔

رسالہ جامعہ: جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ کا وہ ادارہ ہے جس نے اُردو زبان کے فروغ کے لیے اُردو زبان کو علمی مقاصد کے لیے استعمال کیا۔ اس ادارہ سے نکلنے والا رسالہ ''جامعہ'' علی گڑھ سے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیرِ نگرانی جنوری ۱۹۲۳ء میں منظرِ عام پر آیا۔ ۱۹۲۵ء میں ادارہ جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ سے دہلی منتقل ہوا پھر یہ جریدہ ستمبر ۱۹۲۵ء سے علی گڑھ کی بجائے دہلی سے جاری ہونے لگا۔ رسالہ ''جامعہ'' کے پہلے مدیر نور الرحمٰن تھے اور جلد ہی مولانا اسلم جیراج پوری نے اس رسالے کی ادارت سنبھال لی۔ محمد اسحاق اپنے مضمون ''رسالہ جامعہ کی علمی خدمات'' میں لکھتے ہیں:

> ''مارچ ۱۹۲۵ء کا شمارہ جامعہ اسلامیہ علی گڑھ کی تاریخ کا آخری شمارہ تھا اور ستمبر ۱۹۲۵ء کا

> شمارہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کا پہلا، جیسے اپریل تا ستمبر ۱۹۲۵ء کا مشترکہ شمارہ قرار دیا گیا۔ جگہ اور حالات کی تبدیلی کی غالباً دشواریوں پر قابو پانے کے لیے ستمبر ۱۹۲۵ء سے جامعہ کی ادارت میں مولانا اسلم جیراج پوری کے ساتھ جناب یوسف حسین خان کے نام کا اضافہ ہوا۔"[۴۷]

رسالہ "جامعہ" کی ادارت ۱۹۲۶ء تا ۱۹۴۷ء تک بدلتی رہتی۔ ڈاکٹر عابد حسین، ڈاکٹر عبد العلیم، پروفیسر محمد عاقل، ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی اس جریدے کے مدیر رہے۔ رسالہ "جامعہ" میں اُردو زبان کے فروغ کے ساتھ ساتھ اخلاقی، اصلاحی، تاریخی، سائنسی، سیاسی علمی مضامین ملتے ہیں۔ "رسالہ جامعہ" کے اغراض و مقاصد میں سب سے اہم مقصد اُردو زبان کی ترویج و اشاعت تھا۔ دوسرا مقصد اس رسالے کے اجرا کا تحقیقی مضامین کی اشاعت تھا اور تیسرا اہم مقصد ماضی کے تاریخی شعور کے ساتھ ساتھ حال کا عکس بھی اپنے تاریخی مضامین میں اُجاگر کرنا تھا۔ علمی افادیت کے تحت ترجمہ شدہ مضامین کی اشاعت اور اسلامی مضامین کے ذریعے اپنا ماضی الضمیر بیان کرنا بھی رسالہ "جامعہ" کے مقاصد تھے۔ رسالہ "جامعہ" کے لکھنے والوں میں مولانا اسلم جیراج پوری، ڈاکٹر یوسف حسن خاں، قاضی عبد الغفار، عطا الرحمٰن، نذیر نیازی، ڈاکٹر عبد العلیم، ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر عابد حسین، رشید احمد صدیقی، آل احمد سرور، ابو اللیث صدیقی، محمد یحییٰ تنہا، سید وقار عظیم جیسے اکابرین ادب شامل تھے۔ معیاری تحقیقی مضامین فکر و نظر کو جلا بخشتے ہیں۔ رسالہ "جامعہ" کے محققین مبادیات تحقیق سے بھی واقف تھے اس لیے ان کے تحقیقی مضامین صداقت پر مبنی ہیں۔ دلائل کے ساتھ ساتھ داخلی و خارجی شواہد پر مبنی یہ مضامین تحقیقی و جستجو کے عکاس ہیں۔ یہ تحقیق ادبی ہو یا تاریخی سائنسی ہو یا علمی تحقیق "جامعہ" کے محقق اپنے مضامین کے مواد کی بنیاد حقائق کے حصول کے مراحل سے لے کر حقائق کی تشریح و تعبیر پر رکھتے ہیں۔ ادبی تحقیق میں سائنٹفک طریقہ کار اپنایا جاتا ہے۔ شواہد و حقائق کے پیش نظر اپنے موضوع کو وسعت دی جاتی ہے۔ ایسے مضامین تحقیق کی جڑوں کو مضبوط کرتے ہیں۔ رسالہ جامعہ کی ادبی تحقیقی مضامین معلوماتی ہونے کے ساتھ ساتھ منطق و استدلال سے بھرپور ہیں۔ نصیر الدین ہاشمی کا مضمون "امین کی یوسف زلیخا" پیرس کے قومی کتب خانے سے حاصل کردہ مواد پر مشتمل ہے۔ یہ مضمون دکنی ادب پر نصیر الدین ہاشمی کی تحقیق و جستجو کی نشان دہی کرتا ہے۔ نصیر الدین ہاشمی لکھتے ہیں:

> "زیر بحث مثنوی یوسف زلیخا کا نمبر (۸۵۶) اور ان کی تعداد (۱۴۹) اور فی صفحہ (۱۴) سطر ہیں، نستعلیق میں لکھی گئی ہے مگر خوش خط نہیں ہے۔ یہ مثنوی محمد امین کی تصنیف ہے۔ ان کے متعلق قدیم تذکرہ جات ساکت ہیں۔ البتہ ڈاکٹر اشپرنگر نے اپنی فہرست میں اس

مثنوی کا ذکر کیا ہے اور اس کا پہلا شعر بھی بطور نمونہ درج کیا ہے۔ مؤلف اُردو نے قدیم
نے اس شیر نگر کی صراحت کو اپنی تالیف میں اُردو کا جامہ پہنایا ہے۔ مثنوی کے متعلق کوئی
مزید اضافہ نہیں کیا۔"۵ے

مولانا امتیاز علی عرشی کا مضمون "دیوان غالب" (اُردو) کے ابتدائی مطبوعہ نسخے اہم ہے۔ نصیر الدین ہاشمی کا مضمون "لندن اور پیرس" وغیرہ میں باقر آگاہ کی تصنیفات" مآخذ و مصادر کی تلاش معتبر کا عکاس مضمون ہے۔ مالک رام، امتیاز علی عرشی، ابو اللیث صدیقی اور محمد یحیٰ تنہا کے تحقیقی مضامین تحقیق کے بنیادی لوازم اور اس دور کے بدلتے ہوئے ادبی منظر کے ترجمان ہیں۔ "جامعہ" کے یہ مضامین ایک طرف تو کلاسیکی ادب کو محفوظ کرتے ہیں اور دوسری طرف ادب کا زندگی سے رشتہ جوڑتے ہیں۔ ڈاکٹر سید عابد حسین کا مضمون "مسلمانوں کی تعلیم اور جامعہ ملیہ" ہے جس میں تحقیق اور محقق کے رشتے کو یوں واضح کیا گیا ہے۔

"محقق کو اپنا کام نہایت دلیری سے کرنا چاہیے کیونکہ اسکا مقصد پاک اور برگزیدہ ہے
اور ظاہری مصالح سے بالاتر ہے۔"۶ے

فن نقد کسی بھی فن پارے کو مصائب و محاسن کی کسوٹی پر پرکھتا ہے۔ نقاد کا ذوق سلیم عمدہ و اعلیٰ ہوگا تو اسکی تنقید کا معیار بھی اعلیٰ ہوگا لیکن اگر نقاد ناقص ذوق کا مالک ہوگا تو تنقید بھی سطحی اور ناثراتی ہوگی۔ جامعہ کے تنقیدی مضامین کسی بھی فن پارے کا غیر جانبدارانہ تنقید کے تحت محاسبہ کرتے ہیں۔ ان مضامین میں فن پارے کی اعلیٰ تنقیدی ذوق کی مناسبت سے پرکھا جاتا ہے سید عابد علی عابد کا مضمون "غالب کی فارسی شاعری" قسط وار ہے۔ حامد حسن بلگرامی کا مضمون "ناول کیا ہے" بھی تنقید کی غرض و غائیت کے تحت لکھے گئے ہیں۔ آل احمد سرور کا مضمون "اُردو ادب ۱۹۴۱ء میں" ناقد اور تنقید کے باہمی ربط کو فروغ دیتا ہے۔ اس مضمون میں ۱۹۴۱ء میں شائع ہونے ادب کا تنقیدی احاطہ کیا گیا ہے اور اس مضمون میں ۱۹۴۱ء ہونے والی جنگ کی تباہ کاریوں اور ہولناکیوں پر بھی تبصرہ ملتا ہے۔ اور آخر میں حتمی رائے دیتے ہوئے آل احمد سرور لکھتے ہیں:

"سادگی، اصلیت اور جوش حالی کے نزدیک شاعری کے لیے ضروری چیزیں ہیں۔ خوشی کی
بات ہے کہ اُردو ادب میں یہ باتیں سب سے زیادہ نمایاں ہوتی جارہی ہیں۔ مشکل الفاظ
اور پیچیدہ اسالیب کے خلاف ردعمل ہو رہا ہے۔ گردوپیش کے حالات کا اثر بھی ہی۔"۷ے

"جامعہ" نے کلاسیکی ادب کے فروغ کے لیے بھی مضامین لکھوائے۔ "جامعہ" میں محمد یحیٰ تنہا کے کلاسیکی ادب پر مضامین ہیں۔ مثلاً "سودا"، "یقین" و دیگر کلاسیکی مضامین میں محمد یحیٰ تنہا نے سوانح کے ساتھ ساتھ کلام پر

بھی تبصرہ کیا ہے۔میر باقر علی کا مضمون ''ولی کا انوکھا بچپن'' ولی زبان کی مٹھاس کا عکاس ہے۔عبدالماجد دریا آبادی کا مضمون ''جوہر کی شاعری'' میں جوہر پر بے لاگ، اعلیٰ تنقید ملتی ہے۔لکھتے ہیں:

> ''وہ مشک ہی کیا جس کی خوشبو عطار کی تعریف وتعارف کے بعد سونگھنے میں آئے۔ جوہر کا کلام آگے خود ہی موجود ہے۔اس کے لیے ضرورت نہ کسی تمہید کی، نہ دیباچہ کی، نہ پیش نامہ کی ورق اُلٹیے اور لطف اندوز ہونا شروع کر دیجئے۔''۷۸

ابواللیث صدیقی کے مضامین ''امانت کی غزل گوئی'' اور ''لکھنوئیت کیا ہے'' بھی تنقید کے فروغ میں اہم کردار ادا کرتے ہیں اور اس دور میں بے لاگ کے تنقیدی رجحان کے عکاس ہیں۔جامعہ میں لکھے جانے والے طنز و مزاح کے مضامین جدت اور وسعت رکھتے ہیں اور قاری ان مضامین کو پڑھنے کے ساتھ ساتھ ان حالات، واقعات اور شخصیات کا بھی تجزیہ کرتا ہے۔جن پر مضمون نگار قلم اُٹھاتے ہیں۔فرحت اللہ بیگ کا مضمون ''نئی دہلی'' شہر دہلی سے واقفیت دینے کے ساتھ ساتھ دہلی شہر کی وضع قطع اور طرزِ معاشرت کا تجزیہ بھی کرتا ہے۔اور زبان کی سادگی و سلاست کا بھی ترجمان ہے۔فرحت اللہ بیگ کے مضمون کا نثرہ پارہ ملاحظہ ہو:

> ''لوگوں سے بھری موٹریں ادھر سے اُدھر یوں یوں کرتی چلی جارہی ہیں۔۔۔۔۔ہوائی چیلوں کی طرح جہاز سر پر منڈلا رہے ہیں۔فوجیں پیرا باندھے یہاں کھڑی ہیں۔وہاں کھڑی ہیں۔''۷۹

رشید احمد صدیقی کا مضمون ''طنزیات'' طنز کی ابتدا و ارتقا پر روشنی ڈالتا ہے اور یہ ایک معلوماتی مضمون ہے۔ حکیم اُلامت علامہ اقبال کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اُن کی پذیرائی ان کی زندگی میں ہی ہوگئی تھی۔انیسویں صدی کے دیگر رسائل کی طرح ''جامعہ'' میں بھی اقبال کی قدر شناسی پر مضامین ملتے ہیں تو اقبال کو ''اقبال'' کہلانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔مثلاً نورالحسن ہاشمی کا مضمون ''اقبال کا نوجوان'' اور اسلوب انصاری کا ''اقبال کا ذہنی ارتقا'' عظمت اقبال کا اعتراف ہے۔شوکت سبزواری کا ''اقبال اور قومیت'' مضمون ہے۔جبکہ محمد مجیب نے اقبال کے انتقال پر ''ڈاکٹر محمد اقبال مرحوم'' مضمون لکھا جس میں ان جملوں میں اقبال کی شاعری کی روح اور فلسفہ کو احسن طریق سے بیان کیا ہے۔محمد مجیب لکھتے ہیں:

> ''ڈاکٹر اقبال کا اپنی شاعری کو غزلوں، ترجموں اور قومی نظموں سے شروع کرنا ہے اور آخر میں اسلام کا دل و دماغ بن جانا قدرتی نشوونما کا ایک سلسلہ تھا۔''۸۰

اُردو زبان کو وسیع کرنے ساتھ ساتھ علمیت سے مالا مال کرنے پر بھی ''جامعہ'' نے مضامین دوسری زبانوں

سے ترجمہ کروانے مثلاً جے ایس مل کا مضمون ''محکومیت نسواں'' سے جسے مولوی معین الدین نے ترجمہ کیا ہے۔ ''جان کٹیس کی زندگی'' مضمون بدرالدین اعظم کا ترجمہ شدہ مضمون ہے۔ اقتصادی طور پر انیسویں صدی کا ہندوستان کمزور ہو چکا تھا اس لیے اس دور کے مضامین ہندوستان کے اقتصاد کا تجزیہ اپنے مضامین میں پیش کرتے رہتے تھے ایسے مضامین بیداری قوم کے حوالے سے بھی لکھے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کا مضمون ''ہندوستان کی معیشت زرعی'' اور ڈاکٹر حسین کا مضمون ''مسئلہ آبادی'' کے متعلق جدید تحقیق اس نوعیت کے مضامین ہیں۔ جامعہ نے اُردو زبان کے تحفظات کے لیے بھی زبان اُردو کو ذریعہ تعلیم بنایا ہے اور رسالہ ''جامعہ'' نے بھی اُردو زبان کے حوالے سے سلسلہ بحث کا آغاز کیا۔ اُردو زبان کی اشاعت و ترویج کے لیے اُردو زبان پر کئی مضامین اس جریدے میں شائع ہوئے۔ پروفیسر مجیب رضوی ''جامعہ کی اُردو خدمات'' میں لکھتے ہیں:

> ''جامعہ کو ابلاغ کی زبان درکار تھی کیونکہ انہیں عوام تک علم کی روشنی پہنچانی تھی۔ اس لیے ضروری تھا کہ اُردو نثر کو شعر پرستی سے نجات دلائی جائے یا اسے مبالغے سے پاک کر کے اس میں Exactness پیدا کی جائے۔ الفاظ کا غیر ضروری استعمال ترک کیا جائے۔ اس سلسلے میں جامعہ نے جو کام کیا۔ وہ اُردو کے لیے قابل فخر اور قابل ستائش ہے۔''[۸۱]

جامعہ ملیہ اسلامیہ کا رسالہ ''جامعہ'' بھی اُردو کے حوالے سے اسی پالیسی کو اپنائے ہوئے تھا۔

مختصر یہ کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کا رسالہ ''جامعہ'' ایک تحقیقی رسالہ تھا۔ اس میں مذہبی مناظر بھی پیش کیے جاتے تھے۔ تاریخی، علمی مضامین قرائین کی نشاندہی کرتے تھے اور سیاسی مضامین معاشرتی زوال پر ضرب کاری لگاتے تھے۔ سادہ اور واضح اسلوب نے اس جریدے کو مقبول و معروف بنا دیا۔ اور ''جامعہ'' اپنے دور کے اہم رسالوں میں سے ایک رسالہ تھا۔

نیرنگِ خیال: حکیم محمد یوسف حسن نے جولائی ۱۹۲۴ء کو یوسفیہ کتب خانہ بازار بارود خانہ لاہور سے ''نیرنگِ خیال'' نامی جریدے کا آغاز کیا۔ اس جریدے کی ضخامت کم از کم ۵۰ صفحات پر مشتمل تھی۔ فی پرچہ ۵ آنے اور ششماہی ایک روپیہ بارہ آنے تھے۔ جبکہ سالانہ چندہ تین روپے تھا۔ ''نیرنگ خیال'' کے جوائنٹ ایڈیٹر محمد دین تاثیر تھے۔ ''نیرنگ خیال'' کے پہلے پرچے میں حکیم محمد یوسف حسن ''نیرنگ خیال'' کے اغراض و مقاصد کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ہمارا مدعا قوم کے احاطہ نظر کو وسعت دینا ہے اور یہ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ مہذب دنیا کے ہر شعبہ خیال کو ادبی لباس میں پیش کیا جائے۔ معاشرتی، مذہبی، تعلیمی، تاریخی غرض کہ

ہر قسم کے مضامین ہونگے۔ مگر تنوع کے ساتھ ساتھ مقصد وحید ہر وقت پیش نظر رہیگا کہ ہر
مضمون ایک ادبی تحریر ہو.....
ہمارے مضامین قومی احاطہ نظر کی توسیع کے لیے ملک کی ہر ضرورت کو پیش نظر رکھتے ہوئے
ہوں گے۔''۸۴

''نیرنگ خیال'' کے ذریعے سب سے پہلے رسائل میں تصاویر شائع کرنے کا آغاز ہوا۔ اکثر تصاویر عبد الرحمان چغتائی کی صناعی کا شکار ہوئی تھیں اور واقعاتِ حاضرہ کے حوالے سے بھی تازہ ترین تصاویر ''نیرنگ خیال'' میں شائع ہوتی تھیں۔ معنوی اور صوری لحاظ سے جلد ہی ''نیرنگ خیال'' نے میدانِ صحافت میں اپنا اعلیٰ مقام بنالیا۔ ''نیرنگ خیال'' کے پہلے شمارے کے لکھنے والے مضمون نگار ریاض حسین، محمد اسلم جیراج پوری، ملک عبدالقیوم، مولانا عبداللہ، عبدالرحمٰن چغتائی، محمد دین تاثیر، حکیم محمد یوسف حسن تھے۔ ''نیرنگ خیال'' کا پہلا پرچہ ادبی محاسن کا پرچہ تھا۔ اس کی زبان نہ تو مرصع تھی اور نہ ہی خشک بلکہ دل چسپ اور سحر انگیز ضرور تھی۔ حکیم صاحب ''ادب لطیف'' کے خلاف ہرگز نہ تھے بلکہ اُدب لطیف'' کو ادبیات کا مرکز و محور نہیں گردانتے تھے بلکہ مذہب زندگی کا حصہ ضرور سمجھتے تھے۔ ''نیرنگ خیال'' کے لکھنے والوں میں حکیم محمد یوسف، محمد دین تاثیر، نیاز فتح پوری، علم الدین سالک، امتیاز علی تاج، حامد اللہ افسر، پطرس بخاری، سید نجیب اشرف ندوی، فرحت اللہ بیگ، شوکت تھانوی، ممتاز حسن، مولانا محمد اسلم جیراج پوری، عبدالرحمٰن بجنوری، سید وقار عظیم، شوکت تھانوی، مرزا عظیم بیگ چغتائی، امیر شیر علی سرخوش، عبدالرؤف عشرت لکھنوی، ڈاکٹر لفکس نیازی و دیگر نثر نگار شامل ہیں۔ آغاز میں ''نیرنگ خیال'' رومانوی لب و لہجہ کا عکاس جریدہ تھا۔ اس جریدے میں تحقیقی، تنقیدی، سیاسی، معاشرتی، مزاحیہ مضامین شائع ہوا کرتے تھے۔ سید امتیاز علی تاج کا ''شاہکار ڈرامہ'' ''انارکلی'' بھی پہلی بار ''نیرنگ خیال'' میں شائع ہوا رومانوی انداز کے حامل جریدے ''نیرنگ خیال' نے اسی وقت اپنی پالیسی تبدیل کی جب ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا اور ''نیرنگ خیال'' اس تحریک سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔ اور اس تحریک کے زیر اثر بھی مضامین لکھے گئے۔ ''نیرنگ خیال'' کے مضامین کا مقصد صرف علم کی ترسیل ہی نہ تھا بلکہ قارئین ادب کے ذوق سلیم کو اُبھارنا اور اُجاگر کرنا تھا۔ یہ ہی وجہ تھی کہ ہر مزاج اور ہر ذوق کے افراد ''مضامینِ نیرنگ خیال'' سے مستفید ہوا کرتے تھے۔

''نیرنگ خیال'' کے سالنامے بڑی اہمیت کے حامل تھے۔ حکیم محمد یوسف کو ادب کی ہر شاخ اور ہر صنف پر عبور حاصل تھا وہ ایک ایسے ایڈیٹر تھے جو جہل سے نبرد آزما ہو کر عوام الناس کو علمی شعور سے آگاہ کرتے تھے انکا جریدہ علمی توجہات کا پیش خیمہ تھا۔ ''نیرنگ خیال'' کی ایک کاوش اس کے یک موضوعی نمبر تھے جو اپنے اندر ادبی کشش رکھتے

تھے جیسے ''عید نمبر''، ''اقبال نمبر''، ''صنف نازک نمبر''، ''ڈرامہ نمبر مزید برآں'' ''ایڈیٹر نمبر'' بھی ''نیرنگ خیال'' کے توسط سے پہلی بار بار منظر عام پر آیا۔ ''ایڈیٹر نمبر'' کے اوپر لکھا ہوا کرتا تھا۔ ''نیرنگ خیال کا خاص نمبر جسکے تمام مضامین ایڈیٹر کے قلم سے ہیں۔'' نمبر حکیم صاحب کی ذہانت، قابلیت اور محنت کا عکاس نمبر ہوتا تھا۔

سید امتیاز علی تاج جولائی ۱۹۳۰ء کے ''ایڈیٹر نمبر'' میں حکیم صاحب کو سراہتے ہوئے ان کی جدت پسندی قابلیت، نظر انتخاب اور ذوق ادب پر تبصرہ کرتے ہیں۔ ''نیرنگ خیال'' کا رجحان موضوعات کے حوالے سے ملا جلا تھا۔ اس میں تحقیقی، تنقیدی معاشرتی، علمی موضوعات نظر آتے ہیں۔ لیکن کہہ سکتے ہیں کہ ''تاریخی موضوعات'' ''نیرنگ خیال'' کا طرہ امتیاز تھے۔ یہ تاریخی موضوعات ''تاریخ اور مورخ کے اٹوٹ رشتے کے ترجمان ہیں۔ سید عبدالسبحان ناظر کا تاریخی مضمون ''سلطان محمود غزنوی کی خامیاں'' مختلف کتب کے مستند تحقیقی حوالوں سے مرتب کیا گیا۔ سید حسن برنی جو ایک مشہور مورخ ہیں اُن کے مضامین بھی ''نیرنگ خیال'' میں شائع ہوتے تھے۔ ''لاہور کی تاریخی اہمیت'' حکیم محمد یوسف حسن کا تاریخی مضمون ہے۔ سید امتیاز علی تاج کا مضمون ''ایک قدیم تہذیب کے آثار'' سندھ کے آثارِ قدیمہ پر ہے جو سر جان مارشل ڈائریکٹر جنرل محکمہ آثار قدیمہ کے مضمون (جو کہ ٹائمز آف انڈیا میں قسط وار شائع ہو رہا تھا) کے بعض اہم نکات پر مبنی مضمون ہے۔ سید امتیاز علی تاج کی مورخانہ تحریر سادگی کے ساتھ ساتھ معلومات بھی فراہم کرتی ہے: لکھتے ہیں:

> ''تقریباً ہر گھر میں مہریں اور بعض ایسی چیزیں برآمد ہوئی ہیں۔ جن سے یہ نتیجہ بھی نکال لیا گیا کہ یہاں کے باشندے لکھنے پڑھنے کے فن سے واقف تھے اور خاص وضع کے حروف و شکلیں بنا بنا کر تجارت وغیرہ میں اپنا کام چلاتے تھے۔''[۸۳]

''نیرنگ خیال'' نے اپنے اخلاقی مضامین کے ذریعے عوام الناس کی فطرت اور ذہنیت کی عکاس کرنے کے ساتھ ساتھ اُن کی حیثیتوں کا تدراک بھی کیا۔ ''نیرنگ خیال'' کے معاشرتی و اخلاقی مضامین مثلاً فخر نظامی کا مضمون ''گداگری''، محمد علی خاں اثر رامپوری کا مضمون ''عید اور اسلام'' اور حضرت دائرس کا مضمون ''چکر'' و دیگر مضامین افرادِ معاشرہ کی رہبری کرتے نظر آتے ہیں۔ ذرائع ابلاغ کا ذریعہ انیسویں صدی میں یہ اخبارات و رسائل ہی تھے اور نگر نگر کی معلومات ''نیرنگ خیال'' کے معلوماتی مضامین کے ذریعے ملا کرتی تھیں۔ مثلاً حکیم محمد یوسف حسن کا مضمون جدید افغانستان، محمد عبدالحق کا مضمون ''چین و جاپان'' اور دیگر مضامین اپنے قارئین کو نئی نئی معلومات سے آگاہ کرتے تھے۔ اُنیسویں صدی کے رسائل میں اُردو اور اسکی ابتداء اصلاح زبان نشوونما، خامیوں، غلطیوں کے متعلق بھی مضامین لکھے جاتے تھے۔ تاکہ اُردو زبان کے تحفظ کے ساتھ ساتھ اس زبان کو بے وارثی اور کمزور سمجھنے والوں کو یہ

باور کرایا جائے کہ اُردو زبان کا مستقبل روشن اور تابناک ہے۔ ''نیرنگ خیال'' نے بھی دیگر رسائل کی طرح اُردو کی دائمی اور مستقل حیثیت منوانے کی یا ذمے داریاں اُٹھائیں۔ روشن آراء راؤ اپنے مقالے ''ادبیات اُردو کے ارتقا میں رسائل کا کردار'' میں ''اُردو زبان اور نیرنگ خیال'' کے حوالے سے لکھتی ہیں:

> ''اُردو زبان کے نشیب و فراز اس کی ترقی میں رکاوٹ کی وجوہات اور وسعت دینے کے اسباب پر بھی ''نیرنگ خیال'' میں بہت کچھ لکھا گیا۔ ہندوستان میں اُردو ادب کی ترقی کے لیے تقریباً تمام رسائل کام کرتے رہے انداز مختلف تھے۔ تاہم اُردو کا دامن وسیع کرنے اور سرمایہ الفاظ میں اضافہ کرنے کی سعی ''نیرنگِ خیال'' نے بھی۔''۸۴

خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی کا مضمون ''مشکلاتِ زبان'' میں اُردو زبان میں تعلیم پر زور دیا ہے لکھتے ہیں:

> ''آج اگر ہماری زبان میں ہماری تعلیم شروع ہو جائے اور ہم اسی زبان میں علمی اور تاریخی، منطق، فلسفہ، طب یونانی ڈاکٹری پڑھ کر گریجویٹ بن جائیں تو ہمارا ملک غیر ملکی زبان کی غلامی سے نجات پا جائے اور ہماری تعلیم میں بھی آسانی ہو یعنی جو مدارج ہم دس برس میں طے کرتے ہیں وہی چھ برس کی معیاد میں ختم ہو جائیں۔''۸۵

ماہر القادری کا مضمون ''اُردو ہندی کا قضیہ'' اور سر عبد القادر کا مضمون ''اُردو کا مستقبل'' تحفظاتِ اُردو پر لکھے گئے۔ مضامین ہیں۔ سر عبد القادر اُردو کے مستقبل کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''اس زبان میں بہت حلاوت ہے۔ جو ہندی کی مٹھاس اور فارسی کی شرینی سے ملکر پیدا ہوئی ہے اب بعض نئی تبدیلیوں کی مدد سے جو انگریزی کی راہ میں اس میں داخل ہوئی ہیں۔ یہ جدید زمانے کے ہر قسم کے خیالات کی بخوبی ترجمانی کر سکتی ہے۔''۸۶

اس دور کے اکثر رسائل میں انیسویں صدی کے نا آسودہ اور زوال پذیر معاشرے کی کمزوریوں سے عوام الناس کو آگاہ کرنے کے ساتھ ساتھ ان کمزوریوں کا تدارک طنز و مزاح پر مبنی مضامین کے ذریعے کیا جاتا تھا حکیم محمد یوسف حسن نے بھی ''نیرنگ خیال'' میں طنز و مزاح پر مضامین بڑے اہتمام سے شائع کیے۔ فرحت اللہ بیگ، رشید احمد صدیقی، احمد شاہ پطرس بخاری، مرزا عظیم بیگ چغتائی، شوکت تھانوی و دیگر مزاح نگاروں کے مضامین ''نیرنگ خیال'' کی زینت ہے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کا مضمون ''بڑا مزا اس ملاپ میں ہے جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر'' متاثر کن ہے اور ازدواجی زندگی کے نشیب و فراز کا احاطہ اس مضمون میں کیا گیا ہے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ ہی کا دوسرا مضمون ''اُونہہ'' انسانی نفسیات کا شاہکار مضمون سے لکھتے ہیں:

> ''ہندوستان میں بھی اس ''اونہہ'' کا کچھ کم زور نہیں رہا۔ نادر شاہ چڑھا چلا آ رہا ہے۔ محمد شاہ

بادشاہ رنگ رلیاں منا رہے ہیں۔ پرچہ لگتا ہے کہ نادر لاہور تک آ گیا بادشاہ سلامت
"اُونہہ" کر دیتے ہیں"۸۷

شوکت تھانوی کا مضمون "دیوانِ غالب کی مزاحیہ شرح" رشید احمد صدیقی کا مضمون "کچھ کا کچھ" اور پطرس بخاری کا "بائیسکل" و دیگر مضامین طنز و ظرافت پر اہم مضامین ہیں اور معاشرتی ناہمواریوں کے عکاس مضامین ہیں۔ سید امتیاز علی تاج کا مضمون "چچا چھکن نے ردی نکالی" "چچا چھکن" کے مزاحیہ کردار کی تخلیق ہے۔ خود حکیم محمد یوسف حسن لکھتے ہیں:

"مزاحیہ مضامین "نیرنگ خیال" کا طغرائے امتیاز رہے ہیں چنانچہ یہ عید نمبر بھی مزاحیہ
مضامین سے لبریز ہے۔"۸۸

حکیم محمد یوسف حسن کے اقبال سے گہرے مراسم تھے۔ دونوں دیرینہ ہمدم تھے۔ اس لیے "نیرنگ خیال" نے اقبال شناسی کا شعور ادبی دنیا میں بیدار کیا۔ اور اقبال پر "نیرنگ خیال" میں مضامین کا سلسلہ بڑے ذوق و شوق سے جاری کیا۔ "نیرنگ خیال" میں حکیم محمد یوسف حسن کا مضمون "اقبال" اور قاضی عبدالغفار کا مضمون "اقبال کا پیغام" ہے جبکہ عبدالرحمٰن بجنوری کے انگریزی مضمون کا ترجمہ مالک رام نے اسرار و رموز مثنویات اقبال کیا ہے۔ یہ مضامین حیاتِ اقبال میں اقبال کی قدر شناس اور عظمت اقبال کا اعتراف ہیں۔ "ادب لطیف" کے حوالے سے "نیرنگ خیال" کے موضوعات کا جائزہ لیں تو یہ موضوعات جمالیاتی ذوق کے آئینہ دار ہیں لیکن کہیں کہیں ان نثر پاروں میں ابتدا اور سطحی رومانیت بھی نظر آتی ہے لیکن مجموعی طور پر یہ نثر پارے غم و خوشی کے جلو میں جذباتی فضا قائم کرتے ہیں۔ غلام حیدر کا "خاموش متکلم سے خطاب"، محمد عبداللہ غزنوی کا "عشق پروانہ سے سیکھ" زبان شیریں میں لکھے گئے ہیں۔ بشیر احمد بشیر کا نثر پارہ "دیوانہ" استعاراتی زبان کا حسن سمیٹے ہوئے ہے۔ نثر پارہ ملاحظہ کیجیے:

"اگر اے دوست! تو نے طوفان کی سعوبتوں سے تنگ آ کر پتوار کے ٹکڑے کر دیئے
اور بادبان کھول دیئے۔ موجوں کے زیر و بم پر مسکراتا رہا۔ ہوا اور پانی کی جنگ پر ہنستا رہا۔
صرف ہنستا رہا۔ تو نہایت ہی دور اندیش ہے۔"۸۹

تحقیق نیا پن چاہتی ہے۔ اور نئی دریافت تحقیق کی اصل میراث ہے۔ "نیرنگ خیال" کے تحقیقی مضامین، تحقیق کے امکانات و رجحانات کو واضح کرتے ہیں۔ حکیم محمد یوسف حسن کا تحقیقی مضمون "ہندوستانی ڈرامے" فن ڈرامہ کے ارتقاء و زوال پر مبنی مضمون ہے اور تحقیق کے امکانات کو یہ واضح کرتا ہے۔ ایسے تحقیقی مضامین کھوج و جستجو کے در کھولتے ہیں اور نو آموز محققین کو کام پر آمادہ کرتے ہیں نصیر الدین ہاشمی نے یورپ میں موجود دکنی نسخے دریافت کیے

اور یہ اُن کی قابل قدر تحقیقی دریافتیں ہیں۔ ''نیرنگ خیال'' نے یورپ میں موجود دکنی خزائین پر ہونے والی تحقیق سے قارئین ادب کی روشناس کرایا۔نصیرالدین ہاشمی کے مضامین مثلاً ''یوسف زلیخا'' و دیگر مضامین ''نیرنگ خیال'' میں نظر آتے ہیں۔نصیرالدین ہاشمی کی تحقیقی دریافت ''پدماوت کے قصے'' انڈیا آفس لائبریری لندن کا دریافت کردہ نسخہ ہے۔نصیرالدین ہاشمی نے اپنی تحقیق سے ثابت کیا کہ اس قصے کو فارسی اُردو میں مختلف مصنفین نے اپنی تحقیقی کاوشوں سے نظم کیا ہے۔ہاشمی صاحب اس کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''اُردو میں ان دو دکھنی مثنویوں کے سوا ایک اور مثنوی بنام مثل شمع و پروانہ مرتب ہوئی ہے۔اس کو اول ضیاءالدین عبرت نے شروع کیا تھا مگر مکمل نہ کر سکے۔اسکے بعد اس کو غلام علی عشرت نے مرتب کیا ہے اور لکھنو سے ۱۸۵۸ء میں شائع کیا ہے۔''۹۰

''قصہ چندر بدن و مہیار'' بھی نصیرالدین ہاشمی کے تحقیقی مضامین کی کڑی ہے۔ چراغ حسن حسرت کا تحقیقی مضمون ''مصطفیٰ ندیم اُردو زبان کا ایک ترک شاعر'' بھی تحقیقی مزاج لیے ہوئے ہے۔''نیرنگ خیال'' کے تحقیقی و تدریسی مضامین کے مختلف متنوں کی دریافت وتدوین کا شوق نوآموز محققین میں پیدا کیا اور یہ تحقیقی مقالات تحقیق و علم کی آبیاری کرنے میں مددگار و معاون ثابت ہوئے۔اکثر مضامین داخلی شہادت کو بنیاد بنا کر لکھے گئے ہیں۔ادب زندگی کو پرکھا اور اعلیٰ ادبی تخلیق وجود میں آتی ہے تو تنقید تخلیق کو پرکھتی ہے اور یوں تنقید کی غرض و غائیت کا اصل مفہوم سمجھ میں آتا ہے اور منصب تنقید سے شناسائی ہوتی ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ ہر نئی تخلیق اپنے اُصول تنقید خود وضع کرتی ہے۔عدل و انصاف تنقید کا زریں اصول ہے اور صداقت وغیرہ جانبداری تنقید کی میراث ہے۔تنقید نقاد کی فہم وفراست کا امتحان بھی لیتی ہے۔

''نیرنگ خیال'' کے تنقیدی مضامین لکھنے والے نقاد جب کسی فن پارے کی قدر متعین کرتے ہیں تو جھوٹ اور سچ کے معیار پر اُس فن پارے کو پرکھتے ہیں۔نیرنگ خیال میں تنقید کے حوالے سے جو مضامین لکھے گئے ان میں سے بیشتر سوانحی، ادبی اور صنفی تنقید پر مبنی ہیں۔''نیرنگ خیال'' میں پنڈت شیونرائن شمیم کا مضمون ''میر تقی میر'' مختصر انداز میں ''میر'' کے سوانح وکلام پر روشنی ڈالتا ہے خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی کا مضمون صفدر مرزا پوری سوانحی و ادبی مضمون ہے جس میں خاص انداز سے صفدر مرزاپوری کے اُن غزلوں سے اُن کی قدر متعین کی ہے جو انہوں نے مختلف شاعروں میں پڑھی اور ان شاعروں میں بہترین شاعر قرار دیئے گئے۔ثمر میرٹھی کا مضمون مرزا مائل دہلوی پر محمد عبداللہ الغنی کا مضمون شیکسپیئر پر مختصر ہے۔

''نیرنگ خیال'' میں ادبی تنقید کے مضامین قدیم وجدید شعرا کا معیارِ نقد پر محاسبہ کرتے ہیں اور نوآموز ناقد

کو تنقید برائے تنقید اور تنقید برائے تنقیص سے آگاہ کرنے کے ساتھ ساتھ ذوق انتقاد سے بھی آگاہ کرتے ہیں۔ عدل وانصاف اور توازن جو تنقید کا خاصہ ہیں 'نیرنگ خیال' کے ادبی تنقیدی مضامین ان سے نو آموز ناقدین کو بہرہ ور کرتے ہیں ادبی تنقیدی مضامین میں مولانا نمکین کاظمی کا مضمون خوش مذاقی اور فرحت اللہ بیگ، سید اظہار الحسن کا مضمون سید سجاد حیدر، حامد افسر اللہ کا مضمون میر کی شاعری، و دیگر مضامین عمدہ مضامین ہیں۔ یہ تنقیدی مضامین مصنفین وشعراء کے فن پاروں پر حکم لگاتے ہیں، ان کی وضاحت کرتے اور قدر ومراتب کا تعین کرتے ہیں۔ اکبر کے کلام میں سوز وگداز اور دردمندی کو سید وقار عظیم نے اپنے مضمون 'اکبر اور تغزل' میں ناقدانہ بحث کی ہے اور تحقیق میں ثابت کیا ہے کہ اکبر کے ہاں تغزل اُن کے اشعار میں کسک، تڑپ اور چوٹ کی عکاسی کرتے ہیں۔ اور یہ مضمون تحقیق وتنقید کے لازم وملزوم ہونے کا متصرف بھی ہے۔ غلام مصطفیٰ خان اپنے مضمون ''فن تحقیق'' میں لکھتے ہیں:

> ''تحقیق بظاہر تنقید سے مختلف ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں فن ساتھ ساتھ چلتے ہیں'' ۹۱

سید وقار عظیم 'اکبر اور تغزل'' میں لکھتے ہیں:

> ''غزلوں میں بھی اکبر کا مخصوص رنگ طبیعت اکثر اوقات نمایاں ہوتا ہے۔ ظرافت کی چاشنی تغزل میں ایک خاص لطف پیدا کر دیتی ہے۔ صرف ایک شعر لکھتا ہوں۔ کیا خوب کیا ہے۔
>
> ؎ وصل ہو یا فراق ہو اکبر
> جاگنا ساری رات مشکل ہے'' ۹۲

مبشر علی صدیقی کا تنقیدی مضمون ''اُردو نثر کے ارتقاء میں حالی کا'' حصہ مختصر ہونے کے باوجود اہم ہے۔

اصناف نظم ونثر پر 'نیرنگ خیال'' میں جو تنقیدی مضامین نظر آتے ہیں وہ ان اصناف کے متحرک اور فعال ہونے یا نہ ہونے کا پتا دیتے ہیں۔ مظہر انصاری کا مضمون 'افسانے کا عنوان'' اہم تنقیدی مضمون ہے جس میں افسانے کے پلاٹ، کردار اور اسلوب کے ساتھ ساتھ افسانے کے عنوان کو بھی اہمیت دی گئی ہے۔ افسانے کے عنوان کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''عنوان کو افسانے کا نمائندہ ہونا چاہیے کیونکہ اس طرح افسانے کا تاثر زیادہ سے زیادہ قوت کیساتھ پڑھنے والے کے دماغ پر اثر انداز ہوسکتا ہے۔ بارہا آپ دیکھیں گے کہ افسانہ ختم کرتے ہی قاری کا ذہن عنوان کی طرف بازگشت کرتا ہے۔'' ۹۳

مولانا سیماب وارثی اکبر آبادی کے مضمون ''غزل'' میں غزل کی ابتدا اور ارتقا پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

مختصر یہ کہ تحقیق وتنقید کی نئی جہات سے ''نیرنگِ خیال'' سے روشناس کرایا، تاریخی مضامین کے ذریعے اس دور میں اس کرۂ ارض اور خاص طور پر برصغیر پاک و ہند کے تاریخی پس منظر کو واضح کیا۔طنز وظرافت پر مبنی مضامین معاشرے کے کھوکھلے اور فرسودہ روایت کی بیخ کنی کا سبب بنے معلوماتی مضامین کے ذریعے ''نیرنگ خیال'' نے توقیر علم بڑھائی اور اُردو زبان کے تحفظات کا بھی پاس رکھا۔لسانی مطالعات اور اُردو زبان کے نظریات پر ان مضامین سے کافی حد تک آگاہی ملتی ہے۔''نیرنگ خیال'' اپنے اعلیٰ معیار کی بنا پر اپنے آغاز ہی سے مقبول ومعروف جریدہ تھا اور اس جریدے کا یہ معیار ابتدا سے ۱۹۴۷ء تک قائم رہا۔حکیم محمد یوسف حسن کی محنت، قابلیت اور ذہانت کا ثمر عظیم تھا کہ ''نیرنگ خیال'' ایک عرصہ تک عوام کے ذہنوں پر راج کرتا رہا۔

اورینٹل کالج میگزین: اورینٹل کالج میگزین فروری ۱۹۲۵ء میں اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی لاہور سے جاری ہوا۔اس کے مندرجہ ذیل اغراض ومقاصد بنائے گئے۔آغاز میں اورینٹل کالج میگزین میں ڈاکٹر محمد اقبال کی زیر ادارت حصہ اردو، عربی و فارسی میں مرتب ہوا اور ڈاکٹر لکشمن سروپ کی زیر ادارت حصہ سنسکرت مرتب ہوا اور بھائی بے انت سنگھ پنجابی کے مدیر تھے جبکہ اورینٹل کالج میگزین کے چیف ایڈیٹر مولوی محمد شفیع تھے۔اورینٹل کالج میگزین کے اغراض و مقاصد کے حوالے سے اس کے اجراء پر مدیر اورینٹل کالج میگزین لکھتے ہیں۔

> ''اس رسالے کے اجرا سے غرض یہ ہے کہ احیاء وترویج علوم شرقیہ کی تحریک کو تا حد امکان تقویت دیجائے ----کوشش کیجائیگی کہ اس رسالہ میں ایسے مضامین شائع ہوں جو مضمون نگاران کی ذاتی تحقیق کا نتیجہ ہوں۔غیر زبانوں سے مفید مضامین کا ترجمہ بھی قابل قبول ہوگا اور کم ضخامت کے بعض مفید قلمی رسالے بھی باقساط شائع کئے جائینگے ایسے مضامین جو خاص اسی رسالہ کیلئے نہ لکھے گئے ہونگے شائع نہ ہونگے۔''۹۴

ڈاکٹر انور سدید اپنی کتاب ''پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ'' ابتداء تا ۱۹۸۸ء میں لکھتے ہیں:

> ''۱۹۲۵ء میں اورینٹل کالج میگزین جاری ہوا تو ان کے ثمراتِ تحقیق کو منظر عام پر لانے میں بڑی مدد ملی۔اس رسالے کے الجھے ہوئے مباحث کو حل کرنے میں بڑی دلچسپی لی اور بعض نئے مباحث بھی پیدا کئے۔''۹۵

فروری ۱۹۲۵ء میں جاری ہونے والا رسالہ ''اورینٹل کالج میگزین'' میں تحقیق، بصیرت و بصارت کے ہم رکاب قوتِ مشاہدہ کی کشمکش کے جلو میں جستجوئے علم وفن کی شمع یوں روشن کرتی ہے کہ نامور اساتذہ کے تحقیقی شہ

پارے دنیائے ادب کے گمنام زاویوں کو رخِ تاباں عطا کر کے آبروئے تحقیق بھی بڑھاتے ہیں اور امکاناتِ تحقیق بھی۔ تحقیق کے لیے موضوع کی تلاش و انتخاب بڑی جگر کاری کا کام ہے اور وہی محقق اس مرحلے سے بہ احسن طریق گزر سکتا ہے جو نبضِ تحقیق پر ہاتھ رکھ کر امراضِ تحقیق سے واقف بھی ہو اور معالجِ تحقیق بن کر ابھرے۔ تحقیقی جراحت سے ہی ایک محقق ناسورِ تحقیق کی کانٹ چھانٹ کر کے تحقیقی سرمایہ محفوظ کر سکتا ہے۔

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار اپنی کتاب ''اورینٹل لاہور'' میں لکھتے ہیں:

> ''اورینٹل کالج میگزین نے آغاز کار ہی سے علمی تحقیق اور ادبی تنقید کا ایک ایسا اعلیٰ معیار قائم کیا کہ شرق و مغرب کے علمی حلقوں نے اس رسالے کا خوشگوار خیر مقدم کیا اور اس کے مندرجات کو وقعت کی نگاہوں سے دیکھا جائے گا۔''۹۲

جہاں تک تحقیق نئی دریافت کا مدعا و سبب ہوتی ہے وہاں پرانے متنوں کی تصحیح کرنے کے ساتھ ساتھ قدیم اور مروجہ متنوں کی صحت و عدم صحت کا بھی خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ اس سلسلے کی کڑیاں مولوی محمد شفیع، پروفیسر محمد اقبال، سید اولاد حسین شاداں، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، ڈاکٹر سید عبداللہ، حافظ محمود شیرانی، مولانا امتیاز علی عرشی اور صوفی غلام مصطفےٰ تبسم وغیرہ کے مضامین ہیں۔ مولوی شفیع محمد کا مضمون ''رامپور کے دو کتب خانے'' تحقیقی مضمون ہے۔ جبکہ ''سحر البیان'' مولوی صاحب کا ایسا تحقیقی مضمون ہے جو ایک پرانا دیباچہ ہے جس پر دیباچہ نگار کا نام تحریر نہیں ہے۔ جبکہ سحر البیان پر گارساں دتاسی لکھا ہوا ہے اور ''تاریخ ادبیات ہند'' میں اسی دیباچے سے اخذ کر کے میر حسن کا حال احوال لکھا ہے۔ مولوی صاحب اس مثنوی کے دیباچے پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اس عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ زنگارندہ میر شیر علی افسوس ہے۔''

مولوی صاحب کہتے ہیں کہ اس قدیم نسخے میں حمد و نعت کے تذکرے کے بعد میر حسن کی سوانح حیات کا مختصر بیان کرتے ہوئے اس دور کی داخلی شہادتوں سے بھی کام لیا ہے۔ میر شیر علی افسوس نے میر حسن کی وفات کا تذکرہ میں دی گئی غلط تاریخ کا ذکر کیا ہے اور شہادت کے لیے گارساں دتاسی کے تصحیح کردہ سنہ وفات کا بھی ذکر ملتا ہے۔ ''اورینٹل کالج میگزین'' کے محققین اور خاص کر مولانا محمد شفیع تحقیقی باریک بینی اور تدوینی بصیرت نے اس جریدے کی اہمیت دوچند کر دی اور ''اورینٹل کالج میگزین'' میں دریافت کے زریں اصولوں کو مواد و متن کا پہلا اصول قرار دیا گیا اور یوں مخطوطوں کی بنیادی اور اساسی اہمیت کو اس جریدے کے محققین اور مدونین نے اہم قرار دیا۔ اپنے آغاز ہی سے ''اورینٹل کالج میگزین'' حقائق کی جستجو، قدیم متنوں کی ترویج و اشاعت میں مددگار و معاون ثابت ہوا۔ مختصر مضامین بھی اس میگزین کی تحقیقی اہمیت کو بڑھاوا دیتے ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کا مضمون ''فارسی ادب کی

تاریخ'' ایک نہایت مختصر مگر اہم ادبی مضمون ہے۔ جس میں تحقیقی افادیت سے بھرپور فارسی ادب کی مستند کتابوں کی نشاندہی کی ہے۔ ''اورینٹل کالج میگزین'' کے مضامین کا اسلوب تحقیقی ہے اور اس تحقیقی اسلوب میں تحقیقی معیار کو بھی برقرار رکھا گیا ہے۔ مولوی شفیع محمد کے علاوہ دیگر محققین مثلاً حافظ محمود شیرانی، امتیاز علی عرشی، ڈاکٹر سید عبداللہ نے بھی اپنے مضامین میں نہ صرف صحتِ متن اور اُصول وقواعد کا خیال رکھا ہے بلکہ اختلافِ نسخ سے بھی قارئین کو آگاہ کرتے رہے اور نو آموز محقق کے لیے اس دور میں جستجو کی نئی راہیں ہموار کرتے رہے۔ اور تحقیقی اسلوب میں الفاظ کی آرائش ملتی ہے بلکہ صاف، سہل، سیدھا اور تحقیقی اصطلاحات سے بھرپور تحقیقی اسلوب ان مضامین کی شان ہے۔

اورینٹل کالج میگزین کے مضامین میں غیر متعلقہ نکات و دلائل سے احتراز کیا گیا ہے۔ علم کی وسعت ان مضامین کا خاصہ ہیں۔ لفظی آرائش و زیبائش سے بھی اورینٹل کالج میگزین میں اجتناب کیا گیا ہے۔ اجتماعی جستجو، فہم و استقلال اور صحت مند مقابلے کا رجحان اورینٹل کالج میگزین کے محققین کا نصب العین رہا۔ مشرقی ادبیات کی تحقیق بھی اسی جریدے کا خاصہ ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی ''اورینٹل کالج میگزین'' میں خطبہ استقبالیہ جنوری ۱۹۴۷ء میں لکھتے ہیں:

> ''اس مجلّے کی تیاری کی خصوصیات وہی ہیں جن پر اس دبستان کی روایتی شہرت کا انحصار ہے۔ یعنی مشرقی ادبیات کے تاریخی پس منظر کا مطالعہ حقائق کی چھان بین، جزئیاتی کاوش، قدیم مصادر ماخذ کی دریافت اور ان کے متنوں کی تہذیب واشاعت، بلاشبہ برعظیم و پاک و ہند کے علمی و تحقیقی حلقوں میں ان رجحانات کو فروغ دینے کا فخر بڑی حد تک اس مجلّے کو حاصل ہے۔''۹۷

حسین خان نیازی کا مضمون ''مرزا عبدالقادر بیدل'' قسط وار ہے۔ پہلی قسط میں بیدل کی ولادت اور شہرِ ولادت کے بارے میں تذکروں کے اختلاف پر بحث کرنے کے بعد مصنف اس بات سے متفق ہے کہ عبدالقادر بیدل کی ولادت ہندوستان میں ہوئی پھر ان کے مکمل سوانح حیات، ان کی درویشی کے واقعات اور اخلاق و عادات پر نظر ڈال کر ان کی شراب و معرفت پر لکھتے ہیں:

> ''مرزا شراب خور اور بادہ نوش ہوتے تو عالمگیر جیسے مذہب نواز اور پابند صوم وصلوٰۃ بادشاہ مرزا کے اشعار کو اپنے نصیحت آمیز رقعات میں ہرگز داخل نہ کرتے۔''۹۸

''بحر الفوائد'' محمد اقبال کا مضمون ہے۔ جسے انہوں نے اپنی تحقیق سے چھٹی صدی ہجری کی تصنیف قرار دیا ہے اور تاتاری حملے کی دست برد سے بچنے کی بنا پر اس کتاب ''اہم'' کتاب مانتے ہوئے اس کتاب کے حوالے سے

شیرانی و دیگر محققین کے نسخوں کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ اردو شعر و ادب پر فارسی شعر و ادب کی چھاپ کافی عرصہ تک رہی ہے۔ ''اورینٹل کالج میگزین'' کے محققین و مدونین نے فارسی شعر و ادب پر تحقیقی و تدوینی کام کر کے اردو ادب کے سرمایہ میں اضافہ کیا ہے۔ محمد باقر نے اپنی تحقیق و جستجو سے یہ ثابت کیا ہے کہ ''مثنوی نذنگ مملکت یا قصہ دلارآم'' کا مصنف غوث ابن عظیم غوث ہے اور متن پر مثنوی کا نام درج نہیں ہے۔ یہ مثنوی پنجاب یونیورسٹی کے مخطوطات میں سے ملی ہے اور کسی کتب فروش نے اس پر مندرجہ بالا عنوان دے دیا۔ محمد باقر کو یہ عنوان عمدہ لگا اور انہوں نے اسے ہی اپنے مضمون کا عنوان بنا دیا۔ مثنوی کے مصنف کے حوالے سے محمد باقر لکھتے ہیں:

> ''مثنوی سے مصنف کے حالات اس سے زیادہ معلوم نہیں ہو سکے کہ وہ قصبہ میرَ وال ضلع سیالکوٹ (پنجاب) میں ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ مصنف نہ صرف اپنے بیان کے مطابق پنجابی ہے بلکہ مثنوی کی زبان میں پنجابی کثرت سے استعمال کرتا ہے جس سے صاف طور پر پتہ چلتا ہے کہ مصنف پنجابی ہے اور اردو کی یہ مثنوی پنجاب میں لکھی گئی ہے۔''۹۹

محمد باقر کی یہ تحقیقی کاوش ایک گمنام متن کی بازیافت کا سبب بنی اور اردو کے حوالے سے پنجاب کے ذوق و شوق کا احساس بھی اسی مضمون کے ذریعے ادبی دنیا تک پہنچا۔ ڈاکٹر محمد باقر کا دوسرا مضمون ''اردو قدیم کے متعلق چند تصریحات'' میں لفظ ''اردو'' اور اس سے متعلق معلومات فراہم کی ہیں اور اس سلسلے میں یورپ اور انگلستان کے کتب خانوں میں بکھرے مخطوطات سے استفادہ بھی کیا ہے۔ سید عبداللہ جو پہلے ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے لکھتے تھے اب ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے حصول کے بعد جو مضامین لکھے ان میں ''اردو کی تعمیر میں خاص آرزو کا حصہ'' ہے اور جس میں ''اورینٹل کالج میگزین'' کی روایت برقرار رکھتے ہوئے تحقیقی اسلوب میں یوں لکھتے ہیں:

> ''خان آرزو کا علم و فضل اور فارسی شعر کے قواعد و حقائق پر عبور اور ان کی بے مثال شخصیت فارسی اور اردو دونوں میں کام کرنے والوں کے لیے یکساں طور پر سرچشمہ فیض اور شمع ہدایت تھی۔''۱۰۰

حافظ محمود شیرانی اور مولانا امتیاز علی عرشی تحقیق کی دنیا میں بڑے اور معتبر نام ہیں اور ان کی تحقیقی کاوشوں پر اردو ادب کو ناز ہے۔ شیرانی اور عرشی کی تحقیق مصلحت کوشی سے پاک ہوا کرتی تھی۔ شیرانی نے ''خالق باری'' پر تحقیق کر کے ان تمام دلائل اور تحقیقی جستجو کا کسی ماہر محقق کی طرح تجزیہ کیا اور اسے خسرو کی کتاب ماننے سے انکار کر دیا۔ جبکہ ''فردوسی اور اس کا شاہنامے'' کے حوالے سے ''شاہنامے میں فردوسی کے حالات'' جیسے تحقیقی مضمون میں شیرانی نے فردوسی کے حوالے سے اس سوانح میں غلط العوام آرا کی نشاندہی کی ہے۔ غرضیکہ ''اورینٹل کالج میگزین'' نے

لسانیات، ادب و دیگر ادب کی شاخوں میں نو آموز محقق کے لیے تحقیقی وتدوینی امکانات روشن کیے۔ مثلاً ڈاکٹر محمد باقر کا مضمون ''پنجاب میں اردو'' کے حوالے سے اردو کی پنجاب میں آبیاری پر تحقیقی کام ہونے کا کھوج لگایا ہے۔ ڈاکٹر محمد باقر نے اس مضمون میں پنجاب کے باسیوں کے اس دور کے نمونوں کو تحقیق سے اجاگر کیا۔ جب اردو پنجاب میں خال خال تحریری طور پر نظر آتی تھی۔ اردو شعر و ادب پر فارسی شعر و ادب کی حکمرانی رہی۔ اس لیے اورینٹل کالج میگزین کے محققین نے فارسی شعر و ادب کو بھی کھنگالا ہے۔ محمد اقبال کا مضمون ''نو روز'' ایک تحقیقی مضمون ہے۔ جس میں نو روز کی حقیقی ابتداء اور فرضی ابتدا پر بحث تحقیق کی روشنی میں کی ہے اور تحقیق سے ثابت کیا ہے کہ نو روز نہ تو عمر خیام سے منسوب ہے اور نہ البانوں کے بادشاہ کے عہد کی ایجاد ہے۔ مزید محمد اقبال تحقیق سے ثابت کرتے ہیں کہ سال نو روز کی اس دور میں بہت اہمیت تھی اور نو روز سے منسوب ہر غلط روایت کی بھی نفی کرتے ہیں۔ وہ پروفیسر مارکوارٹ آکانی کے حوالے سے بھی نو روز پر بات کرتے ہیں۔

مختصر یہ کہ ''اورینٹل کالج میگزین'' سے ایک عہد ہے۔ اس کی اپنی ایک تاریخ ہے اور اس نے تحقیق وتدوین میں ایک تاریخ رقم کی ہے۔ لسانیات، شعرا و ادبا کے سوانح حیات، پرانے ستون کی دریافت، فارسی شعر و ادب، کلاسیکی ادب، غلط روایات، ناقص تحقیق پر انفرادی و اجتماعی کام ''اورینٹل کالج میگزین'' نے کیا اور نامور محقق و مدون سے اردو ادب کو نوازا۔

آج بھی اورینٹل کالج میگزین کا معیار اتنا ہی بلند ہے جتنا کہ آغاز میں تھا۔ کیونکہ اپنی ابتدا ہی سے یہ جریدہ تحقیقی جریدہ رہا ہے اور اس جریدے کی بنیاد تحقیقی صداقت اور تحقیقی شواہد پر رکھی گئی ہے۔

ادبی دنیا: مولانا تاجور نجیب آباد نے مئی ۱۹۲۹ء، لاہور سے سر عبدالقادر کی زیر نگرانی ایک جریدہ ''ادبی دنیا'' کے نام سے نکالا۔ رسالے کے چیف ایڈیٹر مولانا تاجور نجیب آبادی تھے جبکہ اس کے ایڈیٹر حنیف ہاشمی تھے۔ مولانا تاجور نے اس رسالے کا سائز دیگر رسائل سے بڑا رکھا اور اسی لیے اس جریدے کو جہازی سائز کا نام دیا۔ اس رسالے کا اجراء ۴۱/۲۰×۲۶ تقطیع پر ہوا۔ سالانہ چندہ تین روپے اور فی پرچہ یہ جریدہ چھ آنے کا تھا۔ ''ادبی دنیا'' کی اشاعت کے وقت اس کے اغراض و مقاصد مندرجہ ذیل بنائے گئے تھے۔

> ۱۔ ''ادبی دنیا'' کی اشاعت کا پہلا مقصد تصنیفی اردو کو عام فہم بنا کر اس کے سمجھنے والوں کی تعداد بڑھانا اور اس طرح اردو ادب کو صحیح معنوں میں ترقی دینا ہے۔
>
> ۲۔ ''ادبی دنیا'' کے اجراء کا دوسرا مقصد اردو ادب کو دوسری علمی زبانوں کے خزانوں سے سرمایہ دار بنانا ہے۔۔۔۔۔ اردو کو اورینٹل لکھنے والوں سے بہت زیادہ اچھے ترجموں کی ضرورت

ہے۔

۳۔"ادبی دنیا" کے اجراء سے تیسرا مقصد یہ ہے کہ اردو انشاء پردازی اور اردو شاعری پر آسان زبان میں تعلیمی مضامین کے ذریعے نوجوانوں اور طلبہ میں صحیح ذوق ادبی پیدا کیا جائے۔

۴۔ادبی دنیا کی اشاعت کا چوتھا اہم مقصد یہ ہے:

(الف).....

(ب)موجودہ اردو گرائمر موجودہ زبان کا ساتھ نہیں دے سکتی لہٰذا اس اصول پر کہ گرائمر زبان کے ماتحت ہونی چاہیے، کاربند ہو کر مستند اہل قلم کے مشوروں سے اردو گرائمر میں ضروری تغیر و تبدل اور ایسے نئے قواعد کا اضافہ کیا جائے جن کی موجودگی میں وہ جدید الفاظ، جدید تراکیب اور جدید محاورات صحیح قرار دیئے جائیں جو اردو کے شرائین میں خون کی طرح پھیل گئے ہیں۔

(ج)دوسری زبانوں کے ایسے آسان اور خوشگوار الفاظ اردو میں داخل کئے جائیں جن کے ہم معنی لفظ اردو میں نہیں ہیں جن کا مفہوم ہم معنی لفظ کے مقابلے میں زیادہ وسیع اور خاص معنی کا حامل ہے۔"[۱۰]

ڈاکٹر انور سدید نے اپنی کتاب "پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ" (ابتداء تا ۱۹۸۸ء، تک) میں جبکہ ڈاکٹر محمود احمد اسیر نے اپنی کتاب "مولانا صلاح الدین احمد احوال و آثار" میں ادبی دنیا کو چھ ادوار میں تقسیم کیا ہے لیکن ہمارا موضوع وہی ادوار ہیں جو ۱۹۲۹ء تا ۱۹۴۷ء پر محیط ہیں۔ پہلا دور مولانا تاجور نجیب آبادی کا دور ہے جو ۱۹۲۹ء تا ۱۹۳۴ء، تک ہے۔ دوسرا دور مولانا صلاح الدین احمد کا دور ہے جو ۱۹۳۵ء تا ۱۹۴۷ء تک ہے۔ مولانا تاجور نجیب آبادی "ادبی دنیا" کو مسلسل خسارے کی بناء پر سنبھال نہ سکے اور اسے لارلز لمٹیڈ (Laureles Ltd) کو فروخت کر دیا۔ ڈاکٹر محمود امیر احمد اپنی کتاب "مولانا صلاح الدین احوال و آثار" میں مختلف محققین کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ڈاکٹر وحید قریشی، عبدالسلام خورشید، ایم اسلم خالد، عائشہ صدیقہ کی آرا کے مطابق مولانا تاجور نے اسے لارلز لمٹیڈ کو فروخت کیا بعد میں مولانا صلاح الدین نے خرید لیا۔ لیکن ڈاکٹر محمود اسیر احمد تحقیقی مساعی کی بنا پر یہ حقائق سامنے آتے ہیں کہ "ادبی دنیا" کو مولانا صلاح الدین احمد نے لارلز لمٹیڈ کی وساطت سے نہیں بلکہ براہ راست باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت اقساط پر مولانا تاجور نجیب آبادی سے خریدا تھا۔

"ادبی دنیا" کا پہلا پرچہ مولانا صلاح الدین احمد نے اپریل ۱۹۳۳ء میں نکالا اور اس کے مدیر منصور احمد

تھے۔اس کے لکھنے والوں میں ۱۹۳۷ء میں منصور احمد کا انتقال ہوگیا۔اور ۱۹۳۹ء میں مولانا صلاح الدین احمد ''ادبی دنیا'' کے باقاعدہ مدیر بن کر سامنے آتے ہیں۔میراجی ۱۹۰۰ء میں ادبی دنیا کے مدیر بنے۔مولانا تاجور نجیب آبادی نے اپنے دور میں ''ادبی دنیا'' کے موضوعات کو تنوع دیا۔انگریزی ادبیات کے تراجم کرائے اور ''ادبی دنیا'' کے مضامین کے ذریعے ذوق تنقید کو بھی بلند کیا۔''نیز ادبی دنیا'' نے مولانا تاجور نجیب کے زیر نگرانی سادہ، عام فہم، اعلیٰ ادبی نثر کا اہتمام بھی کیا۔''ادبی دنیا'' میں مولانا تاجور نجیب آبادی نے تصاویر کا سلسلہ بھی شروع کیا۔''ادبی دنیا'' میں میں سیاسی، معاشرتی، سائنسی موضوعات پر تصاویر ملتی ہیں۔مولانا تاجور نجیب آبادی نے ''ادبی دنیا'' کا معیار ابتدا ہی سے بلند رکھا۔اس لیے نامور ادبا نے ''ادبی دنیا'' میں لکھا جن میں رائے بہادر پنڈت نرائن شمیم، پروفیسر ارشاد حسین، مولانا فضل کریم، سر عبدالقادر، بھوپال سنگھ، حنیف ہاشمی، بنارس داس، موہن سنگھ دیوانہ، ڈاکٹر احمد خان، میلارام وفا، مولانا حامد الانصاری و دیگر اکابرین ادب نے ''ادبی دنیا'' میں اپنی نگارشات شائع کیں۔اس دور کے مضامین مدلل، شگفتہ اور مفید تھے۔مولانا تاجور نجیب آبادی کا مضمون ''عربوں کا نقد شاعری''، تمکین کاظمی کا مضمون ''اردو کی سب سے پہلی شاعرہ'' مولانا حامد الانصاری کا مضمون ''دساتیر اور اوستا''، میر ولی اللہ کا مضمون ''فلسفہ حیات کے متضاد رویے''، محمد یحییٰ عندلیب کا مضمون ''یقین'' عبدالرحمان کا مضمون ''شعر کی موزونیت''، محمد بدر اسلام فضلی کا مضمون ''ادبیات جاپان پر ایک نظر'' موضوعات، زبان و بیان ہر اعتبار سے سنجیدہ، دلچسپ مضامین ہونے کے ساتھ ساتھ جدید اذہان کے لکھے گئے مضامین ہیں۔علمی، سوانحی اور تاریخی مضامین بھی اس دور میں ''ادبی دنیا'' کی مقبولیت کا سبب بنے۔مولانا صلاح الدین احمد کا دور میں ''ادبی دنیا'' کا رجحان تحقیقی معلوماتی مضامین کا دور تھا۔

''ادبی دنیا'' مولانا صلاح الدین احمد کی سربراہی میں ایک عہد اور ایک روایت بن کر ابھرا۔''ادبی دنیا'' میں دیگر رسائل کے عمدہ مضامین بھی شائع کئے جاتے تھے اور یہ ''ادبی دنیا'' کے عروج کا زمانہ تھا۔مولانا صلاح الدین احمد مزاج ناقدانہ تھا۔اس لیے اردو ادب کے شعری و نثری موضوعات پر ''ادبی دنیا'' میں بھی مضامین شائع ہوتے تھے اور اردو کے تحفظات کے حوالے سے ''اردو بولو تحریک'' کے عنوان سے ادبی دنیا میں لکھا جانے لگا۔اس دور کے دیگر رسائل کی طرح ''ادبی دنیا'' میں بھی اقبال کی قدر شناسی کی جانے لگی اور ''ادبی دنیا'' میں اقبال کی شاعری پر بھی ناقدانہ مضامین لکھے گئے۔مثلاً جناب مظہر عزیز کا ''علامہ اقبال کی شاعرانہ عظمت'' سیتارام باہری کا ''اقبال کے دو محبوب پرندے'' وغیرہ ہیں۔مولانا صلاح الدین احمد نئے قلمکاروں کا بھی حوصلہ بڑھاتے تھے وہ ادیب نواز کی جگہ ''ادیب گر'' تھے۔مولانا کسی بھی ادبی تحریک سے وابستہ نہ تھے اور ان کے جریدے کا خالص مقصد

اردو ادب کی ترویج و اشاعت تھا۔ مولانا کی طبیعت میں تعصب نہیں تھا اس لیے "ادبی دنیا" پر ہونے والی ہر اچھی بری تنقید کو نہایت فراخدلی سے قبول لیتے تھے اور "ادبی دنیا" کے معیار اور ذوق کو بلند سے بلند تر کرنے میں کوشاں رہتے۔ ڈاکٹر محمود اسیر احمد "مولانا صلاح الدین احمد احوال و آثار" میں لکھتے ہیں:

> "مولانا صلاح الدین احمد کا خیال تھا کہ ادبی رسالہ محض مضامین نظم و نثر کا مجموعہ نہیں ہوتا بلکہ قوم کی فکری، نظری، معاشرتی، تہذیبی اور تخلیقی سرگرمیوں کا آئینہ ہوتا ہے یہی وجہ تھی کہ وہ "ادبی دنیا" سے پورے معاشرے کے عمل اور ردعمل کو منعکس کرنے کا کام لیتے تھے۔ اور فروغ ادب کے کے لیے انہوں نے اسے ایک موثر وسیلے کے طور پر استعمال کیا۔ انہوں نے اپنے حسن ذوق سے "ادبی دنیا" کی ترتیب و تہذیب کو آراستہ کیا اس میں پختہ و تجربہ کار اور مشہور و معروف ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقی اور کلاسیکی تحریروں کو شائع کرنے کے ساتھ ساتھ تجارت نہیں کی بلکہ صرف ادب اور ادبی روایت کی آب یاری کے لیے اس کو جاری رکھا۔"[۱۰۲]

مولانا صلاح الدین احمد کی سربراہی میں گمنام ادب پاروں، شخصیات پر معیاری لکھے جانے والے مضامین "ادبی دنیا" کا خاصہ بن چکے تھے۔ مالک رام کا مضمون "غالب کی مہریں"، تمکین کاظمی کا مضمون "دربار آصفی میں ایک اردو رسالے کا ایڈیٹر" ڈاکٹر محی الدین قادری زور کا مضمون یورپ کی قدیم درسگاہیں اور ان کے اساتذہ علی احمد کا رامائن اور مہابھارت کے اولین ترجمے، مولانا صلاح الدین احمد کا "اردو کے چند یادگار مرثیے۔ برجموہن دتاتریہ کیفی کا حالی اور پسروئی مغربی" مضمون نگاروں کی تحقیقی انفرادیت سے قاری کو متعارف بھی کراتے ہیں اور "ادبی دنیا" کی تحقیقی روایت کو استحکام پائیداری بھی عطا کرتے ہیں۔ مالک رام اپنے تحقیقی مضمون "غالب کی مہریں" میں غالب کے استعمال میں رہنے والی مختلف مہروں کا تحقیقی تجزیہ پیش کرتے ہیں۔ مالک رام مٹھی مہر کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> "چھٹی مہر غالب (۱۲۷۸ھ) میرے علم میں میرزا کی یہ آخری مہر ہے جو انہوں نے اپنی وفات سے سات برس پہلے ۱۸۶۲ء میں تیار کرائی۔ جو لوگ نفسیات سے واقف ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ نفس انسانی میں "انا" کے "ارتقاء کا انتہائی مقام" یہ ہے کہ انسان کسی غیر معمولی کامیابی کے بعد اپنے تعارف کے لیے مختصر سے مختصر "علم" استعمال کرنے لگتا ہے۔"[۱۰۳]

مولانا صلاح الدین احمد نے "ادبی دنیا" کے ناقدانہ مزاج میں عدل و انصاف کو مقدم رکھا۔ "ادبی دنیا"



کے نقادین ہر فن پارے یا شخصیات کو اصول تنقید کے کھرے اور سچے اصولوں پر پرکھتے اور اردو ادب میں ان کا مقام متعین کرتے تھے۔ بے لاگ تنقید "ادبی دنیا" کا نصب العین تھا۔ مرزا عظیم بیگ چغتائی کا مضمون "اردو کی شاہی پرستی مجتبیٰ حسین کا مضمون "اردو ناول کا ارتقا، سید جابر علی کا مضمون "اردو میں آزاد نظم کا ارتقا اس سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ میراجی کے مضمون "فرانس کا تخیل پرست شاعر" کے عنوان سے میلا رامے کے مختصر سوانح اور اس کی شاعری پر میراجی بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "تمام زندگی میں میلا رمے نئے جمالیاتی نظریوں کی تلاش میں رہا اور اس میں اس نے عموماً جو دریافتیں کیں وہ ادب اور آرٹ میں ایک امتیازی درجہ رکھتی ہیں۔"۱۰۴

میراجی نے "ادبی دنیا" میں یورپی شعراء پر تنقیدی مضامین لکھے تھے جن میں میلا رمے، بودلیر، لارنس و دیگر ادباء و شعراء شامل تھے میراجی نے "ادبی دنیا" میں جدید تنقید کا رجحان پیدا کیا۔ تنقید میں ہمہ گیر ادبی دنیا کے تنقیدی مضامین اسی جریدے کے فعال اور متحرک جریدہ ہونے کا اعتراف ہیں۔ فیض احمد فیض اپنے مضمون "شعر میں اظہار یا ترجمانی" میں شعر کی افادیت اور طمانیت پر ناقدانہ بحث کتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "ایک اچھے شعر یا اچھی نظم کی کامیابی یہی ہے کہ اس کا مضمون پڑھنے والوں تک سہولت اور برجستگی سے پہنچے تا کہ وہ اسے سمجھ سکیں۔ اس سے متاثر ہو سکیں اور اپنے تاثر کو داد کی صورت میں شاعر تک پہنچا سکیں۔"۱۰۵

جناب ابو محمد امام الدین کا مضمون "بندی میں افسانوی لٹریچر" اور جناب بو مسلم صدیقی کا مضمون سحر البیان اور گلزار نسیم تنقیدی و تحقیقی مضمون ہیں۔ مولانا صلاح الدین احمد نے ترقی پسند تحریک کے اثرات قبول کرنے کے باوجود کشادہ ذہن مالک تھے۔ اسی لیے ترقی پسند تحریک کی انتہا پسندی سے قطعی متفق نہیں تھے پھر بھی پروفیسر احمد علی مضمون "ترقی اور ترقی پسند" علی عباس کا مضمون "اشتراکیت اور آرٹ" و دیگر مضامین ترقی پسند تحریک سے وابستہ مضامین ہیں۔ آزادی فکر نظر آتی ہے۔ نیز "ادبی دنیا" میں افادی پہلو نمایاں ہیں۔ "ادبی دنیا" نئی جہات کا عکاس تھا۔ ڈاکٹر انور سدید اپنی کتاب "پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ" میں میراجی اور مولانا صلاح الدین احمد کی ادارت کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> "اس دور میں ادب کی کلاسیکی دور کی نگہبانی مولانا نے کی اور جدیدیت کی لہر کو میراجی نے روشناس خلق کرایا۔"۱۰۶

ساقی: ڈپٹی نذیر احمد کے پوتے شاہد احمد دہلوی فکرِ پختہ کے مالک تھے ۱۹۳۰ء میں دہلی سے شاہد دہلوی نے

ایک ماہنامہ نکلا جس کا نام اُنہوں نے ''ساقی'' رکھا۔''ساقی'' کی ضخامت ۶۴ صفحات پر مشتمل تھی۔اس جریدے کا سالانہ چندہ چند تین روپے تھا اور فی پرچہ اسکی قیمت ۵ آنے تھی۔شاہد احمد دہلوی اسکے مدیر تھے اور معاون مدیر سید انصار علی دہلوی تھے۔ساقی کے اغراض و مقاصد یہ بنائے گئے تھے:

۱۔''ادب اُردو کی نظماً و نثراً اشاعت اور تحقیقات کے جدید و قدیمہ کا نثر''ساقی'' کا مقصد حقیقی ہے۔

۲۔ساقی کی اشاعت سے بڑی غرض یہ ہے کہ ملک میں پاکیزہ ادب کا مذاق پیدا کیا جائے اور زبان اُردو کی قدر دانی کی طرف ابنائے وطن کو مائل کیا جائے۔

۳۔ساقی کوشش کریگا کہ اُردو میں ''نثر شاعری'' (ادب لطیف)، کے نمونے پیش کر سکے۔

۴۔ساقی خالص ادبی و علمی رسالہ ہے۔سیاسیات اور مذہبی مناقشوں سے اسے مطلق سروکار نہ ہوگا۔

۵۔خلاف تہذیب اور ذاتیات پر مبنی مضامین ساقی میں درج نہ ہونگے۔ساقی کے ذریعے کوشش کی جائے گی کہ ادبی محاسن و کمالات کی پوری پوری داد دی میں جائے۔''[۱۰۷]

ساقی کے ابتدائی دور کے لکھنے والوں میں قاری سرفراز حسین، مرزا محمود بیگ، شاہد احمد دہلوی، سید انصار علی، وکیل احمد حافظ غازی پوری، سید ناصر نذیر فراق دہلوی، سید قمر الحسن قمر، علامہ تفضحک دہلوی، محمد متین الحق حقی دہلوی، حضرت مائل، سلطان حیدر جوش، علامہ راشد الخیری، شوکت تھانوی، عبد الباری آسی و دیگر مضمون نگار شامل تھے۔ ساقی کا رجحان اپنے آغاز ۱۹۴۷ء تک رومانوی رہا''ساقی'' کو شاہد احمد دہلوی نے دلی کی تہذیب اور لب و لہجہ کی زبان عطا کی اور یوں ''ساقی'' میں شاہد احمد دہلوی نے زبان کے تحفظ کے ساتھ ساتھ دلی کی دیرینہ روایات کو بھی برقرار رکھا۔

''ساقی''ایک خالص ادبی رسالہ ہے ساقی کے سوالنامے بھی اہم تھے۔''ساقی'' نے قارئین ادب کے ادبی ذوق کو بہتر بنانے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔شاہد احمد دہلوی کے رسالے''ساقی'' کے مضامین میں ترفع کے ساتھ ساتھ موضوعات کی وسعت کا بھی قدرے احساس ملتا ہے۔اکثر مضامین سنجیدہ علمی مزاج کے حامل ہیں لیکن رومانوی رنگینی اور دلکشی بہر طور ان مضامین میں ملتی ہے۔تاریخی مضامین میں ارتقائی صورت نظر آتی ہے۔''ساقی'' کے مزاحیہ مضامین میں موضوع کے تنوع کے ساتھ ساتھ زبان کی شائستگی و صفائی کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔علامہ تفضحک دہلوی، شوکت تھانوی، رشید احمد صدیقی و دیگر مزاح نگاروں کے مضامین سطحی زبان سے مبرا ہیں اور حقائق زندگی ان

میں لفظی و واقعاتی مزاح سے پیدا کیا گیا ہے۔ یوں یہ مضامین ایک طرف تو ''ساقی'' کو مقبول عام بنانے میں مددگار ثابت ہوئے تو دوسری طرف ان مضامین نے اُردو ادب میں مزاح نگاری کے معیار کو بلند کیا۔ ساقی کے ظریف نمبر اپریل ۱۹۳۴ء میں ''نگاہ اولین'' میں شاہد دہلوی ظرافت کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''ساقی کا ''ظریف نمبر'' صحافت اُردو میں اہمیت خاص رکھتا ہے۔ اس میں مزاح وطنز کے پاکیزہ نمونے بڑی کاوش سے جمع کئے جاتے ہیں ..... زیر نظر ''ظریف نمبر'' میں کوشش کی گئی ہے کہ کوئی مضمون شائبہ مذاق پر بار نہ گزرے۔''[۱۰۸]

''ساقی'' نے جو بھی ادبی خدمات سرانجام دیں وہ تعمیری تھیں تربیت وتہذیب واخلاق سے مزین ''ساقی'' میں اس دور کے نامور نثر نگاروں نے مضامین لکھے۔ حسن عسکری کی جھلکیاں میں ادب اور اس سے متعلق معلومات و مسائل پر فکر رسا تنقید ملتی ہے۔ نورالحسن ہاشمی، ابو سعید مرزا، وقار عظیم، فراق گورکھپوری، حجاب امتیاز علی، مولانا وحید الدین سلیم، ڈاکٹر عندلیب شادانی، پروفیسر احتشام حسین، ممتاز مفتی، احسن فاروقی و دیگر نثر نگار ''ساقی'' کے تحقیقی و تنقیدی مضامین شائع ہوئے۔ ساقی کے مدیروں میں حسن عسکری بھی شامل تھے۔ تحقیق فکر وسوچ کے رجحان کو جنم دیتی ہے۔ تاریخی ادبیات میں حسن برنی کا نام ایک معتبر نام ہے۔ آپ نے دیگر رسائل کی طرح ''ساقی'' میں بھی مورخانہ مضامین لکھے یہ مضامین وسعت نظر کے ساتھ ساتھ صحت زباں اور اعلیٰ تخیل کے عکاس مضامین ہیں۔ سید حسن برنی ملک الامراء فخر الدین (قدیم دہلی کا ایک نامور کوتوال) میں کوتوال دہلی کا تاریخی جائزہ تحقیقی صداقت کی بنیاد پر لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اپنی عاجزی دکھا کر کوتوال کی سفارش چاہی۔ وہ ان کا حال سن کر رنجیدہ اور آبدیدہ ہو کر اُسی وقت شاہی ملکر میں پہونچا اور اپنی جگہ پر متامل ومتفکر کھڑا ہوگیا۔ سلطان نے جب کوتوال نے بشرے پر نظر ڈالی تو سمجھ گیا کہ دل میں کوئی رنج ہے۔''[۱۰۹]

''ساقی'' کے تاریخی مضامین نے سیاسی بیداری کے جذبے کو اُبھارنے میں دیگر رسائل کی طرح اپنا کردار احسن طریق سے نبھایا ہے۔ ''ساقی'' کا رنگین وشعریت سے بھرپور نثری لہجہ اس جریدے پر رومانیت کی چھاپ لگاتا ہے۔ سید قمر الحسن قمر کا نثر پارہ ''دوشیزہ بہار''، آغا محمد باقر سلمانی کا ''خواب بیداری'' میر ناصر علی دہلوی کا ''تیند''، انصار ناصر کا ''ملکہ شب'' و دیگر نثر پارے ادب لطیف کا دل آویز حسن سموئے ہوتے ہیں حجاب اسماعیل کے نثر پارہ ''زندگی'' (اشعار منثور) کے یہ جملے نرم ونازک الفاظ شعری حسن اور لفریب اسلوب سے مزین ہیں:

> ''جب یاسمین کی مردہ کلیاں، بہار کی ہواؤں سے دوبارہ زندہ ہونے کی کوشش کرتی ہیں

اور چاند کی نرم روشنیوں سے اناج میں اک مٹھاس پیدا ہونے لگتی ہے۔ تو میں پوچھتی ہوں
کہ لرزش حیات کے کیا معنی ہیں؟ زندگی کسے کہتے ہیں؟"[۱۰]

انصار ناصر کا نثر پارہ "ملکہ شب" سے اقتباس ملاحظہ ہو:

"چراغ مہر کے جھلملاتے ہی اُفق مغرب میرے استقبال کے لیے میری رہگذار پر لالہ و
گل کے انبار لگا دیتا ہے۔ میری سانولی صورت والی وہی شام اپنے سرمئی آنچل کی اوٹ
ڈوبتے ہوئے سورج کی سسکتی کرنوں پر مسکراتی ہے۔"[۱۱]

احسن تنقید وہ تنقید ہے جو قارئین ادب کو فن پارے کی بہترین پرکھ سے متعارف کرائے اور نقاد کی بھرپور صلاحیتوں کا بھی احساس دلائے۔ "ساقی" کے ناقدانہ مضامین اقسام تنقید کی وضاحت بھی کرتے ہیں اور ادبی، کلاسیکی تنقید کے جامع اصول کی نشاندہی بھی کرتے ہیں۔ محمد حسین ادیب کا مضمون "ظرافت"، سید وقار عظیم کا مضمون "ریاض خیر آبادی" سید محمود مورخ کا مضمون "حضور غم علامہ راشد الخیری" پریم چند کا مضمون "افسانوں میں مشاہدے کی ضرورت"، ماہر القادری کا تنقیدی مضمون "مولانا محمد علی بہ حیثیت شاعر"، نورالحسن ہاشمی کا مضمون "مومن کے کلام میں جرات کا رنگ" فراق گورکھپوری کی سلسلہ وار تنقیدی کاوش "باتیں" ڈاکٹر عندلیب شادانی کا مضمون "آزاد نظم" احتشام حسین کا مضمون "اُردو ادب پر غدر کا اثر" عبادت بریلوی کا مضمون "ادب کا افادی پہلو" احسن فاروقی کا مضمون "اُردو شاعری میں تقلید"، مختار صدیقی کا مضمون "مقطع" و دیگر مضامین "ساقی" کی تنقیدانہ روشن کے عکاس ہیں۔ یہ تنقیدانہ روش فکر و احساس کی گہرائی اور اصلاح مذاق کے علمبردار ہیں لیکن دلی کی زبان چاشنی کے ساتھ ساتھ اکثر مضامین رومانوی ہیں۔ محمد حسن عسکری کا مضمون "مرزا عظیم بیگ چغتائی" قدرے طویل مضمون ہے۔ جس میں انہوں نے "مرزا عظیم بیگ" کی ادبی قدر متعین کی ہے۔ حسن عسکری لکھتے ہیں:

"چغتائی نے اپنے زمانے کے مسلمان متوسط طبقے کے نوجوانوں کی EPIC لکھی ہے۔
اس نے اس کی روح کو قلم بند کیا ہے۔"[۱۲]

حسن عسکری کا ایک مضمون "اُردو ادب میں نئی آواز" کرشن چندر کے افسانوں کا بہترین تنقیدی احاطہ ہے۔ حسن عسکری لکھتے ہیں:

"کرشن چندر کے افسانے ماحول کی ترجمانی کرتے ہوئے بھی اپنے مقید اور محدود نہیں
ہوتے۔ ان میں ادب کی آزادی، پائداری اور آفاقیت ہوتی ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ وہ
سماج کے جسم کو کھڑا دیکھتا نہیں رہ جاتا، بلکہ اس کی روح میں اُتر جانے کی کوشش کرتا ہے۔
اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ وہ انسان کے دل کی دھڑکن سنتا ہے وہ سماجی ماحول کی طرف توجہ

نہیں کرتا جتنی اُن تاثرات کی طرف جو یہ ماحول انسانوں کو دلوں اور جذبات و احساسات
پر ڈالتا ہے وہ جاننا چاہتا ہے کہ ایسے ماحول میں انسان کی روح کیا محسوس کرتی ہے۔"[۱۳]

تحقیق نہ تو حاشیہ نگاری سے اور نہ آرائش زبان بلکہ کسی بھی فن پارے، شخصیت یا مقام کی تلاش معتبر سے کھوج لگنا اور ٹھوس شواہد کی بنا پر حقیقی دلائل سے اپنی دریافت کو منوانا تحقیق ہے۔ انیسویں دور کے رسائل نے بھی تحقیقی مضامین شائع کیے۔ جو اُردو ادب میں گرانمایہ تحقیقی سرمایے کا سبب بنے۔ دیگر رسائل کی طرح ''ساقی'' میں بھی تفتیش و تشخیص کے ذریعے ساقی کے نثر نگاروں نے ادب کی مختلف شاخوں پر تحقیقی کام کیا۔ جن میں اصناف ادب، تاریخی تحقیق، لسانی تحقیق، تنقیدی تحقیق، تدوین متن شامل ہیں۔ مثلاً وقار عظیم کا مضمون ''اُردو شاعری میں خُدا کا تصور''، محمود ہاشمی کا مضمون ''جدید شاعری میں پنجاب کا حصہ''، مشتاق احمد زاہدی کا مضمون ''گیت اور تہذیب و تمدن''، غلام یزدانی کا مضمون ''پچاس سال پہلے کی دلی''، انصار ناصری کا مضمون ''سنکرت ناٹک اور اسکے کردار''، محمد نعیم الرحمٰن کا ''حسرت موہانی کی تلمیحات''، اختر اورینوری کا ''سور داس اور تلسی داس''، وقار عظیم کا ''شاعری اور فطرت''، سید بادشاہ حسین کا مضمون ''اُردو ڈراما کی ترقی کے ذریعے''، نصیر الدین ہاشمی کا تحقیقی مضمون ''دلی کی دو مجلس''، ڈاکٹر عندلیب شادانی کا مضمون خواجہ حافظ اور شراب و شاہد، احمد ندیم قاسمی کا تحقیقی مضمون پنجابی شاعری (ماہیا) و دیگر تحقیقی مضامین میں تحقیقی روش تحقیقی اسلوب، تحقیقی جزوئیات اور تحقیقی اصطلاحات نمایاں ہیں۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی کا تحقیقی مضمون ''ایران کی امرد پرستی کا اثر اُردو شاعری پر'' اہم تحقیقی مضمون ہے جس میں رکیک شاعری پر تحقیق اور پھر غالب کی شاعری کا اس حوالے سے تجزیہ کیا ہے اور غالب کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"ہمارا مقصد فقط غالب کے کلام پر نکتہ چینی ہرگز نہیں بلکہ ہمارا موضوع بحث وہ کلام ہے
جس میں امرد پرستی کا ذکر ہے۔ جو بازاری ہوسکاریوں کا مرقع ہے جس میں بے حسی
اور بے حمیتی کی تعلیم دی گئی ہے۔ جس میں خودداری اور غیرتمدنی کے جذبات کو بری طرح
کچلا گیا ہے۔"[۱۴]

جامعہ لندن کا کتب خانہ مسعود یزدانی کا تحقیقی مضمون ہے جبکہ ''ادب میں دلی'' شاہد دہلوی کا تحقیقی مضمون ہے۔ سید وقار عظیم کا تحقیقی مضمون ''شاعری اور مظاہر فطرت'' میں تحقیق سے شاعری میں قدرتی مناظر کی نشاندہی کی گئی ہے یہ تحقیق انیسویں صدی کے تحقیقی مزاج ہے نئے موضوع کی ترجمان تحقیق سے سید وقار عظیم لکھتے ہیں کہ ایران کی طرزِ معاشرت ایران کی جگہ ہندوستان کے قدیم دور، ان موسموں سے متعلقہ طرز معاشرت کو شعرا ہندوستان نے اپنی شاعری میں سمویا ہے۔

"فارسی کے رنگ میں ڈوب کر بھی ہمارے شاعر اپنے دیس کی رنگینوں سے بے خبر رہے لیکن یہ جستہ جستہ مثالیں اس وافر سرمایہ کا ایک حقیر سا حصہ ہیں جن سے بعد کے زمانے میں ہمارے شاعروں کا کلام پر نظر آتا ہے، خاص کر آزاد اور حالی کی تحریک کے بعد اس طرح کے سرمایہ کی کوئی کمی نہیں۔ نظیر اکبرآبادی ان کے علاوہ ایسے بہت پہلے میر اور انشا کی مثنویاں، سودا اور ذوق کے قصیدے اور بعد کے شاعروں میں ان گنت ایسے شاعر جنھوں نے اپنے کلام کی ساری محفل کو انہیں مظاہر فطرت سے سجایا ہے۔"۱۱۵

"قدیم دکھنی شاعری کے موضوعات" میں نصیر الدین ہاشمی نے تحقیق سے قدیم دکھنی کے شاعری موضوعات کا احاطہ کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"دکھنی شعراء نے مختلف نہج پر اظہار خیال کیا ہے۔ ان کی شاعری کے موضوع ہمہ گیر رہے ہیں زندگی پر ہر پہلو کی تصویر کھینچی ہے۔"۱۱۶

"ساقی نے ترقی پسند ادب پر مضامین شائع ہوئے لیکن اس کے باوجود "ساقی" نے دلی کی شستہ زبان و تہذیب کی پاسداری بھی کی۔ سید محمود زیدی کا "نئی زندگی اور نیا ادب"، محمد احمد سبزواری کا نئی زندگی اور نیا ادب، ظفر قریشی کا مضمون "میکسم ڈے، صادق الخیری "میکسم گورکی ہمارے لیے" حسن عسکری "اُردو ادب میں ایک نئی آواز" و دیگر مضامین جدید تحریکات کے اثرات کے تحت لکھے گئے۔ سید محمود زیدی کے مضمون کا اقتباس ملاحظہ ہو:

"مغربی ادب نے ہمارے تخیلات ہی پر اثر نہیں ڈالا بلکہ ہمارے اسالیب بیان موضوعات کے چناؤ اور استدلال و استنباط کے طریقوں پر بھی اس کے گہرے نقوش پڑے ہیں۔ ہمارے نئے ادب کے تنوع کا دارومدار تو تمامتر مغربی تحقیقات اور تجربات پر ہے جوں جوں زمانہ گزرتا جارہا ہے نئی نئی باتوں کا انکشاف ہو رہا ہے۔ نئی نئی بحثیں چھڑتی ہیں نئے اسٹیج اخذ کیے جاتے ہیں اور ان نتائج کی روشنی میں زندگی پر روشنی پڑتی ڈالی جاتی ہے زندگی کی اسی چھان بین کا بھرپور اثر ہماری ذہنی نشوونما پر پڑتا ہے۔
نیا ادب اس ارتقا کے ذہنی انعکاس ہے۔ نئے ادب کی تخلیق مارکس اور انجلیز جیسے ماہری اقتصادیات، والیٹر اور روسو جیسے ماہرین عمرانیت اور جیمس اور فرائیڈ جیسے ماہرین نفسیات نے کی۔"۱۱۷

"ساقی" کے موضوعات میں تنوع نظر آتا ہے۔ تاریخی، معاشرتی اخلاقی مضامین نے "ساقی" کی مقبولیت میں اضافہ کیا شاہد احمد دہلوی نے "ساقی" کا "دہلی نمبر" نکال کر اُردو زبان تہذیب و تاریخ کی پاسداری کی ڈاکٹر انور سدید "ساقی" کی ادبی حیثیت کا یوں اعتراف کرتے ہیں:

"ساقی کے مقاصد اولی میں زبان وادب کا پاکیزہ مذاق پیدا کرنا، اُردو میں شاعری، نثر اور ادب لطیف کے نمونے پیش کرنا اورادباء کے ادبی محاسن و کمالات کا تعارف، اشاعت اور تحسین کو اہمیت حاصل ہے۔"۱۱۸

ادبِ لطیف: چوہدری برکت علی لاہور میں کتابوں کی اشاعت کا کاروبار کرتے تھے حکیم احمد شجاع اور صوفی تبسم کے پرزور اصرار پر مارچ ۱۹۳۵ء میں اُنہوں نے ایک جریدے کا آغاز کیا جس کا نام "ادبِ لطیف" رکھا۔ یوں "ادب لطیف" کا اجراء ۸/۳۰×۲۰ تقطیع پر ہوا۔ فی پرچہ اس کی قیمت پانچ آنے تھی جبکہ سالانہ چندہ تین روپے تھا۔ ادب لطیف کے یہ اغراض و مقاصد قرار پائے۔

"۱۔ زبان اُردو کے اعلیٰ نمونے پیش کرنا "ادب لطیف" کا مقصد حقیقی ہے۔

۲۔ ادب لطیف کی کوشش ہوگی کہ نثر، شاعری "ادب لطیف" کے اعلیٰ نمونے پیش کرے۔

۳۔ علمی اور تنقیدی مضامین کے ذریعے ملک میں پاکیزہ ادب پیدا کرنا "ادب لطیف" کا مقصد اعظم اور نصب العین ہوگا۔"

۴۔ "ادب لطیف" کی اشاعت کا حقیقی مقصد اور بڑی غرض یہ ہے کہ ابنائے وطن کو زبانِ اُردو کی قدر دانی کی طرف مائل کیا جائے اور ان کے محاسن و کمالات کو پوری پوری داد دیجائے۔"۱۱۹

ادب لطیف کے پہلے پرچے کی ادارت طالب انصاری نے کی دوسرے پرچے سے ادارت مرزا ادیب نے سنبھال لی۔ انہوں نے اپنی کاوشوں سے نامور نثر نگاروں کو، تخلیقی کاوشوں کو "ادب لطیف" میں جگہ دی اور اس دور کے معروف رسالے مثلاً ہمایوں، نیرنگ خیال و دیگر رسائل کی صف میں "ادب لطیف" کو لا کھڑا کیا۔ "ادب لطیف" کے سالنامے وسیع موضوعات، ادبی ذوق، اور زبان کی صحت سے مزین ہوا کرتے تھے۔ ۱۹۳۵ء تا ۱۹۳۹ء تک کے "ادب لطیف" کا مزاج قدرے رومانوی تھا۔ مارچ ۱۹۳۵ء میں ادب لطیف کے اجراء کے موقع پر حکیم احمد شجاع "ادب لطیف" کے بانی چوہدری برکت علی کو مرصع و مرقع نثر میں مضامین لکھنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ اس دور کے سائنسی، علمی، ادبی مضامین "انشائے لطیف" نثر کے حامل مضامین ہیں۔ ادب لطیف کا مارچ ۱۹۳۵ء کا پرچہ انشائے لطیف یعنی "Light Litrature" کا عکاس ہے۔ مثلاً چوہدری افضل حق کا نثر پارہ "حسرت کے متلاشی" ماہر القادری کا نثر پارہ "بکھرے ہوئے پھول" حسین ولطیف پیرائے میں لکھے گئے نثر پارے ہیں۔ محمد صادق قریشی کی تحریر "ننھی جمیلہ سے" و دیگر موضوعات رومان انگیز موضوعات ہیں۔ ننھی جمیلہ سے ایک اقتباس کی

مثال ملاحظہ ہو:

"جمیلہ تیری دنیا کس قدر رنگین اور طرب افزا ہے۔ میری دنیا تو تلخ حقائق اور رنگین ٹھوکروں سے مرکب ہے۔ تیری دنیا میں راحت اور طمانیت کی پریاں رقص کرتی ہیں۔ میری دنیا میں غم والم کے دیو زہر آلود دانت نکالے کھڑے ہیں۔"[۱۲۰]

اس دور کے دیگر رسائل کی طرح "ادب لطیف" میں بھی دوسری زبانوں سے ترجمہ کیے گئے مضامین نظر آتے ہیں۔ لیکن ۱۹۳۵ء تا ۱۹۳۹ء تک کے دور میں یہ ترجمہ شدہ مضامین بھی متخلیہ نثری مزاج لیے ہوئے ہیں اور مرصع اسلوب میں مزین ہیں۔ مثلاً عبد اللہ قریشی نے نامعلوم انگریز سیاح کے تاثرات کا ترجمہ کیا۔ اور مضمون کا عنوان "کاش رہنے کے لیے جنت کشمیر ملے" رکھا ہے۔ یہ مضمون ترجمہ کم اور ذاتی تخلیق زیادہ لگتا ہے۔ اس مضمون کی مرصع نثر ملاحظہ ہو:

"آسمان کی نیلگوں فضا بادلوں کی نقل وحرکت اور زمردیں پہاڑوں کا عکس جو وقت جھیل کے ساکن اور صاف پانی میں پڑتا ہے۔ تو انسان کا دل باغ باغ ہو جاتا ہے"[۱۲۱]

"ادب لطیف" کی مقبولیت کا آغاز سے شہرہ تھا اس لیے جلد ہی ہندوستان کے نامور ادیبوں کی تحریروں سے چودہری برکت علی نے اپنے جریدے کو سجایا اور جلد ہی "ادب لطیف" کے لکھنے والوں میں حکیم سید ناصر، چودھری افضل حق، ماہر القادری، حکیم علی احمد، سید نیاز احمد و دیگر ادبا شامل ہو گئے۔ "ادب لطیف" اپنے پانچ سال مکمل ہونے کے بعد رومانوی اثرات کے سحر سے باہر نکل آیا اور جلد ہی "ترقی پسند تحریک" سے متاثر ہو کر چودھری برکت علی نے "ادب لطیف" کو ترقی پسند نظریات کا عکاس بنا دیا۔ ترقی پسند ادب روس کے قرب وجوار سے اُٹھا اور پوی دنیا کو سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام کے خلاف قلمی جنگ پر آمادہ کر گیا۔ مارچ ۱۹۴۰ء کے ادبِ لطیف کے سرورق پر چودھری برکت علی کی جانب سے لکھا گیا تھا:

"ترقی پسند ادبا کی نگارشات کا ماہانہ مرقع"۔۔۔۔۔

مضامین میں بھی تنوع موجود ہے۔ غرض اس نمبر سے ادبِ لطیف کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔"[۱۲۲]

"ادب لطیف" کے اس دور کے لکھنے والوں میں فیض احمد فیض ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، سجاد ظہیر، مجنوں گورکھپوری، ڈاکٹر عبد العلیم، احتشام حسین، محمد حسن عسکری، عبادت بریلوی، ممتاز حسین، وقار عظیم و دیگر مضمون نگار شامل ہیں۔ "ادب لطیف" کا ترقی پسند تحریک سے متاثر ہونا ایک فطری عمل تھا ہندوستان پر انگریز کے تسلط کے

ساتھ ساتھ انگریز کے ظلم و ستم بڑھتے جا رہے تھے اور معاشرہ انقلاب کا منتظر تھا۔ انقلاب روس کے اثرات یورپ و برطانیہ میں پہنچے تو لندن میں موجود پڑھے لکھے نوجوانوں نے ہندوستان کے عوام پر انگریز کی ناانصافی کے خلاف آواز اُٹھانے کا تہیہ کرلیا۔ اور یوں اُنہوں نے مل کر لندن میں ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک کی بنیاد ڈالی۔ سجاد ظہیر اس تحریک کی نمائندگی کر رہے تھے۔ ادب میں گل و بلبل کی داستان رقم کرنے کی بجائے عوام کی ضرورتوں، مجبوریوں کی ادیبوں نے موضوع بنایا ترقی پسند تحریک سے وابستہ قلم کار مادیت اور اشتراکیت کو برابری کے درجے پر رکھ کر موضوعات چنتے "ادب لطیف" میں لکھنے والے ترقی پسند ادیبوں کا نظریہ تھا کہ مساوی حقوق کی نشان دہی کی جائے تو تیزی سے ہندوستان عوام ترقی کر سکتے ہیں اور اب رومان پرور حسن کاریوں کی، بھوک و افلاس زدہ ہندوستانی معاشرے میں قطعی کوئی گنجائش نہیں رہی۔ جابر علی سید اپنی کتاب "تنقید و تحقیق" میں لکھتے ہیں:

> "ادب لطیف! اس نام سے ماہنامہ "ادب لطیف" ۱۹۳۵ء میں لاہور سے نکلنا شروع ہوا اور اب تک نکلتا ہے۔ لیکن یہی "ادب لطیف" جلد ہی ترقی پسند تحریک کا قافلہ سالار بن گیا۔"[۱۲۳]

"ادب لطیف" کی وساطت سے جولائی ۱۹۴۰ء میں شاکر علی کا انتہائی مختصر ادب پارہ "لہریں" منظر عام پر آتا ہے اس کی اہمیت یہ ہے کہ اس میں امیری اور غریبی کے تفاوت کے ساتھ ساتھ غریبی کی مظلوم موت اور امیری کی شاہانہ پرستش کا موزانہ کیا گیا ہے:

> "تارکول کی شفاف سڑک پر ایک جھلملاتی ہوئی لانبی سی موٹر کے مڈگارڈ میں ایک انسانی ڈھانچہ پھنسا ہوا تھا۔ ایک بوڑھی فقیرنی کا ڈھانچہ!!!
> تماشائیوں کا ہجوم ایک دائرے کی شکل میں موٹر کے گرد جمع ہوگیا۔ کسی سیٹھانی نے اُسی وقت پوجا کے پھول سمندر کی بھینٹ چڑھائے۔ پھول ایک دو چکر کھا کر سمندر میں بیٹھ گئے۔ لہریں ایک دائرہ بنا کر پھر غالب ہوگئیں۔ پانی کی سطح پر صرف چند پتیاں ناچتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔
> اور سڑک پر خون کا بڑا سا دھبا!
> زندگی اور سمندر کی لہریں اسی طرح مٹتی اور بگڑتی رہتی ہیں۔"[۱۲۴]

"ادب لطیف" کے اسی دور نے ہندوستان کے عوام اور قارئین ادب کے شیدائیوں کے ذہن کو یکسر تبدیل کردیا۔ اور قاری تصنع بھرے ماحول میں مدغم ہونے کی بجائے مصائب کے حل کی تگ و دو میں لگ گیا۔ بجائے اس کے کہ دوسرے اس کی خبر رکھیں وہ خود اپنی خبر رکھنے لگا اور مسائل کا حل بھی تلاش کرنے لگا۔ عوام کے نظریات تبدیل

کرنے میں ''ادب لطیف'' کی کوششوں کو سراہا جاسکتا ہے۔ خود ستمبر ۱۹۴۰ء کے ''اشارات'' میں ''ادارہ ادب لطیف'' یوں لکھتا ہے:

> ''ترقی پسند دراصل ایک اضافی بات ہے سب سے ضروری بات مصنف کی بیداری مغزی ہے اوراس کے قلم کی قوت۔ پھر وہ عوام کے نظریے بدل سکتا ہے۔ وہ جس موضوع پر بھی قلم اُٹھاتا ہے اس میں زندگی پیدا کردیتا ہے۔''[۱۲۵]

۱۹۴۰ء کے بعد ''ادبِ لطیف'' کی ادارت تیزی سے بدلتی رہی اور ''ادبِ لطیف'' جریدہ ترقی پسند ادباء کے ترقی پسند ذہن سے مستفید ہوتا رہا۔ مدیرانِ ''ادب لطیف'' میں فیض احمد فیض سرفہرست۔ ڈاکٹر انور سدید نے اپنی کتاب ''پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ'' (ابتداء تا ۱۹۸۸ء) میں ''ادب لطیف'' کی ادارت کے حوالے سے فی مدیر ایک سال کی ادارت کی تبدیلی کا تذکرہ کیا ہے۔ ''ادب لطیف'' میں تخلیقی تنقید کے مضامین بھی ملتے ہیں۔ اصل نقاد وہ ہوتا ہے جو کسی بھی تخلیق کا سرسری جائزہ نہیں لیتا اور تنقید کے نئے تخلیقی مواد کے تحت نئے اُصولوں وقواعد مرتب کرتا ہے۔ ادب لطیف کے مضامین اپنے اندر نہ صرف تنقیدی مزاج رکھتے ہیں بلکہ نقاد کی دانشمندانہ پرکھ کے بھی عکاس ہیں۔ اس جریدے کے مضامین کے تحت مارکسی تنقید کے تحت لکھے گئے ہیں۔ ''ادب لطیف'' میں ایسے موضوعات پر قلم اٹھایا گیا ہے جو ادب اور سماج کے رشتے کو مربوط کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ یہاں ہم چند مضامین کا تذکرہ کریں گے۔

مسعود احمد قریشی کا مضمون ''فیض کی شاعری میں ادب اور ترقی پسند ادب کے فرق کو واضح کیا ہے جبکہ اکرم قمر کا مضمون ''آمریت'' میں آمریت کی فوقیت، اس کے پس منظر کے حوالے سے بات کی ہے نپولین، ہٹلر اور مسیولنی کے جبر اور قیادت میں پنہاں زوال کو آشکار کیا ہے۔ خلیق ابراہیم نے اپنے مضمون ''پریم چند'' میں پریم چند کے نظریات کا تجزیہ کیا ہے کہ پریم چند نے اپنی تحریروں کے ذریعے معاشرے کی حقیقی تصاویر دکھائی ہیں اور ایک حقیقت پسند افسانہ نگار کی حیثیت سے پریم چند اُبھر کر سامنے آئے۔ اُنہوں نے اپنے افسانوں کے ذریعے حقائق تک رسائی کے رجحان کو ادب میں فروغ دیا۔ فیض احمد فیض کا مضمون ''حالی ایک ادبی باغی.....'' ہے جس میں مختصر دلائل کے ساتھ ثابت کیا ہے کہ حالی نے داخلیت سے خارجیت کی طرف شاعری کا رُخ موڑ کر ایک کامیاب ادبی باغی کا خطاب پایا ہے جبکہ محمد علی صدیقی کا مضمون ''ترقی پسند ادب'' میں ترقی پسند ادب کو سماج کا آئینہ دار قرار دیا ہے۔

''ادب لطیف'' کے لکھنے والے نثر نگاروں نے ادب کو انسانی حقوق کی پامالی، انسانی حقوق کی بحالی اور

انسانی حقوق کی پاسداری کو اپنا موضوع بنایا۔ معاشرے کے کمزور سسکتے اور نہتے عوام کی نا آسودہ زندگی اور نا آسودہ زندگی کے تلخ رویوں پر بات کی۔ یوں ''ادب لطیف'' عوام کی آواز بن کر اُبھرا۔ جوش ملیح آبادی کا مضمون ''ادب اور احتساب'' اسی سلسلے کی کڑی ہے اور ساحر لدھیانوی کا مضمون ''سوویٹ جرمن پر ایک نظر'' ایسا مضمون ہے جس میں ۲۲ جون ۱۹۴۱ء کی جنگ پر عالمانہ تبصرہ ہے جس کے آخر میں والیٹر، روسو اور لنین کے اقوال درج ہیں اور لنین کا یہ قول ترقی پسند تحریک کی بھرپور نمائندگی کرتا ہے:

> ''لوگوں کے لیے سب سے پہلے کھانے، پینے، پہننے اور رہنے کا انتظام ہونا چاہیے۔ اس کے بعد وہ اپنی توجہ آرٹ، سائنس اور مذہب کی طرف مبذول کر سکتے ہیں۔''۸

''ادب لطیف'' نے طبقاتی تقسیم کے خلاف آواز بلند کی اور اشتراکیت پر بات کی۔ مساوی تقسیم دولت اور مساوی حقوق کے رجحان کو ''ادب لطیف'' نے فروغ دیا اور احتشام حسین کا مضمون ''اُردو ڈرامہ کا موضوع'' میں سجاد ظہیر کے ڈرامہ ''بیمار'' اور اوپندر ناتھ کے ڈرامے کے مجموعے ''پالی'' و دیگر ڈراموں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ احتشام حسین ان ڈراموں کے موضوعات کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''ان ڈراموں کے موضوع وہی ہیں جو افسانوں اور ناولوں کے ہیں۔ سوسائٹی کی ناانصافیاں، پابندیاں اور بے ترتیبیاں، طبقاتی کشمکش، ذات پاک کے فرق، زندگی کی ذلت اور اہانت، بے روزگاری، بھوک اور جنس کے مسائل، بے جوڑ شادیاں، رسم و رواج پر عقل کی قربانیاں اور عقل پر جذبات کی لطیف ایسے نہ جانے کتنے واقعات ہیں جن کی تہہ میں غلامی اور آزادی، سرمایہ اور محنت ترقی اور تنزلی کے بنیادی جھگڑے کام کرتے رہتے ہیں۔ جدید ڈراموں کے موضوعات بھی یہی ہیں، کبھی واضح طور پر، کبھی طنز کی شکل میں، کبھی علامتوں اور اشاروں کے پردے میں، کبھی محض زور بیان کی مدد سے زندگی کی گتھیاں سلجھائی جا رہی ہیں یا شاید کبھی کبھی زیادہ اُلجھادی جاتی ہیں۔''۹

سجاد ظہیر اپنے مضمون ''اُردو شاعری اور اُنکا مستقبل'' میں حالی کی جدید شاعری، اقبال کی شاعری کے ساتھ ساتھ جوش پر مختصر تبصرہ کر کے ان شعرا کی شاعری میں جدید رجحانات پر بحث کی ہے۔ شباب اُردو، نیرنگ خیال، ساقی، ہمایوں، رومانوی نثر پر انحصار کیے ہوئے تھے اور تخیلاتی مرصع فکر و زبان کے رجحان کو فروغ دے رہے تھے۔ ''ادب لطیف'' نے اس دور میں فرد کی ضرورت اور مجبوریوں کی نشان دہی کی۔ مظلوم مفلوک الحال افراد معاشرہ کی بھوک و افلاس پر قلم اُٹھایا انسان دوستی کا درس دیا اور ادب کا سماج سے رشتہ استوار کیا۔ روٹی، کپڑا اور مکان پر سات کی۔ بوسیدہ گھروں کے خستہ حال مسکینوں کے مسائل کے انبار کو اپنے موضوعات کے لیے منتخب کیا۔ اور مغرور

حیلہ باز سرمایہ دار کی اصلیت کو بے نقاب کیا۔ ''ادب لطیف'' نے فرد معاشرہ کی ذہنی و قلبی فکر کو بتدریج تبدیل کرنے میں اہم کردار ادا کیا اور افراد معاشرہ کو شعور و آگاہی عطا کی۔ افراد معاشرہ کو عدل و انصاف سے روشناس کرایا ناانصافیوں کے خلاف آمادۂ جنگ کا درس بھی دیا۔ سرمایہ دار کی مکاریوں اور چالبازیوں کے خلاف بندہ مزدور کو بلند آواز کرنے کا حوصلہ دیا اور فدیوں جدید ادب کے رجحان کو فروغ دیا۔ ایسا ادب جو صرف پریوں کے دلآویز قصے سنا کر عوام کو بہلادے ''ادب لطیف'' نے ایسے ادب اور ایسے لکھاری کو یکسر رد کر دیا۔ بلکہ اپنے موضوعات کو تنوع و وسعت دی اور ان موضوعات کا رشتہ حقیقی زندگی سے جوڑا وہ زندگی جو تلخ بھی ہے۔ جس میں افرادِ معاشرہ کو اپنے حقوق کی جنگ خود لڑنی پڑتی ہے ایسا ادب جو انسانی جذبات و احساسات کا آئینہ دار ہے اور ایسا ادب جو نہ صرف مفاہمت سے اجتناب کرتا ہے بلکہ متاثرہ معاشرہ کی تنزلی اور معاشی ابتری پر کھل کر بات کرتا ہے۔ یوں ''ادب لطیف'' نے ''ترقی پسند ادب'' کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔ مسائل اور ان کے حل کے ساتھ ساتھ افرادِ معاشرہ کے ماحول کو سازگار بنانے پر بھی ''ادب لطیف'' نے زور دیا۔ یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ''ادب لطیف'' عوام دوست جریدہ بن کر سامنے آیا اور ''ادب لطیف'' نے سرمایہ دارانہ نظام پر بے لاگ اور کھلی تنقید کی ہے۔

حواشی

۱۔ محمد اشرف، خان، ڈاکٹر، ''اُردو تنقید کا رومانوی دبستان''، لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، طبع اوّل، ۱۹۹۶ء، ص:۱۵۶

۲۔ سجاد حیدر یلدرم ''حضرتِ دل کی سوانح عمری''، مشمولہ مخزن، لاہور، جلد نمبر ۷ فروری ۱۹۰۷ء، ص:۵۷

۳۔ عبد الودود، ڈاکٹر ''اُردو نثر میں ادب لطیف''، لکھنو: نسیم بک ڈپو، لاٹوش روڈ، بار دوم، فروری ۱۹۸۰ء، ص:۴۲۷

۴۔ قدسیہ کریم، مخزن ایک تحقیقی جائزہ (ابتدائی دس سالوی کی تخصلیں) مقالہ، لاہور: اورنٹیل کالج یونیورسٹی، ۱۹۷۰ء، ص:۴۷

۵۔ انور سدید، ڈاکٹر، ''پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ'' (ابتداء تا ۱۹۸۸ء)، اسلام آباد: اکادمی ادبیاتِ پاکستان، اشاعت اول جنوری ۱۹۹۲ء، ص:۵۰

۶۔ حسن نظامی، نقاب اور گھونگھٹ''، مشمولہ مخزن، لاہور، جلد نمبر ۸ نمبر ۴ جنوری ۱۹۰۵ء، ص:۳۰

۷۔ انور سدید، ڈاکٹر، ''پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ'' (ابتداء تا ۱۹۸۸ء) اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، اشاعت اول جنوری ۱۹۹۲ء، ص:۵۱

۸۔ دیریندر پرشاد سکسینہ بدایونی، پٹنہ: خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، س، ۱۹۹۵ء، جلد ۳۲، ص:۱۶۷

۹۔ ایضاً، ص:۱۶۹_۱۶۸

۱۰۔ انور سدید، ڈاکٹر، ''پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ'' (ابتدا تا ۱۹۸۸ء)، اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، جنوری ۱۹۸۸ء، ص:۵

۱۱۔ الطاف حسین، حالی، زمانہ، اگست ۱۹۰۶ء، مشمولہ، پٹنہ: خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، جلد ۱۴، سن ۱۹۹۵ء، ص:۳۵_۳۴

۱۲۔ محمد عبدالرزاق، ''سائنس کی بربریت''، مشمولہ ''زمانہ'' کانپور، جلد نمبر ۶۷، نمبر ۳، ص:۲۸۵

۱۳۔ دیا نرائن، نگم، منشی، مشمولہ ''زمانہ'' کانپور، جلد ۴۰، نمبر ۱۲ دسمبر ۱۹۳۳ء، ص:۴۰۱

۱۴۔ پریم چند، ''مصوری''، مشمولہ، مضامین پریم چند، مرتب عتیق احمد، کراچی: انجمن ترقی اردو، پاکستان، اشاعت اوّل، ۱۹۸۱ء، ص: ۲۹۰

۱۵۔ عبدالقادر، شیخ، سر، ''زمانہ اور ترقی اُردو''، مشمولہ زمانہ کانپور، جلد ۵۰، نمبر ۲، فروری ۱۹۲۸ء، ص: ۷

۱۶۔ عبدالرزاق قریشی، ''منشی دیا نرائن نگم''، مشمولہ، ''دیا نرائن نگم اور رسالہ زمانہ واخبار آزاد، جلد ۳۲، پٹنہ: خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری ۱۹۹۵ء، ص: ۱۶۳

۱۷۔ حسرت موہانی، ''کیا مسلمانوں کو کسی پولٹیکل ایسوسی ایشن کی ضرورت ہے''، مشمولہ اُردوئے معلیٰ، علی گڑھ، جلد ۱ نمبر ۵، نومبر ۱۹۰۳ء، ص: فلپ

۱۸۔ عبداللہ شیخ، ''مسلمان اور پالٹیکس''، مشمولہ ''اُردوئے معلیٰ''، علی گڑھ جلد ۲ نمبر ۲، فروری ۱۹۰۴ء، ص: ۱۰

۱۹۔ حسرت موہانی، ''مسلمان نیشنل کانگریس اور پولٹیکل ایجیٹیشن''، مشمولہ ''اُردوئے معلیٰ''، علی گڑھ، جلد ۷، نمبر ۶، جون ۱۹۰۷ء، ص: ۶

۲۰۔ سجاد حیدر، یلدرم، ''ایک مغنیہ کی التجاء''، مشمولہ، ''اُردوئے معلیٰ''، علی گڑھ، جلد نمبر ۶، نمبر ۶، ۱۹، ص: ۲۱

۲۱۔ انور سدید، ڈاکٹر، ''پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ'' (ابتدا تا ۱۹۸۸ء)، اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، اشاعت اوّل ۱۹۹۲ء، ص: ۵۲

۲۲۔ علی محمود، ''خود غرضی اور اس کی وسعت''، مشمولہ ''اُردوئے معلیٰ''، علی گڑھ، جلد ۲، نمبر ۳، مارچ ۱۹۴۰ء، ص: ۲۸

۲۳۔ ذکاء اللہ، مولوی، ''براہین ثلاثہ''، مشمولہ، ''اردوئے معلیٰ'' علی گڑھ، جلد ۳، نمبر ۶، دسمبر، ۱۹۰۴ء، ص: ۲۳۔۲۲

۲۴۔ ظفر الملک، علوی، مشمولہ ''الناظر''، لکھنو، نمبر ۱، جلد ۱، جولائی ۱۹۰۹ء، ص: ۵

۲۵۔ ظفر الملک، علوی، مشمولہ ''الناظر''، لکھنو، نمبر، جلد، اگست ۱۹۲۵ء، ص: ۶۸

۲۶۔ محمد حسین، رنگین، صدیقی، ''معتصم باللہ''، مشمولہ ''الناظر''، لکھنو، جلد ۲، نمبر ۱۱، مئی ۱۹۱۰ء، ص: ۳۶

۲۷۔ ضیاء الدین برنی، ''فلسفہ قوتِ ارادی''، مشمولہ، ''الناظر''، لکھنو، نمبر ۱۱ جلد ۲، مئی، ۱۹۱۲ء ص: ۲۵

۲۸۔ عطیہ، فیضی، ''مدرسہ النسواں''، مشمولہ، ''الناظر''، لکھنو، نمبر ۳، جلد ۱، ستمبر ۱۹۰۹ء، ص: ۵۱

۲۹۔ احسان علی، فصیح، ''الناظر''، اپریل ۱۹۱۰ء، مشمولہ، اردو شعر و ادب، پٹنہ: خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، ۲۰۰۱ء، ص: ۲۲۱، ۲۲۰



۳۰۔ اعظم کریوی، ''رابرٹ، براؤننگ''، مشمولہ ''الناظر''، لکھنو، نمبر۳، جلد ۳۷، مارچ ۱۹۳۰ء، ص: ۳۱

۳۱۔ سلیمان ندوی، سید، ''تذکرات''، معارف، جلد ۱، نمبر ۱، جولائی ۱۹۱۶ء، ص: ۵

۳۲۔ خلیق انجم، ''سلیمان ندوی'' (مرتب) لاہور: فینس بکس الوہاب مارکیٹ اردو بازار، بار اوّل ۱۹۸۹ء، ص: ۱۵۰

۳۳۔ عبدالسلام ندوی، ''حریم قدس''، معارف، جلد ۱، نمبر ۱، جولائی ۱۹۱۶ء، ص: ۲۰

۳۴۔ ایضاً، ص: ۲۵

۳۵۔ سعید انصاری، ''حکیم ابن زکریا رازی''، معارف، جلد ۱، نمبر ۱، جولائی ۱۹۱۶ء، ص: ۴۳

۳۶۔ انور سدید، ڈاکٹر، ''پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ'' (ابتدا تا ۱۹۸۸ء) اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، جنوری ۱۹۸۸ء، ص: ۵۸۔۵۹

۳۷۔ امتیاز علی تاج، سید کہکشاں، مشمولہ، ''ادبیاتِ اُردو کے ارتقاء میں رسائل کا کردار''، غیر مطبوعہ مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی مولف روشن آراء، پنجاب یونیورسٹی، اورینٹل کالج، لاہور، سن ندارد، ص: ۴۲۷، ۴۲۸

۳۸۔ مسکین علی حجازی، ڈاکٹر، ''پنجاب میں اُردو صحافت کی تاریخ''، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۷ء ص: ۲۲۰۔

۳۹۔ امتیاز علی تاج، ''ہم خود''، کہکشاں، جلد ۴، نمبر ۱، جنوری ۱۹۲۰ء ص: ۵

۴۰۔ بہادر لال نگم، جنگ، ''چاندنی رات میں''، کہکشاں، جلد ۴، نمبر ۱، جنوری ۱۹۲۰ء، ص: ۲۵

۴۱۔ روشن آراء راؤ، ''ادبیاتِ اُردو کے ارتقا میں رسائل کا کردار''، غیر مطبوعہ مقالہ، پی ایچ۔ڈی پنجاب یونیورسٹی، اورینٹل کالج، لاہور، سن ندادر، ص: ۴۳۰

۴۲۔ ممتاز علی، سید، مولوی ''بکتریا''، کہکشاں، جلد ۴، نمبر ۱، جنوری ۱۹۲۰ء، ص: ۱۰

۴۳۔ عبدالودود، ڈاکٹر، ''اردو نثر میں ادب لطیف''، لکھنو: نسیم بک ڈپو، لاٹوش روڈ، بار دوم فروری ۱۹۸۰ء، ص: ۳۳

۴۴۔ فرید قمر، غلام، ''ماں'' مشمولہ ''شباب اردو''، جلد ۹، نمبر ۳، جون ۱۹۲۴ء، ص: ۶۱

۴۵۔ سبزہ بیگم، ''گنہگار ہوں میں'' مشمولہ، ''شباب اردو''، جلد ۱۰، نمبر اول، اکتوبر ۱۹۳۰ء، ص: ۳۸

۴۶۔ محمد عزیز الحسن، قریشی، ''تفریحات شب''، مشمولہ، ''شباب اردو'' جلد ۹، نمبر ۴، جولائی ۱۹۲۴ء، ص: ۱۱

۴۷۔ انوار علی، سید، نقوی، ''دکن کا ایک پرانہ قلعہ''مشمولہ، ''شباب اردو''، جلد ۱۵، نمبر ۲۵، اگست، ستمبر، ۱۹۲۷ء، ص:۱۰۰

۴۸۔ نثار، ''میرا گھوارہ''مشمولہ، ''شباب اردو''، جلد سیز دہم، نمبر سوم، جون ۱۹۲۶ء، ص:۹

۴۹۔ شیبانی، ''مینڈل کیمرہ''مشمولہ، ''شباب اردو''، جلد دہم، نمبر ۲، نومبر ۱۹۲۴ء، ص:۴۲

۵۰۔ فضل الدین فیاض، مولوی، ''کلام رند''مشمولہ، ''شباب اردو''، جلد دہم، نمبر ۲، نومبر ۱۹۲۴ء، ص:۳۲

۵۱۔ اعجاز الہ آبادی، ''سحر البیان''مشمولہ، ''شباب اردو''جلد پانز دہم، نمبر ۵، ۶، اگست و ستمبر، ۱۹۲۸ء، ص:۱۳۰

۵۲۔ انجمن آراء، ''فریدوں''مشمولہ، ''شباب اردو''، جلد ۱۹، نمبر ۶، مارچ ۱۹۳۰ء، ص:۳۰

۵۳۔ انور سدید، ڈاکٹر، ''پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ'' (ابتدا تا ۱۹۸۸ء) اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، جنوری ۱۹۸۸ء، ص:۶۰،۵۹

۵۴۔ عبدالحق، مولوی، ''مثنوی بہار عشق''مشمولہ، ''رسالہ اردو''، جلد ششم، حصہ بست و چہارم، انجمن ترقی اردو اورنگ آباد، دکن، اکتوبر ۱۹۲۶ء، ص:۶۷۵

۵۵۔ روشن آراء، سید، ادبیات اردو کے ارتقاء میں رسائل کا کردار، غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ، برائے پی ایچ۔ڈی، لاہور، جامعہ پنجاب، سن ندارد، ص:۴۳۵

۵۶۔ انور سدید، ڈاکٹر، ''پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ'' ابتدا تا ۱۹۸۸ء، اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، اشاعت اول ۱۹۹۲ء، ص:۷۱

۵۷۔ عبدالحق، مولوی، ''اردو زبان کے قدیم کتبے''، مشمولہ، رسالہ ''اردو'' جلد ۱۸، حصہ ۷، اپریل ۱۹۳۸ء، ص:۲۷۶

۵۸۔ انور سدید، ڈاکٹر، ''پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ'' ابتدا تا ۱۹۸۸ء، اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، اشاعت اول ۱۹۹۲ء، ص:۷۱

۵۹۔ بشیر احمد، ''بزم ہمایوں''، مشمولہ ''ہمایوں''، جلد ۱، نمبر ۱، جنوری ۱۹۲۲ء، ص:۳

۶۰۔ عبدالودود، ڈاکٹر، ''اردو نثر میں ادب لطیف''، لکھنو: نسیم بکڈپو، لاٹوش روڈ، بار دوم، فروری، ۱۹۸۰ء، ص:۴۴۱

۶۱۔ محمد حسین، آزاد، ''جذبات آزاد''، مشمولہ، ''ہمایوں'' جلد۹، نمبر۶، دسمبر ۱۹۲۵ء، ص:۳۴۹

۶۲۔ مسکین علی، حجازی، ڈاکٹر، ''پنجاب میں اردو صحافت کی تاریخ''، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۷۷ء، ص:۲۲۳

۶۳۔ عبدالقادر، سر ''پنجاب میں اردو''، مشمولہ، ''ہمایوں''، جلد۱، نمبر۱، جنوری ۱۹۲۲ء، ص:۴۷

۶۴۔ عظیم بیگ، چغتائی، مرزا، ''ممتحن کا پان''، مشمولہ، ہمایوں، جلد ۱۸، نمبر۶، دسمبر، ۱۹۳۰ء، ص:۸۸۳

۶۵۔ نیاز فتح، پوری، نگار، جلد۱، شمارہ۱، فروری ۱۹۲۲ء، ص:۷

۶۶۔ انور علی، ''اُردو صحافت''، دہلی، اردو اکادمی، فروری ۱۹۸۷ء، ص:۱۱۷

۶۷۔ امتیاز علی، تاج، ''اے مطربہ''، مشمولہ، نگار، جلد۱، شمارہ۱، فروری ۱۹۲۲ء، ص:۵۶

۶۸۔ نیاز فتح، پوری، نگار، جلد نمبر۱، شمارہ نمبر۳، اپریل ۱۹۲۲ء، ص:۲

۶۹۔ نیاز فتح، پوری، نگار، جلد نمبر۱، شمارہ۷، اگست ۱۹۲۲ء، ص:۶۸

۷۰۔ مجنوں گورکھپوری، ''فانی''، مشمولہ، نگار، جلد۵۲، شمارہ نمبر۵، نومبر ۱۹۴۷ء، ص:۳۰

۷۱۔ انور سدید، ڈاکٹر، ''پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ'' ابتداء تا ۱۹۸۸ء، اسلام آباد: اکادمی ادبیات، پاکستان، اشاعت اول جنوری ۱۹۹۲ء، ص:۸۰

۷۲۔ محمد اسحاق، ''رسالہ جامعہ کی علمی خدمات''، مشمولہ ''اردو زبان کے فروغ میں جامعہ ملیہ کا حصہ''، مرتبہ صغریٰ مہدی، دہلی مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، پہلی اکتوبر ۱۹۹۷ء، ص:۹۵

۷۳۔ نصیر الدین ہاشمی، ''امین کی یوسف زلیخا''، مشمولہ، ''جامعہ''، جلد۱۳، نمبر۲، اگست ۱۹۲۹ء، ص:۱۲۷

۷۴۔ عابد حسین، سید، ڈاکٹر، ''مسلمانوں کی تعلیم اور جامعہ ملیہ''، مشمولہ، ''جامعہ''، جلد۷، نمبر۲، اگست ۱۹۲۶ء، ص:۸۳

۷۵۔ آل احمد سرور، ''اردو ادب ۱۹۴۱ء میں''، مشمولہ، ''جامعہ''، جلد۳۶، نمبر۱، جنوری ۱۹۴۲ء، ص:۳۷

۷۶۔ عبدالماجد، دریا آبادی، ''جوہر کی شاعری''، مشمولہ، ''جامعہ''، جلد۲۴، نمبر۱۱، نومبر ۱۹۳۵ء، ص:۸۸۸

۷۷۔ فرحت اللہ، بیگ، ''نئی دہلی''، مشمولہ، ''جامعہ''، جلد۲، نمبر۴، اپریل ۱۹۲۹ء، ص:۲۹۲

۷۸۔ محمد مجیب، ''ڈاکٹر محمد اقبال مرحوم''، مشمولہ، ''جامعہ''، جلد۲۹، نمبر۶، جون ۱۹۳۸ء، ص:۵۳۰

۷۹۔ مجیب، رضوی، ''اردو زبان کے فروغ میں جامعہ ملیہ کا حصہ'' مرتبہ: صغریٰ مہدی، دہلی مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، اکتوبر



۱۹۹۷ء، ص:۱۵،۱۴

۸۰۔ محمد یوسف حسن، حکیم، ''مقالہ اختتامیہ''، مشمولہ، ''نیرنگ خیال'' جلد نمبر ا نمبر ا، جولائی ۱۹۲۴ء، ص:۴

۸۱۔ امتیاز علی تاج، سید، '' ایک قدیم تہذیب کے آثار''، مشمولہ، نیرنگ خیال، جلد ۸ نمبر ۴۶،۴۵، اپریل و مئی ۱۹۲۸ء، ص:۸

۸۲۔ روشن آراء، راؤ۔ ''ادبیاتِ اُردو کے ارتقا میں رسائل کا کردار''، غیر مطبوعہ مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی، جامعہ پنجاب، سن ندارد، ص:۵۰۱

۸۳۔ عبد الروف عشرت، سید، لکھنوی، ''مشکلاتِ زبان''، مشمولہ، ''نیرنگ خیال'' سالنامہ جلد ۷، نمبر ۳۹، فروری ۱۹۲۵ء ص:۱۱

۸۴۔ عبدالقادر سر، ''اُردو کا مستقبل''، مشمولہ، نیرنگ خیال، سالنامہ، جلد، نمبر، ص: ۳۸

۸۵۔ فرحت اللہ، بیگ، ''اونہہ''، مشمولہ، نیرنگ خیال، جلد، نمبر، فروری مارچ، نمبر ۱۹۳۰ء ص: ۱۱۱

۸۶۔ محمد یوسف حسن حکیم، ''شذرات''، مشمولہ، نیرنگ خیال، جلد، نمبر، فروری مارچ جلد نمبر ۱۹۳۰ء ص:۵

۸۷۔ بشیر احمد بشیر، ''دیوانہ''، مشمولہ، نیرنگ خیال، جلد ۱۳، نمبر ۱۰۳، جنوری ۱۹۳۳ء ص:۱۸

۸۸۔ نصیر الدین، ہاشمی، ''پدماوت کے قصے''، مشمولہ، نیرنگ خیال، ۱۹۲۹ء، جلد ۹، نمبر ۶۳، ص:۲۷

۸۹۔ حسن مصطفیٰ، غلام، ''فن تحقیق''، نقوش، شمارہ ۱۰۴، جنوری ۱۹۶۶ء، ص:۱۷۶

۹۰۔ وقار عظیم، سید ''اکبر اور تغزل''، مشمولہ، نیرنگ خیال جلد ۱۳، نمبر ۱۱۱، ستمبر ۱۹۳۳ء، ص:۱۱

۹۱۔ مظہر انصاری، ''افسانے کا عنوان''، مشمولہ، نیرنگ خیال، جلد ۱۹، نمبر ۱۱۳، نومبر ۱۹۳۳ء ص:۵

۹۲۔ محمد شفیع، مولوی، ''اورینٹل کالج میگزین''، جلد ا، نمبر ا فروری ۱۹۲۵ء، ص:۲

۹۳۔ انور سدید، ڈاکٹر، ''پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ (ابتداء تا ۱۹۸۸ء)، اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، جنوری، ۱۹۹۲ء، ص:۹۱

۹۴۔ غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر، مرتب، تاریخ اورینٹل کالج یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۶۲ء، ص:۸۰

۹۵۔ محمد شفیع، مولوی، ''رامپور کے دو کتب خانے''، مشمولہ، ''اورینٹل کالج میگزین''، جلد ۲، نمبر ۴، اگست، ۱۹۲۶ء، ص:۲

۹۶۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر، ''اورینٹل کالج میگزین''، جلد ۴۸، نمبر ۲،۱، جنوری ۱۹۴۷ء، ص:۹۲

۹۷۔ حسین خان، نیازی، ''مرزا عبدالقادر بیدل''، مشمولہ، ''اورینٹل کالج میگزین''، جلد ۸، عدد ۴، اگست ۱۹۳۲ء، ص:۶۵

۹۸۔ محمد باقر، ''اورینٹل کالج میگزین''، جلد ۱۷، عدد ۱، نومبر ۱۹۴۰ء، عدد مسلسل ۶۳، ص:۴

۹۹۔ تاجور نجیب آبادی، مولانا، ''ادبی دنیا کا مقصد اشاعت''، مشمولہ، ادبی دنیا، جلد ۱، نمبر ۱، مئی ۱۹۲۹ء، ص:۳۴

۱۰۰۔ محمود اسیر احمد، ڈاکٹر، ''مولانا صلاح الدین احمد احوال و آثار'' لاہور، مجلس ترقی ادب، اشاعت اول جنوری ۲۰۰۹ء، ص:۱۶۶

۱۰۱۔ مالک رام، ''غالب کی مہریں''، مشمولہ، ''ادبی دنیا''، جلد ۱۹، نمبر ۴، اپریل ۱۹۴۱ء، ص:۲۰

۱۰۲۔ میراجی، ''فرانس کا تخیل پرست شاعر''، مشمولہ، ''ادبی دنیا'' جلد ۱۷، نمبر ۷، جولائی ۱۹۳۹ء، ص:۲۶

۱۰۳۔ فیض احمد فیض ''شعر میں اظہار اور ترجمانی''، مشمولہ، ادبی دنیا، سالنامہ، جلد، نمبر، ص:۶۳

۱۰۴۔ انور سدید، ڈاکٹر، ''پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ''، ابتداء تا ۱۹۸۸ء، اسلام آباد: اکادمی ادبیات، پاکستان، اشاعت اول، جنوری ۱۹۹۲ء، ص:۹۶_۹۵

۱۰۵۔ شاہد احمد، دہلوی، مقاصد، مشمولہ، ''ساقی''، جلد ۱، نمبر ۱، جنوری ۱۹۳۰ء، ص:۱

۱۰۶۔ شاہد احمد، دہلوی، مقاصد، مشمولہ، ''ساقی''، جلد ۱، نمبر ۴، اپریل ۱۹۳۴ء، ص:۳

۱۰۷۔ حسن، برنی، سید، سالنامہ، ملک الامراء فخر الدین، مشمولہ، ''ساقی''، جلد، نمبر، جنوری ۱۹۳۵ء، ص:۲۲

۱۰۸۔ حجاب اسماعیل، زندگی، مشمولہ، ''ساقی''، جلد ۱، نمبر ۹، دسمبر و اکتوبر ۱۹۳۰ء، ص:۱۰۹

۱۰۹۔ انصار ناصر، ''ملکہ شب''، مشمولہ، ''ساقی''، سالنامہ، جلد، نمبر، ۱۹۳۵ء، ص:۴۰

۱۱۰۔ حسن عسکری، ''مرزا عظیم بیگ چغتائی''، مشمولہ، ''ساقی''، جلد ۲۶، نمبر ۲، اگست، ۱۹۴۲ء، ص:۲۵

۱۱۱۔ حسن عسکری، ''اردو ادب میں نئی آواز''، مشمولہ، ''ساقی'' جلد ۲۴، نمبر ۲، اگست، ۱۹۴۱ء، ص:۲۲

۱۱۲۔ عندلیب شادانی، ڈاکٹر، ''ایران کی امرد پرستی کا اثر اردو شاعری پر''، مشمولہ، ''ساقی''، جلد ۱۵، نمبر ۱، جنوری ۱۹۳۷ء، ص:۱۵۰

۱۱۳۔ وقار عظیم، ''شاعری اور مظاہر فطرت''، مشمولہ، ''ساقی''، جلد ۳۳، نمبر ۶، جون ۱۹۴۶ء، ص:۸

۱۱۴۔ نصیر الدین، ہاشمی، ''قدیم دکھنی شاعری کے موضوعات''، مشمولہ، ''ساقی''، جلد ۲۵، نمبر ۳، ستمبر ۱۹۴۲ء، ص:۳۱

۱۱۵۔ محمود زیدی، سید، ''نئی زندگی اور نیا ادب''، مشمولہ، ''ساقی'' جلد ۲۶، نمبر ۳، ستمبر، ۱۹۴۲ء، ص:۵۱

۱۱۶۔ انور سدید، ڈاکٹر، ''پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ''، ابتداء تا ۱۹۸۸ء، اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، اشاعت اول جنوری ۱۹۹۲ء، ص:۱۰۰

۱۱۷۔ برکت علی، چوہدری، ''اغراض و مقاصد''، مشمولہ، ادب لطیف، جلد ۱، نمبر ۳، مئی ۱۹۳۵ء، ص:۴

۱۱۸۔ محمد صادق، قریشی، ''ننھی جمیلہ سے''، مشمولہ، ادب لطیف، جلد ۷، نمبر ۵، جولائی ۱۹۳۸ء، ص:۶۱

۱۱۹۔ محمد عبداللہ، قریشی، ''کاش رہنے کے لیے جنت کشمیر ملے''، مشمولہ، ''ادب لطیف''، جلد ۱، نمبر ۴، جون ۱۹۳۵ء، ص:۷

۱۲۰۔ برکت علی، چوہدری، ''اشارات''، مشمولہ، ''ادب لطیف''، جلد ۱، نمبر ۷، مارچ ۱۹۴۰ء، ص:۱

۱۲۱۔ جابر علی، سید، تحقیق و تنقید، ملتان، کاروان ادب، صدر، بار اول ۱۹۸۷ء، ص:۳۳

۱۲۲۔ شاکر علی، ''لہریں''، مشمولہ، ''ادب لطیف''، جلد ۱۰، نمبر ۱۰، جولائی ۱۹۴۰ء، ص:۳۵

۱۲۳۔ برکت علی، چوہدری، ''ادارہ''، مشمولہ، ''ادب لطیف'' جلد ۱۰، نمبر ۱، ستمبر ۱۹۴۰ء، ص:۱

۱۲۴۔ ساحر لدھیانوی، ''سوویٹ جرمن پر ایک نظر''، مشمولہ، ''ادب لطیف''، جلد ۱۳، شمارہ ۲، نومبر ۱۹۴۴ء، ص:۶

۱۲۵۔ احتشام حسین، سید، ''جدید اُردو ڈرامہ''، مشمولہ، ''ادب لطیف''، جلد ۲۴، شمارہ ۶، ۱، ۲، سالنامہ ۱۹۴۷ء، ص: ۲۳۰

باب پنجم

اُردو مضمون نگاری ۱۹۳۶ء تا ۱۹۴۷ء

اُردو مضمون نگاری ۱۹۳۶ء تا ۱۹۴۷ء

(جدید ادبی تحریکوں کے تناظر میں)

فکر و تدبر ہر ذی شعور کا حق ہے اور یہی فکر کسی فرد کی کسی نکتہ پر توجہ مرکوز کراتی ہے اور اس فکر کی اہمیت اس فرد کے لیے تو اہم ہوتی ہے لیکن معاشرے پر اسکا اثر نہیں ہوتا ہے۔ البتہ اس شخص سے متعلقہ افراد اس فکر سے کئی زاویے فکر بنا لیتے ہیں۔ اب یہ فکری زاویے منفی ہوں یا مثبت اس کا ذمہ دار وہ فرد نہیں ہوتا۔ جب یہی فکر معاشرے کے تخلیق کاروں کی تخلیقات میں جلوہ نما ہونے لگتی ہے تو رجحان بن جاتی ہے اور یوں یہ رجحان معاشرے کے وسیع طبقے کو اپنے زیر اثر کرتا ہے اور پھر یہی رجحان تحریک میں تبدیل ہو جاتا ہے اور اس طرح ایک تحریک جنم لیتی ہے۔ تحریک کے اپنے اُصول ہوتے ہیں جو اس تحریک کے تابع تخلیقات کے ذریعے تخلیق کاروں نے وضع کیے ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید ''اُردو ادب کی تحریکیں'' میں رجحان اور تحریک کے فرق کو یوں واضح کرتے ہیں:

> ''رجحان اور تحریک میں ایک فرق تو یہ ہے کہ رجحان زیادہ تر بے نام اور بے صورت ہوتا ہے۔ مگر تحریک ایک رفتار دریا کی طرح کسی خاص سمت میں رواں ہوتی ہے۔ پس رجحان جس تغیر کے لیے زمین ہموار کرتا ہے۔ تحریک اس کی تکمیل کے لیے جنگ لڑتی ہے اور بالآخر فتوحات کے ثمرات سمیٹنے کی کوشش ہوتی ہے۔''[۱]

ادب تخلیقی تجربے کے اظہار کا نام ہے تخلیق کار جب جذبہ اور فکر میں تخیل کی رنگ آمیزی کرتا ہے تو نظم و نثر وجود پاتے ہیں اور یوں وہ معاشرے کے نشیب و فراز کی عکاسی اپنی تحریروں کے ذریعے کرتا ہے۔ ادب اپنے دور کا عکاس ہوتا ہے۔ اس لیے اس میں تغیر لازمی امر ہے۔ ہر نیا دور نئی ادبی ساخت کو جنم دیتا ہے۔ ادب چونکہ انسان دوست ہے اس لیے ایسی تخلیقات جو انسان اور اُسکے مسائل پر روشنی ڈالتی ہیں۔ اعلیٰ ادب قرار پاتی ہیں۔ ادبی تحریکیں سیاسی، معاشی، اخلاقی، مذہبی و دینی، معاشرتی، سائنسی تغیرات اور حوادث زمانہ کی بنا وجود پذیر ہوتی ہیں۔ تحریک عہد سرسید کی مقصدیت اور افادی ادب کے برخلاف وجود میں آئی

اس میں پہلے کہ اُردو میں رومانوی ادب کا جائزہ لیا جائے۔

رومانویئت کے آغاز پر نظر ڈالتے ہیں۔ رومانویئت انگریزی لفظ رومانس سے نکلا ہے اوراپنے اپنے دورمیں مختلف ناقدین ادب نے اس کی تعریف کی ہے ڈاکٹر محمد خان اشرف نے اپنی کتاب ''اُردو تنقید کا رومانوی دبستان'' پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ ڈاکٹر محمد خان اشرف نے اس حوالے سے مس فرسٹ فریک کر موڈی انسائیکلوپیڈیا برٹینکا، ہولیمن، رابرٹ گلیلو، ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر محمد حسن، فیروز اللغات، کولرج، ورڈزورتھا، میر یوپراز، وکٹر ہیوگو، پروفیسر احتشام سید حسین، گریرسن، والٹرپیٹر، و دیگر قاموس و ناقدین کے حوالے سے رومانویئت کے حوالے سے بات کی ہے۔ مقالے کی طوالت کے خوف سے ہم ان پر بحث نہیں کریں گے۔ البتہ انگریزی ادب میں کی گئی تعریف پر روشنی ڈالیں گے۔

Peter-J-Kitson نے اپنے مضمون "English Literatures in Context" میں "The Romantic Period, 1780-1832" میں Romanticisim کے حوالے سے لکھا ہے۔

"Sensibility was an eighteenth. Century movement that stressed the importance of the emotions and feelings in human relationships. From around 1740s onwords a number of thinkers argued that humans possessed an innate moral sense of sensibility which manifested itself through the emotions in feelings of sympathy and benevolence for others. This movement has been linked to the rise of the middle classes in the eighteen century and thier growing concern with the reformation of manners."[۲]

شاعر اورنثر نگار رومانویئت کو ترغیب دیتے ہوئے عقل و مادیئت کی نفی کرتے ہیں۔اسی Arthur-compion- Rickett اپنی کتاب "A History of English Literature" میں Romanticism کے حوالے سے لکھتا ہے۔

"Romantisicm, generally speaking, is the expression in

terms of art of sharpened sensiblitlies, hightened imaginative feeling, and although we are concerned only with its expression in literature, Romanticism is an imaginative point of view that has influenced many art froms, and has left its has influenced many art forms, and has left its mark also on philosophy and history. The loose popular meaning attached to the word in dicates roughly its defects rather than its merits, for it is often used as synonymous of extravagances and sentimentality."۳

جبکہ Paul Davies نے اپنی کتاب "Romanticisim & Exoteric Tradition" میں رومانوی ادب کے حوالے سے اپنی رائے کا یوں اظہار کیا ہے:

"The Romantic sentiment, the counter-elightenment sentiment, is lost to view in materialism. Even the train metaphor, with which the philosopher chose to personify the late nineteeth century is earily appropriate to its cartesian mentality, and inimical to the romantic."۴

ڈاکٹر عبد الودو کی نظر میں رومانیت سے مراد یہ ہے:

"عمومی طور پر رومانیت تیز ادراک اور بلند تخیلی احساسات کو کہتے ہیں۔لطیف رمز کو رومانیت کی پہلی خصوصیت کہا جاتا ہے۔ رومانیت کی دوسری خصوصیت کثیر ذہنی تجسس ہے۔"۵

راقم کی فکر ونظر کے مطابق Romanticisim یعنی رومانیت سے مراد ایسے خیالات و احساسات ہیں جو سچے جذبے کے عکاس ہیں۔ یہ مترنم الفاظ میں لپٹی ہوئی وہ قوس وقزح ہوتی ہے جس کے اظہار میں تخیل کو نہ تو بے لگام چھوڑا جاسکتا ہے اورنہ ہی سپاٹ طرزِ بیان اپنایا جاسکتا ہے۔ رومان میں ہیجان اور سطحیت شامل ہو جائے تو وہ رومان نہیں رہتا صرف ہوا و ہوس رہ جاتی ہے لیکن اگر رومان سادگی و پرکاری پر

منفی ہو تو شاعری میں ولی، میر، غالب، اقبال، ناصر کاظمی اور فیض کا ظہور ہوتا ہے جبکہ مضمون نگاری میں شرر، یلدرم، عبد القادر، حسن نظامی، اقبال، خلقی دہلوی وغیرہ منظر عام پر آتے ہیں۔

رومانویئت مسرت، حظ، اطمینان اور سکون عطا کرتی ہے۔ منزل کی بنیاد بنتی ہے اور راہ نوردو کی راہوں کو قندیل برحق کی طرح جگمگاتی ہے۔ مثلاً رب العزۃ کا تصور اورخیال انسان کو پناہ، آسرا اورمسرت کا احساس بخشتا ہے۔ بعد میں مادیئت کا احساس اچھی بری تقدیر کے سوال و جواب میں اُلجھا دیتا ہے۔ سخت گرمی کے بعد بارش کی آمد غریب، امیر، بوڑھے، جوان کو یکساں فرحت، راحت اورخوشی وسکون عطا کرتی ہے بعد میں کیچڑ، سیلاب اورنقصان کی مادیئت حاوی ہوتی ہے۔ شدت کی بھوک سے روٹی انسانوں میں یکساں طمانیت کا احساس بیدار کرتی ہے بعد میں روٹی کے حصول کی تگ و دو، سوکھی و مرغن روٹی کا سوال ذہنی خلفشار سے دو چار کرتا ہے۔

بچے کی مسکراہٹ تھکن اُتار دیتی ہے اور پرورش و نگہداشت کا خیال بعد از شفقت ومحبت کے پریشان کرتا ہے۔ محبوب کا دیدار معشوق کو سرشار کرتا ہے تکلیف و مصائب کا تصور بعد از دیدار تکلیف دہ آلام سے دو چار کرتا ہے۔ حب الوطنی، وطن کی سلامتی وترقی کی ضامن پہلے ہوتی ہے تو بعد میں عیاری منافقت کے سانپوں سے نبرد آزما ہونے کی تراکیب وتدابیر پر غور وفکر کرتا ہے۔ ان تمام مثالوں سے یہ ثابت ہوا کہ اصل میں رومانیت خوشی، اطمینان، سرشاری ہے۔ حسین الفاظ کی رو پہلی مالا ہے لیکن توازن و اعتدال اور جذبے کی سادگی، بیان کی پرکاری ہی اصل رومان ہے اوراس سے پرے جو کچھ بھی ہے وہ یا تو مبالغہ ہے یا پھر سطحیت و ابتذال ہے۔ رومانوی مصنفین فطرت اور انسانی فطرت کا مطالعہ کرتے ہوئے اسلوب کی دلکشی، بیان کی چاشنی اور رمز کی حلاوت سے اپنے مضامین کو گل رنگ بناتے ہیں۔

رومانیت کا آغاز انقلاب فرانس سے ہوا فرانس میں روسو کی تحریریں رومانویئت کی ابتداء کرتی نظر آتی ہیں۔ اس نے حیات مستعار کے ہر شعبہ اور ہر نظامِ فکر کی انانیت کے خول توڑ کر تخیل، جذبے، فہم و فراست، نرم روی، ہمدردی، عوام دوستی کو اپنی تحریروں کے ذریعے فروغ دے کر رومانوی اندازِ فکر کا آغاز کیا۔ جرمنی اور فرانس میں رومانوی تحریک بارھویں، تیرھویں صدی کے درمیان شروع ہوئی اورمتحرک خوشیوں سے بھرپور پر مزاح مضامین تفریح طبع کے ساتھ ساتھ عوام کی اصلاح کا پہلو بھی اپنے دامن میں سموئے نظر آتے ہیں۔ برطانیہ میں رومانوی تحریک فرانس کے زیر اثر شروع ہوئی۔ یہاں ۱۷۸۰ تا ۱۸۳۲ تک رومانوی تحریک کا

اثرات رہے اوراس دور کے رسائل واخبارات میں مختلف ادباء وشعراء کے مضامین شائع ہوتے رہے۔ پھر ان تخلیق کاروں کے فن پاروں میں بھی رومانویت پر روشنی ڈالی گئی۔ان شعراء و ادباء میں کولرج، ورڈزورتھ، چارلس لیمب، ولیم ہنرلٹ، لی ہنٹ اورڈی کوئنسی وغیرہ اہم ہیں انسانی فطرت اوراسکی آزادی رائے رومانوی مصنفین کا مدعا رہا ہے۔ آزادی اظہار کے ساتھ ساتھ بکھیرے خیالات کی ترجمانی بھی رومانوی ادیبوں کے مزاج کا حصہ ہے۔

برطانیہ میں رومانوی تحریک کا آغاز ورڈزورتھ اور کولرج سے ہوا۔ اور"Lyrical Ballads" ۱۸۹۸ء میں منظرِ عام پر آتی اور ورڈزورتھ اور کولرج کی شاعری کے اس مشترکہ مجموعے سے رومانوی تحریک نے اپنی جڑیں برطانیہ میں مضبوط کی۔ اور اسی دور کے رسائل،London Magazine 1820، Edinburgh Black Wood 1817، Taits magazine و دیگر رسائل میں کولرج ورڈ زورتھ ولیم ہنرلٹ، چارلس لیمب، ڈی کوئنسی اور لی ہنٹ کے مضامین شائع ہوتے تھے۔

ولیم ہنرہٹ نے طنزیہ مضامین کافی تعداد میں لکھے۔ جبکہ معاشیات، تاریخ اور جمہوریئت پر بھی انہوں نے طبع آزمائی کی، اس کے علاوہ کولرج اور ورڈزورتھ ہرتنقید کا حق بھی ادا کیا۔ ولیم ہزلٹ نے بیٹھک(Table Talk) کی صورت میں اپنے موضوعات کے ذریعے معاشرے کو آئینہ دکھایا۔ ولیم ہزلٹ کے تنقیدی مضامین نے اپنے دوررس اثرات چھوڑے ہیں۔ جبکہ لی ہنٹ کے مضامین سیاسی نظامِ حکومت کی عکاسی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ان کے مضامین نے بھی رومانوی تحریک کو جلابخشی۔

چارلس لیمب نے خود پر چوٹ کر کے اپنے موضوعات کے ذریعے در پردہ معاشرے کی آئینہ دکھایا ہے۔ چارلس لیمب کے مضامین "Essay of Aelia" بہت اہم ہے۔جن میں اس کی یادیں سمٹی ہوئی ہیں۔ ذہانت و ذکاوت ان مضامین میں چھلکتی ہے۔انگلستان میں رومانوی مضمون نگاری کا بام عروج لیمب کا مرہونِ منت ہے۔لیمب کے ان مضامین نے فن اورفطرت کو ہم آہنگ کر کے مزاح کو رونق اور وسعت عطا کی ہے۔اس نے وجدان اورتخلیلات کا بھرپور مظاہرہ اپنے ان مضامین میں کرتے ہوئےGoethe کے اس رائے کی نفی کردی ہے:

"Romanticism is disease, Classicism is neith"

لیمب کا یہ تنقیدی کام جو مضامین کی صورت میں سامنے آتا ہے اس میں لیمب متکلمانہ لہجہ اختیار کر



کے موئثین کے اندازِ تخاطب کو جلا بخشتا ہے۔

ولیم ہنرلٹ کے مضامین رومانیت اور حقیقت کا امتزاج ہیں۔اس کے مضامین سیاسی و تنقیدی ہونے کے ساتھ ساتھ رومانیت سے بھرپور ہیں۔صداقت اور سچائی کے ساتھ وہ معاشرے کی ناہمواریوں کی بھی نشاندہی کرتے ہیں۔ کالرج سمیت دیگر احباب پر بھی ہنرلٹ نے کڑی تنقید کی ہے۔ ہنرلٹ کا اندازِ بیان بات چیت کا سااندا ز ہے۔ اس نے سیاسی، تنقیدی، معاشرتی ہر قسم کے مضامین تحریر کیے ہیں۔ انہوں نے اپنے لیکچروں میں جو انداز اختیار کیا وہ بھی انکی مضمون نگاری کے انداز کے قریب قریب ہے۔ بہ حیثیت نقاد اس نے غیر جانبداری سے کولرج و دیگر ادباء وشعراء پر بے لاگ تنقید کر کے ادب میں اپنا لوہا منوایا ہے۔ وہ زندگی کو خوشی مستور کر کے زندگی سے بھرپور لطف اندوز ہوتا تھا اور زندگی کے پر لطف ماحول کو گسٹیو کا نام دیا ہے۔ "On Gusto" کا آغاز کچھ اس طرح کرتا ہے:

"Gusto in art is power or passion defining any object. It is not so difficult to explain this trem in what relates to expression."[۶]

Thomas De-Quiency مضمون نگاری میں کالرج کا تتبع کرتا تھا اور اسکی نثر رومان انگیز چاشنی سے لبریز نظر آتی ہے۔Perter.J.Kitson نے "English literature in context" میں Dequiency کے حوالے سے لکھا ہے:۔

"Thomas De-Quiencey Probably the most accomplished prose stylist of period, was variously a journalist, eayist."[۷]

کولرج اورورڈ زورتھ پر اس نے کڑی تنقید کی ہے۔ اس کی کتاب "Reminiscenes of English Lake Poets" میں عمدہ تنقیدی نمونے ملتے ہیں۔

James Henry Ligh Hunt نے چھوٹی عمر سے ہی شاعری کرنا شروع کی اور تنقیدی مضامین بھی لکھے۔ اس کا اپنا مخصوص اندازِ بیان ہے۔ اس کے مضامین طنز و ظرافت پر مبنی مضامین ہیں۔ اس نے معاشرتی ثقافتی اور سیاسی مضامین لکھے ہیں۔

اقبال کی اقبال بلندی کے ہم جہت پہلو ہیں۔ اور ہمہ وقت دنیائے علم وفن کے ناقد و محقق اقبال

کی اقبال بلندی کے کھوج میں تصانیف اقبال کھنگالتے رہتے ہیں۔ یہ اٹل حقیقت ہے کہ اقبال کے نثری و شعری افکار کے ہر ہر گوشے پر مکرر نظر کرنے کے باوجود جب بھی اقبال کا مطالعہ کریں ۔ نئے سے نئے امکاناتِ تحقیق اُن کے نثری و شعری اوصاف میں کھلتے جاتے ہیں۔ سر عبد القادر کا مخزن رومانوی تحریک کا علمبردار رسالہ اوراقبال کے ابتدائی مضامین پر بھی رومانوی تحریک کا رنگ غالب ہے۔ یہ مضامین مخزن میں شائع ہوئے۔

اقبال کی نثری افکار میں احساس تفاخر کے ساتھ ساتھ عالمگیری آفاقیت بھی نظر آتی ہے۔ اقبال حسن ادا سے بھی واقف ہیں اورحسن معنی بھی ان کی علمی بصیرت کا کلی اثاثہ ہے اقبال کا پہلا مضمون جنوری ۱۹۰۲ء میں مخزن میں شائع ہوا۔ جذباتی لب و لہجہ اور تخیل کی پر کاری سے مزین یہ مضمون جہاں بچوں کی نفسیات کا بھرپور عکاس ہے وہاں مدلل نثر کا بھی ترجمان ہے:

> ”بچے کی توجہ صورتِ شے سے زیادہ رنگ شے کی طرف لگتی ہے۔ جن اشیاء کی رنگ شوخ ہو اس کا اُس کا دھیان زیادہ تر اُنہیں کی طرف رہتا ہے۔ کسی اعلیٰ درجے کا مصور کی بنائی ہوئی تصویر اس کے سامنے رکھ دو اگر اُس کا رنگ شوخ اور چمکیلا نہیں تو اُسے اس کی پروا بھی نہیں ہوگی بر خلاف اس کے اپنی چھوٹی سی کتاب کی رنگین تصویروں پر جان دیتا ہے۔ بول چال میں ملاحظہ کیجئے۔ لفظ سرخ، نیلا وغیرہ تو پہلے سیکھ جاتا ہے اور لفظ مربع، مکون وغیرہ کہیں بعد میں جا کر۔ اس سے یہ اُصول قائم ہوا کہ بچے کی ابتدائی سبق رنگین اشیاء کے متعلق ہونے چاہئیں۔“۸

نثری افکار جو مضامین کی صورت میں سامنے آتے ہیں ان میں داخلیت اور انفرادیت اکثر و بیشتر نمایاں ہوتی ہے۔ اس لیے ان مضامین کا لہجہ پر جوش اندازِ نثر سے لبریز ہوا کرتا ہے۔ اقبال کے مضامین کا لہجہ بھی تخیلاتی نظر آتا ہے۔ اورشوق و تجسس ان کی نثر میں بدرجہ اُتم موجود ہے۔ لیکن اس کے باوجود اقبال کے مضامین کی تخلیقی نوعیت مدلل اورمتوازن نثر پر محیط ہے۔ اقبال نے اپنے مضامین کے لیے جن موضوعات کا انتخاب کیا وہ معاشی، سماجی، دینی، اخلاقی ولسانی موضوعات ہیں۔ یہ ایسے موضوعات ہیں۔ جن پر بیسویں صدی کے آغاز میں قلم اُٹھانا بہت اہم اور ضروری تھا۔ اقبال کا مضمون ”قومی زندگی“ اکتوبر ۱۹۰۴ء میں ”مخزن“ میں شائع ہوا۔ اقبال نے یہ اہم موضوع چن کر اپنی سیاسی و سماجی بصیرت کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ اقبال کے اس مضمون نے سرسید احمد خاں کے مضمون ”اپنی مدد آپ“ کے لہجہ اورمتانت کی یاد دلادی ہے۔

لیکن علمیت اور استدلالیت کے باوجود اقبال کے اس مضمون کی نثر سرسید کے مضمون کی طرح خشک اور سپاٹ نہیں بلکہ ادبیت کی شان اس مضمون میں نظر آتی ہے۔ سرسید کی طرح اقبال بھی لکھتے ہیں:

> ''دُنیا میں کسی قوم کی اصلاح نہیں ہوسکتی جب تک کہ اس قوم کے افراد اپنی ذاتی اصلاح کی طرف توجہ نہ کریں، کیونکہ جیسا کہ میں نے ابھی کہا ہے فرد کے تمام افعال و حرکات ہیں، یہاں تک کہ اس کی زندگی بھی اس کی اپنی نہیں ہے بلکہ قوم کی ملکیت ہے۔ خودکشی کا اقدام کرنے والے کو سزا دینا ظلم ہے۔ مگر یہ سطحی خیال ہے۔ قانون نے اس بات کو اُصولاً تسلیم کرلیا ہے کہ فرد کی زندگی حقیقت میں قوم کی زندگی ہے اور خودکشی کرنے والا اپنی جان پر ظلم نہیں کرتا بلکہ حقیقت میں اس مدنی قوت کو معدوم کرنا چاہتا ہے جس کا وہ بحیثیت فردِ قوم ہونے کے ایک مظہر ہے۔''[۹]

''قومی زندگی'' کے ذریعے عوام الناس کا فکری تجزیہ کرنے کے ساتھ ساتھ اقبال عوام الناس کے عروج و زوال پر گہری نظر ڈالتے ہیں۔ لیکن یہ اقبال کے نثری مضامین لکھنے کی ابتدا ہے اس لیے اس میں بھی رومانویئت کا پرتو جابجا نظر آتا ہے۔ اسلوب کی چاشنی اور بیان کی روانی کے ساتھ ساتھ جذبے کی شدت اور تخیل کا احساس بھی ملتا ہے۔

مضامین اقبال کا تجزیہ کرتے ہوئے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ ان مضامین میں فرسودہ اور پرانے خیالات پر قطعی بنیاد نہیں رکھی گئی۔ اقبال کا دور جدید دور کے جدید افکار کی پیداوار ہے۔ جن میں مشرق و مغرب کی آمیزش کے ساتھ ساتھ اُمت مسلمہ کی پسپائی اور مستقبل کی منصوبہ بندی بھی نظر آتی ہے۔ سرسید کی عقلی نثر کے طوق نے معاشرتی، سیاسی، اخلاقی و دینی اُلجھنوں کو سلجھانے میں اہم کردار ادا کیا لیکن اسلوب کی روانی اور لطافت و شرینی سے اُردو زبان قدر نابلد ہوتی گئی۔ ایسے میں جدید دور کے جدید تقاضے فرانس سے انگلستان اور انگلستان سے برصغیر پاک وہند میں وارد ہوئے تو اسی جدیدیئت کو مغربی ذہن سے متاثر نوجوانوں نے قبول کیا؟ یوں اقبال بھی جدید دور کے جدید تقاضوں سے دور نہ رہ سکے۔ اور اُسلوب کی نیرنگی اُن کے ابتدائی مضامین کا حصہ بنتی گئی۔ لیکن اقبال کے مضامین کا اُسلوب کہیں بھی بے ربط اور بے ترتیب نظر نہیں آتا۔ اسلوب کو چاشنی اور علمی بصیرت نے اقبال کے مضامین کو فکری نثر کو اپنے دور کی ''نباض نثر'' قرار دے دیا۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار اقبال کے نثر کے حوالے سے اپنی رائے کا اظہار یوں کرتے ہیں:

> ''اقبال کے ابتدائی دور کے مضامین میں جذبات، افکار اور تاثرات کا کس قدر ہجوم

بھی ہے جو کچھ تو مخزن کی رومانی ادبی تحریک کے اثر سے ہے اور کچھ طبیعت کا وہ رنگ بھی اس میں جھلکتا ہے جو ایام شباب کی یاد دلاتا ہے۔ بانگ درا کے ابتدائی دور کی شاعری کو بھی اس کے ساتھ رکھ کر دیکھا جائے تو یہ بات پوری طرح واضح ہو جائے گی۔ اس زمانے کی ملکی وقومی حالات کے اثر سے جذباتی ہیجان کا پیدا ہونا قدرتی امر تھا۔ جو شاعری میں قدرے گہرا اور شوخ ہوگیا ہے لیکن نثر میں اپنی عقلی تربیت کی وجہ سے اقبال نے جذبے وفکر کی آمیزشیں سے میانہ روی اختیار کی ہے۔"[۱۰]

انسان کو اپنی زبان ہی میں اظہار کی آزادی فکر حاصل ہوتی ہے اسی لیے زبان اوراس کے موضوعات کسی بھی فردوقوم کے لیے اہم ہوتے ہیں۔ اقبال نے بھی اُردو زبان پر جو مضامین لکھے وہ علمی مباحث سے پر ہیں۔فکر وفن اور تلاش جستجو ان مضامین کامرکز ومحور ہے۔ اقبال کے ان مضامین کے ایک ایک لفظ میں ان کا خلوص پہناں ہے۔ انہوں نے اُردو زبان کے انقلابی کردار، تہذیب و تاریخ، تمدن و سیاست، معاشرت و ماحول، دین و دنیا اورنفسیات و سماجیات کے حوالے سے بھرپور روشنی ڈالی ہے۔"زبان اُردو" اور "اُردو زبان پنجاب میں" دو مضامین ہمیں نظر آتے ہیں۔"زبانِ اُردو" ڈاکٹر وانٹ برجنٹ کا ہے جیسے اقبال نے مخزن کے لیے ترجمہ کیا اوریہ ترجمہ حقیقت سے اس قدر قریب ہے کہ اقبال کی اپنی تخلیق ہی نظر آتا ہے اگر چہ اقبال اس میں کمی بیشی تو نہ کرسکے کیونکہ اُن کی اپنی تخلیق نہیں تھی لیکن اس کے ترجمہ میں اقبال کی علمی بصیرت اوراُردو زبان سے عقیدت نظر آتی ہے اوراُردو زبان کی اہمیت کا احساس جو اقبال کو تھا اُس کا عکس ملتا ہے۔" اقبال لکھتے ہیں:

"اس میں شک نہیں کہ بعض فارسی تصنعات کی تقلید سے اُسے نقصان پہنچا۔ تاہم یہ صحیح ہے کہ اُردو نثر نویسوں نے بالعموم ایسا طرزِ تحریر اختیار کیا جو وقت کے تقاضے سے خودبخود پیدا ہوئی اور جو بناوٹ سے آزاد ہونے کی وجہ سے عوام کے فہم اور سمجھ کے عین مطابق ہے۔"[۱۱]

علامہ اقبال کا دوسرا مضمون "اُردو زبان پنجاب میں" ہے جس میں اقبال اور اُن کے اشعار پر جو اعتراض کیے گئے اس کے جواب میں لکھا گیا لیکن اقبال نے اس مضمون میں اُردو زبان کے مزاج وارتقا اور اہمیت وضرورت پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ لسانی مزاج کا حامل یہ مضمون اپنے دور میں اُردو کے تحفظ پر ایک اہم مضمون ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی اس مضمون کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"موضوع کے اعتبار سے علامہ کا یہ مضمون بھی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اس سے اُردو زبان کے متعلق ان کے خیالات اور زبان و بیان پر ان کی گرفت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اُردو زبان کے متعلق علامہ اقبال کے خیالات بہت واضح ہیں وہ اس زبان سے محبت کرتے تھے اور اس کو مسلمانوں کی زبان سمجھتے تھے۔ اسلامیان ہند کی تہذیب و ثقافت کی بنیاد۔ ان کے خیال میں اسی زبان پر قائم تھی، وہ اس زبان کو مسلمانوں کی قومی وملی بقا کے لیے ناگریز سمجھتے تھے۔"[۱۲]

مضامینِ اقبال کا تجزیہ کریں تو اقبال کے ان مضامین سے اقبال کے ذوقِ سلیم کا پتہ چلتا ہے اور اقبال کے مضامین قاری کو متاثر بھی کرتے ہیں۔ اور زندگی کا لائحہ عمل تیار کرنے پر آمادہ بھی کرتے ہیں اقبال ان فلسفیوں اور عالموں کی طرح بات نہیں کرتے جو علمی دھاک جمانے کے لیے لفظوں سے کھیلتے ہیں بلکہ ایک باصلاحیت نوجوان کی طرح زندہ نثر لکھتے ہیں ایسی نثر جس کے لفظ چغلی نہیں کھاتے بلکہ پڑھنے والے کو شعور حیات کا درس دیتے ہیں۔ "دیباچہ پیام مشرق" میں اقبال کا فکریہ لہجہ ملاحظہ ہو۔ یہ لہجہ متانت کے ساتھ ساتھ "ہشاش بشاش" نثر کا بھی ترجمان ہے:

"مشرق اور بالخصوص اسلامی مشرق نے صدیوں کی مسلسل نیند کے بعد آنکھ کھولی ہے۔ مگر اقدام مشرق کو یہ محسوس کرلینا چاہیے کہ زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کرسکتی جب تک کہ پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو اور کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کرسکتی جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو۔ فطرت کا یہ اٹل قانون جس کو قرآن نے **ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیر وا ما بانفسھم** اور بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے۔ زندگی کے فردی اور اجتماعی دونوں پہلوؤں پر حاوی ہے اور میں نے اپنی فارسی تصنیفات میں اسی صداقت کو مدنظر رکھنے کی کوشش کی ہے۔"[۱۳]

اقبال کی سیاسی بصیرت اور سیاسی تدبر اُن کے مضامین میں کسی حد تک نمایاں ہے۔ اقبال فہم و ادراک کے مالک تھے اس لیے برصغیر پاک و ہند کے ماضی، حال، مستقبل کی سیاست پر گہری نظر لکھتے تھے وہ سیاسی ماحول کے حوالے سے پیش گوئیاں بھی کرتے تھے لیکن ان کے سیاسی مضامین اس بات کے عکاس بھی ہیں کہ اقبال سیاست پر بحیثیت مسلمان قرآن و سنت کو ترجیح دیتے ہیں یہ اقبال کی دانشوری اور سیاسی گہرائی کا بین ثبوت ہے۔ پروفیسر مظفر مرزا اپنے مضمون "Allama Iqbal As a versatile



"politician" میں لکھتے ہیں:

"Allama Iqbal was a Muslim first and politication after ward he took keen interest in matters of honour, prestige and welfare of the Muslims of sub-continent."[۱۴]

''حکمرانی کا خداداد حق'' اقبال کے انگریزی مضمون کا ترجمہ ہے جو پروفیسر ابو بکر صدیقی نے ترجمہ کیا۔اس میں اقبال لکھتے ہیں:

''اسلام کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دولت بھی نہ تھی کہ اس کا لالچ دے کر لوگوں کو اپنا معتقد بنانے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو غریب آدمی تھے جنہیں بعض اوقات کئی کئی دن فاقہ کشی کرنا پڑتی تھی۔عرب کے حکمران بننے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پشت پر کھجور کے پتوں کے نشانات پڑے جاتے تھے۔ایک بے کس اورمظلوم انسان سے ترقی کرتے کرتے آپ صلی اللہ علیہ وسلم جزیرہ نمائے عرب کے حکمران بن گئے پھر بھی نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پولیس کی حاجت ہوئی نہ جیل کی۔ دراصل یہی وہ حکمران تھے جن کی بابت بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی فوق الفطرت حق کی بنا پر حکومت کی۔اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عام بادشاہوں کا سا اقتدار قائم کرنے والا کوئی ایک طریقہ بھی استعمال نہ کیا نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سلطنت کے تحفظ کے خاطر کوئی مستقل فوج تھی نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذاتی حفاظتی دستہ تھا۔ نہ کوئی خزانہ تھا نہ پولیس تھی نہ جیل.....ایسی کوئی چیز بھی تو نہ تھی۔''[۱۵]

''حکمرانی کا خدا دادحق'' اوردیگر سیاسی مضامین قرآن وسنت کی علمی توقیر کے مطابق لکھے گئے۔

اقبال نے لفظوں کی حسن کاری، اسلوب کی ندرت اور تازگی، خوش آہنگی اورفرحت وتازگی سے اپنے مضامین کو وہ جمالیاتی رنگ و آہنگ دیا ہے جس میں ان مضامین کی نثر میں اُکتاہٹ اور خشک پن کا شائبہ تک نہیں۔اقبال کے مضامین میں جو علمی اصطلاحات ملتی ہیں وہ اقبال کی علمی استعداد کا اہم ثبوت ہیں۔

پروفیسر لیاقت علی چوہدری اقبال کی نثر کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''وہ ہر طرح کی نثر لکھانے کے قادر تھے۔ان کی قدرت زبان میں کلام نہیں وہ دقیق علمی اور فلسفیانہ مسائل کے لیے علمی اور حکیمانہ نثر بھی لکھ سکتے تھے۔علامہ نے ''مخزن'' کی تحریک سے متاثر ہو کر بھی نثر لکھی ہے مگر تعقل کو ہاتھ سے جانے

نہیں دیا۔ جذبے اور فکر کی آمیزش کے ساتھ ساتھ وہ ہر جگہ اعتدال کا دامن تھامے رکھتے ہیں۔ تخیل کو کہیں بھی وہ بے لگام نہیں ہونے دیتے۔"[۱۶]

اقبال کی دور رس نگاہوں نے معاشرے کی اجتماعی شعور کو جانچ پرکھ کر اپنی قوتِ تخلیق سے بھرپور استفادہ کرتے ہوئے ان مضامین کی بنیاد تہذیب و تمدن، اسلامی نظریات و حقائق، انسان دوستی، مشرق و مغرب کے تضادات، بلندی فکر، سیاسی تحقیق و تلاش پر رکھتی لیکن اقبال کی پیکر آفرینی، ربط و تنظیم اور جمالی ذوق نے ان مضامین کی نثر کو "زندہ نثر" بنادیا۔ ان مضامین کی نثر جمود و تعطل کا شکار نہیں ہے بلکہ اقبال کی یہ نثر متحرک اور فعال ہے۔ اقبال کا مضمون "اسلام اور تصوف" کی نثر منطقی، متحرک، متوازن ہونے کے ساتھ ساتھ جمالیاتی ذوق آہنگ کیے ہوئے ہے۔ نثر پارہ ملاحظہ ہو:

"واقع رہے کہ اسلام کا آفتاب تاریخ کے روز روشن میں اُفق پر جلوہ گر ہوا ہے۔ ہمارے جمہوریت پروری پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے عاقل و دانش مند اصحابؓ میں زندگی بسر کی اور انہی میں کام کرتے رہے۔ ان اصحابؓ نے ایک ایک لفظ آنے والی نسلوں تک پہنچا دیا جو اس پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس و بابرکت زبان سے جاری ہوا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات میں کوئی بھی چیز نہیں جسے مخفی کہا جاسکے قرآن مجید کا ایک ایک لفظ زندگی کی حسرت اور روشنی سے لبریز ہے۔ یہ تاریک اور قنوطیت افزاء تصوف کے لیے وجہ جواز مہیا کرنے ہی سے پاک و مبرا نہیں بلکہ تمام مذہبی تعلیمات کے خلاف کھلا ہوا جارحانہ اقدام ہے۔ جنھوں نے صدیوں تک عالمِ انسانیت کو مبتلائے فریب رکھا۔"[۱۷]

اقبال کے خیالات یہاں کس قدر بصیرت افروز اور فکر انگیز ملتے ہیں۔ مختصر یہ کہ اقبال کی نثر معاشرتی و علمی متانت اور سیاسی وقار کے ساتھ ساتھ اسلوب کی ندرت بھی اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ Syed Mahbub Murshid (late) اپنے مضمون "The pebbled Shore" میں لکھتے ہیں:

"He belives that the development of the individual presupposes a society and in that faith he finds the ideals society of his vision in the prophets (peace be upon him) conception of Islam"[۱۸]

اُردو ادب میں رومانوی تحریک کا آغاز سرسید کی اصلاحی تحریک کے پس منظر میں اُبھرا جس کی ابتدا



محمد حسین آزاد اور شبلی نعمانی کی رومانوی نثر سے ہوئی۔ ہندوستان پر انگریزوں کا غاصبانہ قبضہ تھا۔ انگریزوں کے تسلط کے خلاف لکھنے والوں نے ماضی کی عظیم الشان روایات کو جب مسلمانوں کے سامنے پیش کیا تو ادب میں جوش، شدت، جذبات، تخیلاتی فکر اور رومانوی اندازِ تحریر نے جنم لیا۔ رومانوی تحریک یورپ سفر کرتی ہوئی ہندوستان پہنچی تو یہاں کے پڑھے لکھے نوجوانوں نے اُردو نثر کو رومانویئت سے مزین کیا۔ اُن کے مضامین کا مطالعہ کریں تو ان مضامین میں لہجہ کی نرماہٹ، لفظوں کی غنائیت و آہنگ، ادب لطیف کا حسن اوراسلوب بیان کا دھیماپن نظر آتا ہے۔ انسانی جذبات و احساسات کو رومانوی نثر نگاروں نے مقصدی ادب پر ترجیح دی اور یوں داخلی انتشار اورداخلی سرشاری رومانویئت کا مرکز بنی۔ انسان اور اس سے متعلق انفرادی جذبات کو اہمیت دی گئی یوں اسلوب کی مرصع سازی اس اظہار کا مرکز بنی۔ اُردو نثر میں عبد الحلیم شرر، ابو الکلام آزاد، سجاد حیدر یلدرم، خلیقی دہلوی، فلک پیما، سرعبد القادر، حجاب امتیاز علی، سید عابد علی عابد اہم رومانوی نثر نگار ہیں۔

اُردو میں رومانوی تنقید کے علمبرداروں میں سرعبد القادر، مہدی افادی، عبد الرحمٰن بجنوری، سجاد انصاری، نیاز فتح پوری، صلاح الدین احمد، مجنوں گورکھپوری، گورکھپوری، عبدالماجد دریا آبادی اور فیض احمد فیض شامل ہیں۔

محمد حسین آزاد مصور، نقاش تمثیل نگار ہیں۔ جو رومانوی تنقید اورنثر نگاری کے سرخیل ہیں۔ آزاد نے جو مضامین لکھے اورلیکچر دیئے وہ انجمن پنجاب کے رسالے شائع ہوئے۔ آزاد اورانجمن پنجاب کے رسالوں کے کردار پر ہم پہلے ہی تفصیلی روشنی ڈال چکے ہیں۔ ہاں آزاد کی جدید اُردو تنقید کی بانی کی حیثیت سے بحث ہوگی۔ آزاد کے دور میں جہاں زندگی کے تقاضے تبدیل ہو رہے تھے وہیں اُردو شعر و ادب بھی جدید تقاضوں سے ہم آہنگ ہو رہا تھا۔ مولانا حالی، آزاد، شبلی بھی سرسید کے ساتھ جدید تقاضوں کو لبیک کہنے والوں میں شامل ہوئے۔ آزاد نے جدید تنقید کے اُصول وضع کیے۔ آزاد ایسے رومانوی نقاد ہیں جو کلام میں پوشیدہ حسن کے تمام لوازمات کو جاننا چاہتے ہیں کہ حسن کس طرح اثر کرتا ہے۔ جمالیاتی تنقید کا دارومدار ذوق، وجدان اورجمالیاتی حسن پر موقوف ہے اورنثر میں کس طرح شاعرانہ گفتگو کرتے ہیں۔ سید عابد علی عابد کے بقول۔

؎ لفظ ہوگا جو غزل میں عابد

وہ انگوٹھی میں نگینہ ہو گا

''درباب نظم اور کلام موزوں'' میں آزاد کے جدید ذہن کے جدید تنقید کا نثر پارہ ملاحظہ ہو:

''شعر گلزار فصاحت کا پھول ہے۔ گلہائے الفاظ کی خوشبو ہے، روشنی عبارت کا پرتو ہے۔ علم کا عطر ہے۔ قوائے روحانی کا جوہر ---- تاثیر معنوی کا سست ہے۔ روح کے لیے آبحیات ہے۔ گردِ غم کو دل سے دھوتا ہے۔ دل بڑھاتا ہے۔ طبیعت کو پھیلاتا ہے۔ خیال کو عروج دیتا ہے۔ دل کو استغنا اور بے نیازی، ذہن کو قوت (پرواز دیتا ہے۔) گردِ افکار سے دامنِ دل کو بلند رکھتا ہے۔ تنہائی میں دل لگی پیدا کرتا ہے---- اگرچہ شاعر ہمیشہ فکر و تردود میں غرق رہتا ہے لیکن ایک شعر کہکر جیسی اوس کے دل کو فرحت حاصل ہوتی ہے۔ بادشاہ کو تسخیر ہفت سے کشور سے نہیں ہوتی۔''[۱۹]

آزاد نے شعر و ادب، تاریخ و جغرافیہ، تعلیم و تربیت تہذیب و ثقافت ہی نہیں بلکہ ہر موضوع پر قلم اُٹھایا لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ مغرب کے اثر نے آزاد کے جدید ذہن کو جدید نثر کا پیش رو بنا دیا۔ وہ اپنے تخیل آمیز رومانوی نثر کے خود ہی موجد تھے۔ ڈاکٹر محمد اشرف خاں اپنے لیکچر میں جو انہوں نے جی سی یونیورسٹی لاہور میں منعقدہ ''مولانا محمد حسین آزاد سیمینار'' میں پڑھا۔ اس میں آزاد کو جدید تنقید کا بانی قرار دیتے ہوئے ان کے مضمون ''نظم اور کلام موزوں کے باب میں خیالات'' کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''حقیقت یہ ہے کہ آزاد کے اس مضمون اور لیکچر کے جائزے کے بغیر اُردو تنقید کے نظریات ارتقاء کا کوئی جائزہ اور مطالعہ مکمل نہیں ہوسکتا کیونکہ جن خیالات کا اظہار انہوں نے ان میں کیا ہے وہ اُصول تنقید اور شاعری کی نوعیت و مائیت اور شعری تخلیق کے بنیادی مباحث سے متعلق ہیں۔''[۲۰]

آزاد کی ''آب حیات'' باقاعدہ تنقید کا پہلا عکس ہے۔ جو معتبر ذرائع نہ ہونے کے باوجود جدید تنقید کے اُصولوں کے تحت لکھی گئی۔ یہ کتاب تاثراتی تنقید کی بہترین مثال ہے۔ آزاد کی مینا کاری اور خیال آفرینی نے اُن کی تنقیدی زبان میں لطافت پیدا کردی۔ آزاد مصور ہیں۔ مترجم ہیں۔ نقاد ہیں تمثیل نگار ہیں۔ زباندانی کے جوہر آزاد پر ختم ہیں۔ بے مثل نثر کے بے مثل موجد بھی ہیں۔ اور مجتہد بھی۔ اسی لیے تنقید کے سوتے ان ہی کی تحریوں سے پھوٹتے ہیں۔ وہ پہلے رومانوی نثر نگار ہیں۔ ''نیرنگ خیال'' اور مقالاتِ آزاد کا کوئی بھی گوشہ اُٹھا کے دیکھ لیجئے۔ آزاد کے ذہن کی جمالیاتی کیفیت اور مسحور کن جملے قاری کو لطف و سرور بھی عطا کرتے ہیں اور اس کے سحر زدہ ماحول کا تانا بانا بھی بُن دیتے ہیں۔ دلکش طرزِ ادا اور انشا پردازی کا بانکپن

آزاد کی اُردو ادب میں جداگانہ اور منفرد مقام عطا کرتا ہے۔ الفاظ کا زیر و بم اور شور و زور آزاد کے ہاں عبارت کو موثر اور حسین ترین بنا دیتا ہے۔ آزاد کی مرصع سازی کا بھرپور رنگ ان کی کتاب ''نیرنگ خیال'' میں نظر آتا ہے۔ تمثیل نگاری کا یہ رنگ اُن کے مضمون ''شہرت عام بقائے دوام کا دربار'' میں خوب سے خوب تر نظر آتا ہے۔ ''نیرنگ خیال'' کے مضامین طبع زاد نہیں۔ مغرب کے شعر و ادب سے تعلق رکھنے والوں کے مترجم ہیں۔ ''شہرت عام اور بقائے دوام کا دربار''۔ Addison کے مضمون "The vision of the table of fame" سے ماخوذ یا ترجمہ ہے۔ لیکن ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار ''نیرنگ خیال'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

> ''حصہ اول کے آخری مضمون ''شہرتِ عام بقائے دوام کا دربار'' کا ابتدائی حصہ ایڈیسن کے ایک مضمون سے ماخوذ ہے، باقی آزاد کے اپنے ذہن کی تخلیق ہے اور پیشکش کے اعتبار سے اسے ''نیرنگ خیال'' کا شاہکار کیا جاسکتا ہے۔''[۲۱]

''شہرت عام بقائے دوام کا دربار'' کا ہر ہر لفظ اور ہر ہر خیال تشبیہ و استعارے اور اُردو فارسی تراکیب سے مزین ہے۔ اس کے واقعات و خیالات کے بیان میں تخیلات کا عمل دخل بہت گہرا ملتا ہے:

> ''جرات کو اگرچہ کوئی خاطر میں نہیں لاتا تھا، مگر وہ میٹھی آواز سے ایک تان اُڑاتا تھا تو سب کے سر ہل جاتے تھے۔ ناسخ کی گل کاری چشم آشنا معلوم ہوتی تھی اور اکثر جگہ قلم کاری اس کی عینک محتاج تھی مگر آتش کی آتش زبانی اُسے جلائے بغیر نہ چھوڑتی تھی۔ مومن کم سخن تھے مگر جب کچھ کہتے تھے جرات کی طرف دیکھتے جاتے تھے۔''[۲۲]

لانجائنس نے کہا تھا

> ''حسین الفاظ خیال کے لیے روشنی کا کام دیتے ہیں۔''[۲۳]

جبکہ والٹر پیٹر لکھتا ہے۔

> ''ناقد کی حیثیت سے پیٹر جس چیز کا متلاشی ہے وہ فن کار کا تخلیقی جوہر ہے جو اس کی پوری اظہار کرتا ہے اور اُسے زندگی کی تمام چیزوں سے ممیز کرتا ہے۔ فن کار کا یہ جوہر اُس کے خیالات اور اس کے اسالیب میں ظاہر ہوتا ہے۔ پیٹر کے نزدیک خیالات اور اسالیب دو چیزیں نہیں ہیں۔''[۲۴]

آزاد ماہر انشا پرداز ہیں۔ ان کے نثر پارے کلام و معنی کے لحاظ سے فصیح و بلیغ ہیں۔ اُن کے مضامین پڑھتے وقت قاری بھی مضمون میں رواں جذبات و کیفیات کی فضا میں کھو جاتا ہے۔ آزاد کے ہاں زبان کے حسین مرقع نظر آتے ہیں اور زبان کو حقیقی، زمینی استعارات و تشبیہات سے مرصع کر کے مسائل

زندگی، حقائق زمانہ کو آزاد اس طرح پیش کرتے ہیں کہ ایک طرف تو رومانوی فضا بن جاتی ہے تو دوسری طرف ہر خاص و عام نہ صرف اس رومانوی فضا سے لطف اندوز ہوتا ہے بلکہ زندگی کے نشیب و فراز سے آشنا ہو کر حقائق کے آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کے لیے کمربستہ بھی ہو جاتا ہے۔

جدید تنقید کے اظہار کے لیے آزاد نے جو عملی قدم اُٹھایا اس پر مستقبل قریب میں تنقید کے کئی رنگ شعر و ادب میں نمایاں ہوئے۔ ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ آزاد جدید تنقید کے سرخیل و بانی ہیں۔

عبد الحلیم شرر رومانوی نثر کے اہم رُکن ہیں۔ اُنہوں نے ۱۸۸۷ء میں ''دلگداز'' رسالہ نکالا۔ شرر نے ''دلگداز'' کے مضامین ہیں رومانوی اسلوب استعمال کیا۔ اعلیٰ تخیل اور پرجوش نثر شرر کے مضامین کا خاصہ تھی لیکن شدت جذبات اور ہیجان انگیز نثر بھی شرر کے مضامین میں نظر آتی ہے۔ ان کے مضامین کی کئی جلدیں ''مضامین شرر'' کے نام سے منظر عام پر آئی ہیں۔ شرر دلگداز کے آغاز پر لکھتے ہیں:

> ''وہ وقت بھی کس قیامت کا وقت ہوتا ہے جب بیتاب دل پر کچھ اثر پڑ جاتا ہے۔ وہاں اتنا ہے کہ اس کے لیے ذرا دل بھی نرم چاہیے مگر ہم تو جانتے ہیں کہ چاہے کیسا ہی سخت سے سخت دل ہو اثر کرنے والے جملے بیتاب ہی کر دیتے ہیں۔ نازو انداز نے تغافل شعاری کے بڑے بڑے سامان کیے لیکن ہجرانِ نصیب کی آہ وزاری کی جگر خراش صدائیں سن کر سنگدلوں سے ضبط نہ ہو سکا۔ کشش محبت بیرخی کرنے والوں کو اپنی طرف متوجہ کر ہی لیتی ہیں۔''[۲۵]

رسالہ ''دلگداز'' ادب لطیف کا عکاس تھا۔ شرر نے اپنے مضامین میں اپنی حیات مستعار کے پرت بھی کھولے ہیں تو اُسی کے ساتھ اس دور کی سیاسی سماجی، اخلاقی، معاشرتی زوال کی داستان بھی رقم کی۔ مثلاً اپنے مضمون ''خود نمائی'' جو ایڈیسن کے مضمون کا ترجمہ میں لکھتے ہیں۔

> ''کسی حیرت کی بات ہے کہ جو شخص اپنی ساری کمزوریوں اور ناقابلیتوں کو جانتا ہو وہ شہرت و ناموری کی ہوس کرے! اور یہ ہوس اُسے اس قدر اندھا کر دے کہ اپنی برائی، نالائقی جہالت اور اپنے سارے عیبوں کو بھی وہ تعریف کے قابل سمجھنے لگے اور کوشش کرے کہ جہاں تک بنے اُنہیں کے ذریعے سے شہرت اور غور حاصل کروں اور اپنی تعریف کے قصیدے سنتا رہوں۔''[۲۶]

لیکن ساتھ ہی شرر اپنے مضمون ''اُمید'' میں مسلمانوں کو مایوسی کے اندھیروں میں گم رہنے کی جگہ اُمید کا پیغام شاعرانہ و تخیلانہ نثر میں دے کر حزن و ملال سے بھرپور رنجیدہ دلوں کو اُمید دیاس کے ساتھ

ساتھ حظ و مسرت سے ہمکنار کرتے ہیں۔ یوں ان کی تحریر پڑھوں انسانوں کو راحت و سکون، خوشی و سرشاری عطا کرتی ہے۔ نثر کا حسن شرر کی نثر کو مغربی رومانوی تحریک سے قریب ترین کردیتا ہے۔ اُمید کا پیغام شرر یوں دیتے ہیں:

> "اے باوفا معشوق اُمید! وہ تیرے ہی حسن کی شعاعیں ہیں جو اُن گورے گورے چہروں سے چمکتی ہیں جن پر ہم دل و جان سے عاشق ہو جاتے ہیں۔ یہ وہ تیرے ہی دلربا انداز و ناز ہیں جو پری رخوں کے حرکات و سکنات سے ظاہر ہو کر ہمارے بیقرار دلوں کو اپنا والہ و شیدا بنالیا کرتے ہیں۔"[۲۷]

تاریخی مضامین میں بھی شرر دلچسپی رکھتے تھے اسی لیے اُن کے تاریخی مضامین دلگداز میں شائع ہوتے رہے جو بعد میں کتابی صورت میں منظر عام پر آئے۔ شرر "دلگداز" میں مضامین کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> "دلگداز" میں تاریخی مضامین کسی قدر بڑھا جائے کیونکہ ملک و قوم میں بھی یہ فرق بڑھتا جاتا ہے۔ شاید مناسب ہوگا کہ اُن کے خیالی مضامین کا سلسلہ ایک اعتدال کے ساتھ کم کر دیا جائے جن کو دلگداز کے ساتھ سب کچھ خصوصیت رہی ہے۔"[۲۸]

شرر کا داخلی اور جذباتی تعلق ان مضامین کے موضوعات کا ہمسفر رہتا ہے اس لیے اُن کی تحریریں ان کی روح کی پکار نظر آتی ہے۔ ایسی روح جو اپنے معاشرے کا نوحہ بھی کرتی ہے اور اپنے جذبات کی بھرپور اور صادق اظہار بھی کرتی ہے۔ اس لیے رنگینی اور شرینی کے ساتھ ساتھ اُن کے مضامین کے اسلوب میں ایک کسک اور ایک درد کا بھی "خالص رنگ" جھلکتا ہے۔ یہی رنگ شرر کے مضامین کو رومان پرور مضامین کی صف میں لاکھڑا کردیتا ہے۔ رومانویت لطف و سرور کے احساس سے روح کو سرشار کرتی ہے۔ اس لیے مبالغہ بھی اکثر و بیشتر رومانوی نثر میں شامل ہو جاتا ہے اور یوں رومانوی نثر میں حسن کاری، شوخی، زباندانی تخیلاتی فضا نظر آتی ہے۔ شرر بھی اپنی تحریروں میں "ادب برائے ادب" کے قائل نظر آتے ہیں۔ انہوں نے اپنے مضامین میں مسلمانوں کے حسین اور دلچسپ مرقع پیش کر کے مسلمانوں کی سیاسی، اخلاقی و معاشرتی اور معاشی کوتاہیوں کی عکاسی کی ہے۔ ڈاکٹر محمد عالم خاں اپنی کتاب "اُردو افسانے میں رومانی رجحانات" میں لکھتے ہیں:

> "شرر کے تخیلی مضامین میں اصلاح پسندی کے علاوہ شگفتگی اور رومانیت کے عناصر دیکھے جاسکتے ہیں ان کے ہاں مغربیت کا اثر بہت زیادہ ہے---- ان کے ہاں طرز تحریر کی دلکشی اور رنگینی شعریت سے بھرپور نثر ان کے رومانی طرز اظہار کا منہ بولتا

ثبوت ہے۔ اگرچہ انہوں نے حسن فطرت کی منظر کشی شاعرانہ انداز میں کی۔ لیکن
اس کے ساتھ ساتھ ان کے مضامین میں "فکر" بھی پائی جاتی ہے۔"۲۹

ابو الکلام آزاد بھی رومانوی نثر نگار ہیں۔ جوش، لفریبی اور رنگینی اُن کی نثر کا خاصہ ہے۔ پرشکوہ الفاظ اور گھن گرج لہجہ اُن کی نثر کو خطابت سے ہمکنار کرتا ہے۔ احساسِ تفاخر ابو الکلام آزاد کا طرہ امتیاز ہے اُنہوں نے ذوق وجدان اور رومانیت کے پرتو میں حسن الفاظ اور حسن خیال کو اس طرح جگمگایا کہ اُن کی نثر میں لطف و سرور پنہاں نظر آتا ہے۔ طلسماتی تخیل اُن کی نثر کو خشک اور سپاٹ نہیں ہونے دیتا۔ اُن کے مضامین میں علم و اجتہاد اور فلسفہ و حکمت موجود ہے۔ اُن کی زبان کی چاشنی اور تلاطم جذبات نے اُن کی نثر کو نیا اسلوب اور نیا آہنگ عطا کیا ہے۔ وہ اپنے طرز کے خود ہی موجد ہیں۔

ابو الکلام آزاد کے مضامین کے مجموعے "مضامین آزاد" انتخابات الہلال اور "تصریحات آزاد" ہیں۔

ابو الکلام آزاد انقلابی قلب و ذہن کے مالک تھے انہوں نے اپنے اکثر مضامین کی بنیاد قرآن و سنت پر رکھی۔ وہ جانتے تھے کہ مسلمانوں کو پستی اور کم ہمتی سے نکالنے کے لیے نہ صرف جوش و آہنگ اور انقلابی نثر کی ضرورت ہے۔ بلکہ اُن کے قلب و ذہن کو تبدیل کرنے کے لیے دین اسلام سے رہنمائی بھی لینی بہت ضروری ہے۔ دین سے دوری کی وجہ سے مسلمان معاشی، معاشرتی، سیاسی و اخلاقی زوال کا شکار تھے۔ ایسے مسلمانوں کے لیے ابو الکلام آزاد کے مضامین علم و حکمت کے گہر نایاب ثابت ہوئے۔ ابو الکلام آزاد "مسلمانوں کی آئندہ شاہراہِ مقصود کیا ہونی چاہیے" میں لکھتے ہیں:

"جو قوم خدا سے اپنا رشتہ کاٹ دیتی ہے اور اس کے فرمان و احکام سے روگردانی کرتی ہے۔ اُس نے اعمال نورِ الٰہی سے خالی ہو جاتے ہیں۔ اس پر ضلالت و گمراہی کا ایک شیطان مسلط ہو جاتا ہے اور وہ اس کو اپنا مرکب بنا کر اس کے گلے میں اپنی اطاعت کی زنجیر میں ڈال دیتا ہے۔"۳۰

مولانا ابو الکلام آزاد کے مضامین کا وصف وہ جوہر قابل ہے جو ابو الکلام آزاد کی پر جوش طبیعت اور اُن کے جذباتی تلاطم کا عکاس ہے۔ وہ مسلمان قوم کی تنزلی پر مضطرب و بے چین ہو کر ایسی قلم شگاف نثر لکھتے ہیں جو رومانویت کے حسن سے بھی مالا مال ہے اور فکری تدبر بھی رکھتی ہے علمیت اور ادبیت کا حسین امتزاج ابو الکلام آزاد کی نثر میں ملتا ہے۔ "الہلال" اور "البلاغ" کے مضامین کی علمی و ادبی شان ابو الکلام آزاد کے سیاسی و انقلابی صداقتوں سے کمتر نہیں ہے۔ ڈاکٹر محمد حسین "اُردو میں رومانوی ادب" میں لکھتے ہیں:

"ابو الکلام آزاد کی نثر کا ایک تاریخی اثر ہوا، اُنہوں نے ہمارے نوجوان ایشیائی ذہنوں پر انفرادیت کے تازیانے مارے ہیں اور پستی اورمحرومی، ذلت اورکم ہمتی کا وہ احساس دلایا ہے جوتبدیلی کی شدید خواہش اور خال سے بے پناہ نفرت کی شکل میں ظہور پذیر ہوا۔اُن کی نثر نے اُردو ادب کوایک نیا اعتماد بخشا ہے اوراس اعتماد نے خود سے اورکائنات کے حسن سے محبت کرنا سیکھی۔"۳۳

اکثر نقادوں کا خیال ہے رومانیت اپنے خیالات سے پیچھا چھڑانے کا فرار ہے۔ یہ قطعی دوست نہیں رومانیت فکر و فلسفہ سے لبریز بھی ہے۔ ادبی رسائل جن کا تذکرہ ہم باب چہارم فکر و فلسفہ سے لبریز بھی ہے۔ ادبی رسائل جن کا تذکرہ ہم باب چہارم میں کر چکے ہیں اُنہوں نے رومانوی تحریک کو جلا بخشنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ان رسائل کے مدیر ماہر قلم کار تھے۔اسی لیے اُنہوں نے ایسے نثر نگاروں کو جمع کیا۔ جو رومانوی طرز تحریر کے دلدادہ اور اپنے اپنے طرز کے موجد بھی تھے۔سجاد حیدر یلدرم بھی اُن ہی ادیبوں میں سے ایک ادیب ہیں جن کے مضامین "مخزن" میں شائع ہوتے رہے۔ یلدرم کے مضامین اُن کے رومانوی مزاج کے عکاس ہیں۔اعلیٰ تخیل کے ساتھ ساتھ چاشنی یلدرم کے مضامین کا خاصہ ہے۔ان کے مضامین سرور اور شادابی سے معمور ہیں۔ یلدرم کے مضامین کے لہجے کا بانکپن اس نثر پارے میں ملاحظہ ہو:

بہے جا، بہائے لیے جا!
نہ تجھ میں سلامتی، نہ تیرے کنارے سلامتی!
مٹے ہوؤں کے نشان مٹائے جا!
تیرا کوں کو ڈبا! غواصوں کو نہ اُبھار!
یہی تیرا کام ہے!"۳۴

تحریر کا حسن یلدرم کے مضامین میں رعنائی و شگفتگی کی جمال پذیری کا ادراک تو عطا کرتا ہی ہے لیکن ساتھ ساتھ علمی متانت یلدرم کے مضامین کو تنوع و جدت بھی عطا کرتی ہے۔ یلدرم کے مضامین فطرت سے ہم آہنگ ہونے کے ساتھ ساتھ جذبات کے متحرک ٹھہراؤ اور تخیلی خیالات وتصورات کا بے بہا ذخیرہ ہمیں "حیران کن" مناظر کی سیر گاہوں میں لے جاتا ہے۔شخصی جذبات، انسانی احساسات، ڈرامائی کیفیات سے مضامین یلدرم رومانوی حسن کاری کا حسین مرقع نظر آتے ہیں۔ یلدرم کا مضمون "فطرت جوانمردی" ترکی زبان کا ترجمہ شدہ مختصر مضمون ہے۔جس میں بعض الفاظ اور بندش ترکی ہی میں رہنے دیئے ہیں۔اس مضمون کے الفاظ سہل، شیشہ اثر انگیز ہیں۔ ترکی زبان اوراُردو کا اختلاط مضمون کو حسین بناتا ہے۔ متانت وعلمیت

یلدرم کی ذہنی اُپج، تخیل، ندرت و جدت اور اختصار کی عکاسی اس مضمون میں نمایاں دکھائی دیتی ہے۔ ''مضامین یلدرم'' کی رومان پرور تحریریں دلاآویزی کے ساتھ ساتھ دردمندی و نشاط سے بھی قاری کو آگاہ کرتی ہیں۔ز۔خ۔ش کے حوالے سے یلدرم لکھتے ہیں:

> ''وہ ایک عندلیب عصر جو قفس میں پیدا ہوئی۔قفس میں جی اور اسی نے قفس ہی میں دم توڑا۔اسی چند گز نیلگوں آسمان کے سوا جو اس کے صحن خانہ پر حسرت بار ہا۔اس نے فطرت کی زیبائش، آفریدہ دست انسان کی آرائش نہ دیکھی، آفتاب جو دُنیا کو زندگی اور حرارت بخشتا ہے۔قفس کی تیلیوں سے لپٹے ہوئے کپڑے سے گزر نہ سکا، لیکن اس کے قلب منور نے ایک شمع روشن کی جس نے اسے باہر کے نور سے بے نیاز کردیا۔شمع تخیل!''[۳۳]

انگریز کے ظالمانہ طرزِ عمل نے لوگوں کو متنفر کردیا تھا۔ادیبوں کے ذہن میں نئی سوچ، نئی فکر پروان چڑھ رہی تھی شکست و ریخت کے احساس نے اُنہیں ماحول سے فراریت کے ساتھ ساتھ ارتقائی منزل کی طرف بھی گامزن کیا۔جس وجہ سے نثر کا نیا پن سامنے آیا ہے مغرب سے متاثر طبقہ نے رومانوی تحریک کے اثرات کو بڑی فراخدلی سے قبول کیا اور اپنی محرومیوں،کمزوریوں اور کوتاہیوں کی داستان لطیف انداز میں رقم کی اور اُمید و یاس کے ترانے بھی خوشگوار ماحول بنا کر سنائے تا کہ بددل اور ہارے ہوئے لوگ ایک بار پھر کمربستہ ہو جائیں۔ ماحول سے فراریت کے ساتھ ساتھ ماحول کو بدلنے کا حوصلہ بھی یلدرم نے دیا۔ اُنہوں نے اپنی جرت طبع سے نیا اور منفرد اسلوب ایجاد کیا۔ ڈاکٹر عبد الودود ''اُردو نثر میں ادب لطیف'' میں یلدرم کی نثر پر اپنی رائے کا یوں اظہار کرتے ہیں:

> ''یلدرم اپنے احساسات رنگین بنا کر پیش کرتے ہیں۔ان کی نگاہیں متلاشی حسن رہتی ہیں۔اور قلم اس حسن کو مصورانہ طور پر کاغذ پر پیش کرتا رہتا۔حسن فطرت کا ذکر ہو یا جنس لطیف کا، کسی کی موت پر اظہار افسوس ہو یا کسی انقلابی، سماجی تغیر پر اظہار حسرت، یلدرم الفاظ کے موتی بکھیرتے جاتے ہیں۔''[۳۴]

یلدرم کا جدید ذہن جدید اسلوب کا نمائندہ ہے۔مغربی فکر کی آویزش سے اُن کے مضامین متاثر نظر آتے ہیں۔ترکی کی ثقافت و معاشرت کے ساتھ ساتھ ترکی زبان کی حلاوت بھی اُن کی نثر کا حصہ ہے خوش مزاجی کے ساتھ ساتھ رموزوعلائم کے استعمال نے یلدرم کے مضامین کو جمالیاتی و رومانوی رنگ عطا کیا۔حسن پرستی اُن کی تحریروں کے لیے نقش اول ثابت ہوئی۔ یہ حسن پرستی اور علائم دلبستگی کا محور وہ انگریز تسلط تھا جس

نے جمالیاتی ادیبوں کو حیاتِ مستعار کے مصائب و آلام کو ملفوف زبان میں پیش کرنے پر آمادہ کیا۔ سجاد حیدر یلدرم اس صاف و شفاف مگر لفریب زبان کے سرخیل بھی تھے اور موجد بھی۔ ناسف بھرے الفاظ اس دور کی ترجمانی کرنے لگے لیکن ان ناسف بھرے لفظوں میں آزادی کی شدید خواہش جنم لیتی نظر آتی ہے۔ جو کرب و اضطراب میں مرصع زبان کے جلو میں نشاط انگیز رویوں کو جنم دیتی ہے۔ یلدرم ''جہاں پھول کھلتے ہیں'' کا آغاز یوں کرتے ہیں:

> ''جب پھول کھلتے ہیں اور یہ کشف اور ترش رو دنیا ہنسنے لگتی ہے ہوا میں جس عشق سے مشابہ آہنگ نرم، ایک اسرار انگیز خفیف روانی پیدا ہوتی ہے جب فرشتہ گل شبو کے منہ کھولتا اور بادلوں کو رنگین کرتا ہے اس وقت بہار کے موسم میں ایک شام کو مر جانے کا لطف ہے۔''۳۵

یلدرم کے ہاں الفاظ لائے نہیں جاتے بلکہ خود بخود پاکیزہ خواہشوں کی تکمیل میں صفحہ قرطاس پر بکھیرتے جاتے ہیں۔ لہجہ کی شرارت اور تخیل کا گداز اُن کے مضامین کو نیا بانکپن عطا کرتا ہے اور یوں سجاد حیدر یلدرم ایک نئے اسلوب کے موجد بن کر ہمارے سامنے آتے ہیں۔

سجاد انصاری، خلیقی دہلوی، جوش ملیح آبادی، فلک پیما، حجاب امتیازعلی تاج بھی انشائے لطیف اور رومانویت کے علمبردار ہیں۔ انفرادیت کا حسن کسی بھی مصنف کی تخلیق و نثر کو بتدریج معاشرتی تاثرات کا ضامن بنادیتا ہے اور بسا اوقات اس کی تخلیق مسرت و انبساط کا ہی ذریعہ بن جاتی ہے۔ سجاد علی انصاری کے ساتھ بھی کچھ ایسی ہی معاملہ ہے وہ ایک رومانوی نثر نگار ہیں۔ ''محشر خیال'' سجاد انصاری کا مختصر سرمایہ مضامین چند غزلوں، نظموں اور ''روزِ جزا'' نامی ڈرامے پر مشتمل ہے۔ خواجہ منظور حسین نے اسے مرتب کر کے ''محشر خیال'' کا نام دیا ہے۔ اس سے قبل بھی ۱۹۲۶ء میں جب پہلا ایڈیشن شائع ہوا تو اس میں ڈراما شامل نہیں تھا۔ پروفیسر خواجہ منظور حسین نے ''محشر خیال'' کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۴۱ء میں شائع کیا جس کے بارسوم طبع ۱۹۷۱ء کے ایڈیشن سے میں استفادہ کر رہی ہوں۔

سجاد انصاری سپاٹ اور خشک تحریر سے اجتناب کرتے ہیں۔ وہ ''ادب برائے ادب'' کے قائل ہیں۔ ''ادب لطیف'' لکھنے والے جدید گروہ سے تعلق رکھنے والے سجاد انصاری مغربی اثرات کے زیر اثر مترنم و پرکیف اندازِ تحریر کے مالک ہیں۔ فلسفہ ان کے خیالات سے متحرک نظر آتا ہے۔ ان کے مضامین میں عورت اور عورت سے متعلقہ نازک احساسات و جذبات کا فکری و لطیف موضوع زیر بحث رہا ہے اپنے

مضمون ''عورت'' میں سجاد انصاری لکھتے ہیں۔

''صحیح معنوں میں عورت وہ ہے جو اپنے انداز سے محبت کرنے والوں کے دلوں میں لطیف اُمیدیں پیدا کر دے، لیکن اُنہیں امیدوں کو ایک اندازِ لطیف سے مایوس بھی کردے۔ اُمید وبیاس کی انہیں نیرنگیوں میں محبت کرنے والے کی شکست رنگین اور نسوانیت کی فتح لطیف مضمر ہے۔''۳۶

سجاد انصاری کا انفرادی اسلوب تقلید کی نفی کرتا ہے۔ان کی تحریروں میں جمالیات کا دلکش وموثر عکس کے ساتھ ساتھ فکرو فلسفہ بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر عبد الودو''اُردو نثر میں ادب لطیف'' میں سجاد انصاری کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اُن کے یہاں فلسفہ اور ادب لطیف دونوں کو ایک حیرت انگیز امتزاج ملتا ہے۔اس بنا پر وہ ادب لطیف کے فلسفی کہے جاسکتے ہیں مگر ان کو رعنائی خیال آتش سیال اور ارتعاش رنگین والی نہیں، حقائق کو اُلٹنے پلٹنے اور رنگینی سے لطف اُٹھانے سے پیدا ہوئی ہے۔ وہ اپنے اسٹائل کی وجہ سے اہم ہیں۔''۳۷

ادب برائے ادب کے قائل سجاد انصاری مغربی علوم سے متاثر ہونے کے باوجود مشرقی ثقافت و تہذیب واقتدار سے گریز پا نہیں ہیں۔ وہ دلیل وقطعیت سے مافی الضمیر بیان کرتے ہیں۔ان کا نظریہ ہے کہ شاعری سے اخلاقی درس کا کام نہیں لیا جائے بلکہ شاعری حسن کے پرت کھولتی ہے اور حسن کی ناز برداریاں کرتی ہے۔ سجاد انصاری اثبات پر زوردیتے ہیں کہ حقیقتوں کی ترجمانی شاعرانہ لطافت کے تحت کی جائے اپنے مضمون ''فلسفی اورشاعر'' میں شاعر کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''شاعر اس لطیف نکتے سے واقف ہے کہ کائنات کی اگر کوئی حقیقت ہے وہ محض پردے کی رنگینوں میں مضمر ہے وہ اپنی فکریوں میں محو ہو جاتا ہے۔لیکن کبھی پردے اُلٹنا نہیں چاہتا وہ جانتا ہے کہ نقاب خود حسن کائنات ہے زیر نقاب کچھ نہیں۔''۳۸

حالی کے حوالے سے علی گڑھ میگزین کو جو دوخط لکھے ان میں حالی کی ادبی عظمت کو سراہتے ہوئے بھی ان کی شاعری میں اخلاق و وعظ کی تلقین پر کڑی تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میرا خیال تو یہ ہے کہ وعظ وتلقین کے سلسلے میں اُنہوں نے جس قدر شاعری کی۔ وہ سعی لاحاصل سے زیادہ نہیں۔ انہیں مسائل کو وہ نثر میں ادا کرسکتے تھے اور کامیابی کے ساتھ نظم کی زحمت اُنہوں نے ناحق گوارا کی۔''۳۹

لیکن مجھے سجاد انصاری کے اس لب و لہجہ سے اتفاق نہیں کیونکہ اگر حالی نہ ہوتے تو اقبال بھی نہ ہوتے۔ حالی کی شاعری نے نہ صرف حسن پرستی کے معیار و معنی و مفاہیم کو واضح کیا بلکہ حسن کو شیوہ ہوس پرستی کے طوق سے نجات دلاکر آبروئے حسن بڑھائی ہے۔ حالی کے اس شعر پر غور کریں۔

؎ ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب ٹھہرتی ہے دیکھئے جا کر نظر کہاں

یہ شعر کیا اقبال کی فکرِ اولین کا احساس نہیں

؎ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

حیرت ہے کہ اقبال کو پڑھ کر سجاد انصاری کو خدایاد آجاتا ہے لیکن حالی کی مسدس سے ان کا دل کیوں نہیں دہل جاتا۔ میرا خیال ہے کہ سجاد انصاری کی فکری نظر رومانیت کے جال میں کچھ اس طرح جکڑ گئی تھی کہ انہوں نے اپنے فکری اثاثے کے باوجود اپنی کم مائیگی کی بنا پر حالی اور متعلقات حالی سے بے نیازی ظاہر کی۔ بہرحال حالی کی شاعری حسن و اخلاق کا حسین سنگم ہے اور یہ سنگم اعتدال و توازن پر جدید شاعری کی بنیاد رکھتا ہے۔

سجاد انصاری کے ہاں فکری اثاثے اُن کے مختصر انشائیے میں اپنے جوبن پر نظر آتے ہیں۔ ''بے نیازی'' کا آغاز نہایت سبق آموز اور چونکا دینے والا ہے۔ سیدھے سادھے انداز میں لفظی حسن کاری کے تیر چلاتے ہیں۔ قوتِ متخیلہ کی مضبوطی نے سجاد انصاری کے اس موضوع کو انشا پردازی کے زمرے میں لے آتے ہیں۔ یوں کیفیات عشق اور وارداتِ قلب نے سجاد انصاری کے فلسفی ہونے کی دلیل کی بنا پر قاری کو اپنے تئیں متوجہ کیا یہی ایک کامیاب لکھاری کا اصل حسن ہے جو سجاد انصاری کا معیار فن بنا۔

خلیقی دہلوی نے اپنی تخلیقی کاوش ''ادبستان'' کی صورت میں چھوڑی۔ اختر شیرانی نے ''ادبستان'' کو مرتب کیا ہے۔ خلیقی کے رومان پر درتخیل میں مشرق کی تہذیب و ثقافت کے مشرقی اظہار بیان، محبت اور رومان، اُن کے تخیلاتی ذہن کا مرکز و محور ہے۔ اُردو ادب میں عورت کے پاکیزہ مقام کی نشاندہی پہلی بار خلیقی نے کی۔ وہ عورت کی نفسیاتی و ذہنی کیفیت پر بھی سیر حاصل گفتگو کرتے ہوئے ''نور جہاں کا شکار'' میں لکھتے ہیں:۔

''عورت کی فطرت اور تخلیق، نزاکت اور جمال ہی کی حامل نہیں ہے بلکہ اس کو عزم

اور ادارے کی بھی ایسی بلندی و دیعت ہوتی ہے جس کی مثال مردوں میں کمیاب ہے
آج افسوس اس بات کا نہیں ہے کہ ہم میں کوئی نور جہاں پیدا نہیں ہوتی بلکہ ماتم
اس کا ہے کہ اب فطرتِ نسوانی اس نوع کی تربیت سے یکسر محروم ہے۔"۴۰

خلیقی کا شاعرانہ نثر میں شگفتگی، تازگی، جاذبیت اور تخلیقی تجربے کی رومانویت نظر آتی ہے۔خلیقی کا شاعرانہ و تخیلی انداز فلسفہِ حسیات میں ملاحظہ ہو:

"آہ میں دیارِ حبیب میں، کوئے دوست میں، آستانِ یار کے قریب، پس دیوار، اپنے
محسوساتِ شعری میں، اس کی نزاکتِ آواز محسوس کرتا ہوں۔ترنم آواز جو مجھے حبیب
کا پتہ دے دیتی ہے، تم کیوں باور نہیں کرتے، کیوں مراسمِ تعارف سے ناآگاہ
مجھے نشانہ ملامت و تضحیک بناتے ہوئے۔"۴۱

لفظوں کی بازی گری بھی خلیقی کے نثر پاروں کا خاصہ ہے۔متنوع موضوعات کو براہ راست پیش کرنے کی بجائے خلیقی نے رومانوی تخیلاتی اورافسانوی زبان میں پیش کیا ہے انہوں نے اُچھوتے مرقع پیش کیے اور بے رنگ نثر کو مناعانہ زبان بنا دیا۔ ان کے ہاں فکر و تدبر بھی نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر عبد الودود "اُردو نثر میں ادب لطیف" میں لکھتے ہیں:

"خلیقی ایک کامیاب مصور ہیں وہ تصویر اس طرح پیش کر دیتے ہیں کہ اس میں
صرف ظاہری دلکشی ہی نہیں ہوتی بلکہ حقیقی جذبہ واحساس بھی نمایاں رہتا ہے۔"۴۲

رومانیت اظہار و وضاحت کے لیے ماورائی کیفیت اپنے اندر سموئے رکھتی ہے۔ یہ مصلحت کوشی سے مبرا ہوتی ہے۔انانیت سے اجتناب کرتی ہے تبھی شاعرانہ نثر آفاقی معنویت سے لبریز نظر آتی ہے آفاق ایک ایسی حقیقت ہے جو انسان کی نیچرل کیفیات سے قریب ترین ہوتی ہے۔

حجاب امتیاز علی کے ہاں رومانیت اپنی پوری آب و تاب سے جلوہ گر نظر آتی ہے۔ان کا پہلا مجموعۂ مضامین "نغمات کی موت" ہے جو ۱۹۲۲ء میں شائع ہوا۔"ادب زریں" دوسرا مجموعہ ہے۔ جو ۱۹۳۳ء میں شائع ہوا۔ جبکہ "خلوت کی انجمن" ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا۔ "نغمات کی موت" حقیقی جذبات کا آئینہ دار ہے۔ مجیب احمد خاں "حجاب امتیاز علی حیات اور کارنامے" میں لکھتے ہیں:

"نغمات کی موت" حجاب نے اپنی والدہ مرحومہ کی یاد میں تحریر کیا۔ جو اُردو کے
مشہور رسائل میں شائع ہو کر بے انتہا مقبول ہوئے۔ یہ مضامین مصنفہ کے دلی
جذبات کا آئینہ دار اور نظم نما نثر کا نمونہ ہیں طرز بیان بے انتہا دلآواز ہے۔ دردمند

دل بعض مضامین پڑھ کر آنسو بہانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔"۴۳

حجاب کا رومانوی انداز لفظی پیکر تراشتا ہے۔ ان کے ہاں جذبۂ محبت مترنم لہجہ میں نمایاں ہوتا ہے۔ جذبہ نسوائیت جب آلام حقائق سے ٹکراتا ہے تو حجاب کی روح بلک بلک جاتی ہے اور غم دل پر کشش، طلسماتی لفظوں میں ڈھل کر قاری کو قطرہ قطرہ پگھلاتے بھی ہیں جو اُن کی مرصع نثر، اور متین ذہن کا اعتراف بھی کراتے ہیں۔ "ادب زریں" میں حجاب کی نثر رومانی و جمالیاتی پرتویوں دکھاتی ہے:

"سورج حنا کی میانہ قد جھاڑیوں کے پیچھے ڈوب گیا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ
ارغنوں کا شور بھی کم ہوتا جاتا ہے۔ فضا پر ایک سکوتِ مطلق طاری ہو رہا ہے۔
آہ زندگی ..... کیا اُداس منظر ہے!
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ فرشتوں کے نزول کا وقت ہے۔ مگر میں سوچتی رہ گئی کہ
زندگی کیا ہے!۔"۴۴

حجاب امتیاز علی کی تحریروں میں دُکھ بھری نغمگی ملتی ہے۔ شگفتگی میں کرب کا احساس ملتا ہے۔ اُن کے ہاں اُمید و یاس متحرک ہے اور الفاظ کا رچاؤ سبک و نرم بھی اور ماورائی بھی ہے۔

حجاب نسوانی جذبوں کے حسن کو محسوس بھی کرتی ہے کیونکہ وہ نسوائیت سے واقف ہیں، اس لیے اُن کی تحریروں میں وجود زن میں پوشیدہ صلاحیتوں کا اعتراف نظر آتا ہے ان کے ہاں محبتوں کا خمار ملتا ہے۔ رعنائی وحسن سے مزین یہ تحریریں نہ تو استدال کا شکار ہوتی ہے اور نہ رکیک جملہ بازی ان میں نظر آتی ہے حجاب کے ہاں انشائے لطیف میں شگفتہ متانت ہے۔ مسحور کر دینے والی نثر حجاب کو مشاق نثر نگار بنا دیتی ہے۔ اُن کے ہاں موضوع کا اختصار بھی موضوع کے حسن کو کم نہیں کرتا بلکہ موضوع پر اُن کی مکمل گرفت ملتی ہے۔ توازن اور اعتدال اُن کی نثر کا خاصہ ہے اور الفاظ کا صوتی آہنگ ان کے نثر پاروں کو دلربا بنا دیتا ہے۔

فلک پیا کی نثری کاوش "مضامینِ فلک پیا" کے نام سے میاں بشیر احمد نے مرتب کر کے شائع کیے۔ جس کے ماسوائے دو مضامین کے تمام مضامین رسالہ "ہمایوں" میں شائع ہوئے۔ فلک پیا کی رومانوی بلند آہنگ نثر "ادب برائے ادب" کی ترجمان ہونے کے باوجود جولائی فکر سے مزین ہے۔ ان کے خیالات میں عمیق گہرائی نظر آتی ہے۔ ان کے ہاں رومانیت سطحی نہیں اور نہ ہی ابتذال کا شائبہ نظر آتا ہے۔ بلکہ سلجھا ہوا مذاق اُن کی تحریروں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ "فلک پیا" نے "ہوا" پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ وہ ملاحظہ ہو:

"میں اُسے اکثر دیکھتا ہوں۔ باوجود اس کی بدتمیزیوں کے، باوجود اس کی جلدی کے، باوجود اس کی بند آنکھوں کے ہوا میں اک شان سے جو میں چاہتا ہوں کہ مجھ میں آجائے، کاش میری زندگی ایک میٹھے جھونکے کی طرح ہو۔ آہٹ چاہیے کوئی سن پائے مگر کسی پر بوجھ نہ ہو۔ دلوں کے مرغزاروں میں خفیف سا رقص، لطیف سا زنم، بانکی سی موج تبسم پیدا کروں اور پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چل دوں۔ مجھے بھی جلدی ہے۔"۴۵

فلک پیما کے ہاں نفاست بھی ملتی ہے اور پاکیزہ اور ادب لطیف کا احساس بھی نظر آتا ہے وہ لفظوں کے زیروبم سے اپنی فکر و تخیل کو بڑے محتاط انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ان کے ہاں حسن و رعنائی کے ساتھ ساتھ نثری ٹکڑوں میں فکر و تدبر نظر آتا ہے وہ جذبے کی بغاوت سے اجتناب کرتے ہیں۔

فلک پیما کی نثر میں ظرافت کا عنصر نمایاں اور یہ ظرافت کسی کی دلآزاری کا سبب نہیں بنتی بلکہ قاری کے احساس کو گداگدا کر طبیعت کو ہشاش بشاش کر دیتی ہے۔ قاری کے قلب و ذہن پر مثبت سوچ کی لہر چھوڑ جاتی ہے "مروجہ اُردو شاعری" کا آخری پیرہ ظرافت کا اعلیٰ نمونہ ہے:۔

"چند شاعروں نے مناظر فطرت پر سواری گانٹھنے کی ٹھہرائی تھی۔ بیچارے دشت و کوہسار زخمی ہوئے۔ بادلوں کے پرخچے اُڑے۔ چاندنی بلبلا اُٹھی۔ تصوف و عرفان بھی شعر کی چکی میں پس کر سرمہ ہو چکے۔ اس خاک اُڑانے سے بھی کچھ نہیں بنے گا۔ تو آخر پھر اب کیا ہوگا؟ سٹرائک یا ہڑتال!"۴۶

فلک پیما کا مکالماتی انداز ان کے نثر پاروں کو منفرد بناتا ہے فلسفے کی گہرائی، شگفتہ و سلیس نثر میں جب جب جھلکتی ہے تو لفظ آئینہ بن کر بولنے لگتے ہیں۔ تخیل کی لطافت طلسمی فضا مہیا کرتی ہے۔ صاف و شفاف ستھرے ستھرے جذبوں کی حقیقتوں اور صداقتوں کا رنگ فلک پیما کے ہاں نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر عبد الودود "اُردو نثر میں ادب لطیف" میں فلک پیما کے نثر پاروں پر اپنی رائے کا یوں اظہار کرتے ہیں:۔

"فلک پیما کی تحریروں میں مزاح، رومانیت اور مکالماتی انداز ہے۔ وہ ادب کو عام فہم بنانا چاہتے تھے ان کا خیال تھا کہ ادب پاکیزہ ہو اور اس کا ایک مقصد بھی ہونا چاہیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ فلک پیما کی تحریریں افادی اور عوامی ادب لطیف ہیں۔"۴۷

جوش کے ہاں رومانیت میں شدت نظر آتی ہے۔ ان کے مضامین "مقالاتِ جوش" کے نام سے سحر انصاری نے اپریل ۱۹۸۲ء میں اُردو محل پبلیشر کراچی سے شائع کیے۔ ایک مجموعہ "اشارات" .....قزلباش دہلوی

نے اُردو بازار دلی سے شائع کرایا۔ ''مضامین جوش'' کا جائزہ لیں تو یہ مضامین پرشکوہ انداز بیان لیے ہوئے ہیں۔ خطابت کا عنصر اُن میں نمایاں ہے۔ جوش کے مضامین کی نثر فیصلہ کن نثر ہے قطعیت اُن کا معیار ہے۔ تاثراتی اورجذباتی اندازِ بیان کے باوجود جوش کا کمال فن اوج پر دکھائی دیتا ہے۔ اُن کے مضامین میں بناوٹ اور تصنع کا احساس کہیں بھی نہیں ملتا۔ بلند تخیل اورجدید فکر کے تناظر میں معاشرے کی سفاک اور بے رحم حقیقتوں کو بے نقاب کرتے ہوئے جوش قطعی رعائیت نہیں کرتے۔ بے باک الفاظ میں برملا اپنے خیالات کا اظہار ''عصر حاضر کے ہلاکو اور اُنکے مقتول'' یوں کرتے ہیں:

> ''پرانا ہلاکو کھلے میدانوں میں خون بہاتا تھا۔ نیا ہلاکو لاکھوں روپے کی بڑی بڑی عمارتوں کے اندر خون پیتا رہتا ہے۔
>
> پرانا ہلاکو مار ڈالتا تھا۔ نیا ہلاکو زندہ رکھتا ہے اورایسی ہولناک قسط ہلاکت پر زندہ رکھتا ہے کہ اس کا مقتول تمام عمر سسکتا ہی رہتا ہے اوراس کی تمام زندگی ایک مرگِ طویل نزع بن کر رہ جاتی ہے۔
>
> پرانا ہلاکو جسموں پر حملہ کرتا ہے..... نیا ہلاکو جسموں کو احترام کرتا ہے لیکن روحوں کو کچل کر رکھ دیتا ہے۔''[۴۸]

جوش کی رومانیت میں آسکروائلڈ کی قربت کا احساس ملتا ہے۔ وہ دریا کو کوزے میں بند کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ رومانیت کا باطل تصور ''مضامین جوش'' میں نہیں ملتا بلکہ رومانویئت کی صداقت اورمٹھاس کا راج اُن کے مضامین میں نظر آتا ہے۔ مضامین جوش کی سحر آفرین تحریر قاری کو خمار آلود کر دیتی ہے۔ لیکن مضامین کا فکری عرفان قاری کو چونکا بھی دیتا ہے۔ یوں قاری اپنے گردوپیش کے واقعات سے باخبر ہو جاتا ہے۔ ''تمدن کی ظالمانہ مسخرگی'' میں لکھتے ہیں:

> ''مصنوعی مکان، مصنوعی لباس، مصنوعی غذا، مصنوعی پانی، مصنوعی روشنی اورمصنوعی ہوا نے اس طرح ہمارا محاصرہ کرلیا ہے کہ ہم فطرت کا تصور تک نہیں کرسکتے۔ ہمارا اُٹھنا، ہمارا بیٹھنا، چلنا پھرنا، ملنا جلنا، کھانا پینا، غرض کہ زندگی کا ہر کام اس قدر بناوٹی اورغیر فطری ہوگیا ہے کہ ہم یہ بھول چکے ہیں کہ حقیقی زندگی بسر کیوں کر کی جاسکتی ہے۔''[۴۹]

جوش نے ادبی و سماجی شخصیات پر بھی لکھا ہے۔ علامہ اقبال کی موت پر کس دلگداز انداز میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہیں:

"اقبال ہر حالت اور ہر رنگ میں اقبال تھا۔ افسوس کہ ہماری شاعری کا آفتاب غروب ہوگیا۔

اقبال اُن لوگوں میں سے تھا جو صدیوں اور قرنوں کی سعی پیہم کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔"۵۰

سادہ اور پر کیف نثر میں عظمت اقبال کا احاطہ کرنا جوش جیسے نثر نگار ہی کا کام ہوسکتا ہے اصغر گونڈوی کے حوالے سے آغاز ہی قاری کو نہ صرف سنجیدہ کر دیتا ہے بلکہ جوش کے ہاں تکرار الفاظ کی بازگشت اُسے حیران کر دیتی ہے۔ تاسف بھرے پرشکوہ الفاظ طلسماتی اثر چھوڑتے ہیں۔ ان کے کسی بھی لفظ سے ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ زبردستی ٹھونسا گیا ہے۔ بلکہ الفاظ جوش کے ہاں دست بستہ نظر آتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"کس کس کو روئیں اور کس کس کا ماتم کریں۔ مبارک ہیں وہ جو دنیا سے جلد اُٹھ جاتے ہیں اور حیف ہے اُن پر جو جانے والوں کا ماتم کرنے کے لیے زندہ رہتے ہیں۔

ابھی پریم چند کی موت کا زخم ہرا ہی تھا کہ اصغر کی رحلت نے دل میں ایک اور گہرا زخم ڈال دیا۔"۵۱

جوش کے مضامین کا ایک وصف تمثیل نگاری بھی ہے۔ وہ جادو بیانی سے ڈرامائی فضا پیدا کرتے ہوئے قاری کو جدید فکر سے متعارف کراتے ہیں۔ وہ جدت کے مخالف نہیں لیکن جدت اقدار سے جب متصادم ہوتی ہے تو جوش کے تخیل کی فکر نو قاری کو اپنی طرف متوجہ کرلیتی ہے۔ لیکن جوش ایسے صناع اور نثار ہیں کہ اُن کے مضامین بلاغت و فصاحت کا نمونہ نظر آتے ہیں۔ یہ مضامین کسی زاہد خشک کے مضامین نہیں۔ ان میں فطرت متبسم کے ساتھ زندگی کی رعنائی جلوہ گر ہوتی ہے۔ ان کے لہجہ کی رنگینی قاری کو نشاط سرور بخشی ہے۔

تنقید کا آغاز انسان کی ابتداء سے ہوا ہے۔ بچہ ماں کو اجنبی کے مقابلے میں انسیت سے پہچانتا ہے۔ شاگرد اپنے اُستاد پر دانشور کے مقابلے میں بھروسہ کرتا ہے اور فن پارے کا ناقد فن پارے کے اندر سے تئے اُصول و قواعد دریافت کر کے تنقید کرتا ہے۔ تنقید کا ایک رخ جمالیاتی تنقید ہے جو فن پارے کے داخلی عنصر پر زور دینے کے بجائے اس بات پر زور دیتی ہے کہ فن پارے میں زبان کونسی استعمال کی گئی اس کی ہیئت کیا ہے اور حسن و جمال سے مرصع اصطلاحاً اسلوب سے قاری کو کیا مسرت اور حظ ملتا ہے۔

"Evropean literature from Romanticism نے اپنی کتاب Martin travers
to postmodernism" میں رومانیت کی تعریف یوں کی ہے:

"The romantic project could never be a finsished object, but should be viewed as the product of a harmeneutic processs that is alwatys in the making. It was a multifact ideal rather than a single reality, and could contain a variety of positions on the world. Some romantic writers might be naively 'natural', others might be analytical; some might exude a condifidence that they had secored the proper image thier desire object, while others would remain tentative, hesitationgly self-conscions, and proud of ther failure to achive totality."۵۲

رومانوی تنقید کا رویہ تاثراتی اور جذباتی ہونے کے ساتھ جمالیاتی اندازِ فکر بھی رکھتا ہے۔ اُردو میں عبد الرحمٰن بجنوری کا نام رومانوی تنقید کے حوالے سے اہم ہے۔ عبد الرحمٰن بجنوری کے حوالے سے جو کتب ہمارے سامنے آتی ہیں وہ ''باقیات بجنوری'' اور ''یادگارِ بجنوری'' ہیں۔ ان دونوں کے مقالات کو ''مقامات بجنوری'' کے عنوان سے بجنوری ٹرسٹ اسلام آباد نے مئی ۲۰۰۴ء میں شائع کیا۔ اس لیے ہم ''مقالاتِ بجنوری'' کے حوالے سے بجنوری کی تنقید کا تجزیہ کریں گے کہ بجنوری کے ہاں رومانی تنقید کس حد تک حاوی ہے۔ بجنوری کا تنقیدی احساس فکر رومانوی تجلیات سے منور ہے اور حسن و جمال کا عکس اُن کے مضامین میں اُن کی شعوری کوشش کی چغلی کھاتا ہے۔ محاسن غالب کے اکثر جملے اسی کی بازگشت سناتے نظر آتے ہیں۔ جو شعوری کوشش و کاوش ہے۔ ''محاسن غالب'' میں مبالغہ آمیز تحریر ملتی ہے وہاں فیصلہ کن رائے بھی ملتی ہے جبکہ مقالات بجنوری فکری تخیل سے پر ہے اور روحانیت وجدان اُن کے تخلیقی تجربہ کا بنیادی عنصر ہے۔ ''حالی'' مضمون میں اُن کی شاعرانہ اور رومان پرور نثر کا ٹکڑا ملاحظہ ہو۔ لکھتے ہیں:

''محبت شاعری کے لیے ایک پاک جذبہ ہے اور ہر شعر میں وہ جذبہ پنہاں ہے۔ حسن نیکی کا پھول ہے اور گو وہ اس زمین میں پیدا ہوا ہے۔ لیکن اس میں حسن ازل کی جھلک موجود ہے۔''۵۳

نیاز فتح پوری کے ہاں رومانیت کی لہر بھرپور نظر آتی ہے۔ اُن کی تنقید میں جمالیاتی رنگ ہے۔ خوبصورت جملے، پرکشش نثر اور دل پذیر تشبیہات و استعارات و تراکیبیں اُن کی ناقدانہ نخروں کا حصہ ہیں۔ وہ کسی بھی شخصیت اور ادب پارے کو فکر کی گہرائی سے دیکھنے کی بجائے اس میں حسن و رنگینی تلاش کرتے ہیں۔ نیاز کے ہاں تاثراتی اندازِ بیان ملتا ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر اپنے مضمون ''اُردو تنقید..... ایک مختصر جائزہ'' میں لکھتے ہیں:

> ''سجاد یلدرم اور نیاز فتح پوری نے اسلوب میں حسن کاری پر زور دیا ہے۔ چناں چہ نیاز فتح پوری کی تنقید (انتقادیات ۲ جلد) کا جمالیات سے رنگ چوکھا ہوجاتا ہے۔ وہ جمالیاتی رویہ جس کے ڈانڈے تاثیریت (Expressionism) سے جا ملتے ہیں۔''۵۴

نیاز اپنے تنقیدی موضوعات میں اسلوب کے حسن اور رنگ و جمال کی تلاش کرتے ہیں۔ تاثراتی تنقید فردِ واحد کے جذبات کی عکاس ہوتی ہے اور اپنے پسندیدہ موضوعات چن کر اپنے ذاتی جذبات کی بنا پر اس فن پارے کا تجزیہ کرتا ہے۔ رومانوی نقاد حظ و مسرت پر یقین رکھتا ہے اور نیاز کے ہاں بھی تاثراتی تنقید کا غلبہ ہے۔ اپنے صادق جذبوں کے جھرمٹ میں نیاز فن پارے کا ناقدانہ جائزہ لیتے ہیں۔ اور خوشی و انبساط سے اپنی روح کی تسکین کرتے ہیں۔ نیاز کے ہاں تشبیہات و استعارات اور تراکیب، صنائع بدائع اس خوبصورتی سے استعمال ہوتے ہیں کہ فن نقد کا جمالیاتی رنگ چوکھا ہو جاتا ہے۔ والٹر پیٹر کی اظہاریئت اور آسکر وائلڈ کی موضوعیت نیاز کے مضامین میں نظر آتی ہے۔ احساس توضع اور مسرت آمیز نثر دیکھنے کو ملتی ہے۔ ''کلام مومن پر ایک طائرانہ نگاہ'' میں نیاز پہلی ہی سطر میں مومن کو دیگر شعراء پر یہ کہہ کر ترجیح دیتے ہیں:

> ''اگر میرے سامنے اُردو کے تمام شعراء متقدین و متاخرین کا کلام رکھ کر (بہ استثنائے میر) مجھ کو صرف ایک دیوان حاصل کرنے کی اجازت دی جائے تو میں بلاتامل کہہ دوں گا کہ مجھے کلیات مومن دیدو باقی اُٹھا کر لے جاؤ۔''۵۵

یہ فیصلہ کن جملے جو کسی گنجائش کے محتاج نہیں۔ تاثراتی تنقید کا بین ثبوت ہیں۔ مزید یہ کہ غالب اور مومن کا تقابلی تجزیہ کرتے ہوئے مومن کو غالب پر برملا ترجیح دیتے ہیں حالانکہ غالب کا مرتبہ ہم سب جانتے ہیں۔ اس طرح ''میاں نظام شاہ رامپوری'' میں اُن کی شاعرانہ نثر دکھائی دیتی ہے۔

"مظلیہ بزم کی آخری شمع گل ہو چکی تھی اور اس کے پروانے اِدھر اُدھر منتشر ہو چکے تھے کہ اُفق مصطفٰے آباد میں روشنی کی جھلک نظر آئی اور ان سب نے اسی طرف رُخ کردیا۔ ہر چند برہمی "رنگ محفل" کی داستان سے ابھی تک قلب مجروح اور لب خونچکاں تھے لیکن دربار رامپور کی قدرشناسیاں، نکتہ نوازیاں حقیقتاً مرہم کافور تھیں کہ چند دن میں تمام زخم بھر گئے اور بھوکی ہوئی نغمہ سنجیاں پھر یاد آگئیں۔" ۵۶

عقلیہ شاہین اپنی کتاب "نیاز فتح پوری، شخصیت اور فن" میں نیاز کی تنقیدی فیصلوں کو مسلمہ قرار دینے کے باوجود اُن کی تنقید کی اساس اُن کو اپنے ذوق، ذاتی تاثرات و جذبات پر رکھتی ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ نیاز اپنے ذوق تسکین کی بنا پر کسی فن پارے کی فن نقد کے معیار پر پرکھتے ہو اُن کی نظر اختلاف رائے پر نہیں ٹھہرتی ہے بلکہ اختلاف رائے کی گہرائی پر جاتی ہے۔ اسی لیے وہ تاثراتی تنقید کے علمبردار اور زبردست حامی بن کر ادب عالیہ میں ابھرتے ہیں۔ والٹر پیٹر (Walter Peter) جمالیاتی دبستان سے وابستہ تھا اور وہ اپنے مضمون Style میں اسلوب کی اہمیت کے حوالے سے کہتا ہے:

"I shall call the necessity of mind in style." ۵۷

نیاز فتح پوری کے ہاں والٹر پیٹر کے جمالیاتی فکر کا پرتو جھلکتا ہے۔ اپنی جدت طبع کی بنا پر نیاز لطیف ذوق اور وجدان سے کسی بھی موضوع کو فنِ نقد پر پرکھتے ہیں۔ وہ شعوری طور پر رومانوی چاشنی اور لذت و سرور سے موضوع کو انفرادی داخلی جذبات کا عکاس بنا دیتے ہیں۔ رومانویئت ہمیں پرستش، آزادی، انسانیت اور فطرت کے پیار کا اچھوتا درس دیتی ہے اور دوسروں کو چاہنے اور اپنے آپ کو چاہے جانے کی خواہش وہ رومانوی عنصر ہے جس نے رومانوی تحریک کو جلا بخشی۔ نیاز کی رومانوی تنقید میں موضوع کی چاہت اور ان کی داخلی کیفیات کا بہت گہرا اثر نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر عبد الودود "اُردو نثر میں ادب لطیف" میں نیاز پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

"نیاز اور ٹیگور اور یلدرم کے علاوہ مغرب کے جمالیاتی مصنفین کا گہرا اثر ہے۔ ان کا جدت طراز ذہن نئی تشبیہات، نئے استعارات اور نئی تراکیب کی تخلیق کراتا ہے۔ رومانویئت کے ساتھ ساتھ جمالیات بھی ان کی تخلیقات کی ....." ۵۸

نیاز کی تنقید لفظوں کے تراشے ہوئے حسین و جمیل پیکر میں ملفوف تنقید ہے۔ ان کے موضوعات میں تدبر و فکر بین رہی اور ان کی تحریروں میں جہاں جہاں فکر و تدبر موجود ہے وہاں ایک طرف تو نیاز نے قافیہ

پائی سے اجتناب کیا اور دوسری طرف شعوری طور پر ضائع بدائع کے استعمال سے ماضی الضمیر بیان کیا۔ نیاز انتقاد کے حوالے سے مقناطس کشش سے پر لفظی کواہیوں پر یقین رکھتے تھے اس بنا پر حظ وحسرت اور خوشی پر بھی یقین رکھتے ہیں جو جمالیاتی و رومانوی تحریر کا دائمی اُصول ہے۔

عبد الماجد دریا آبادی کا ادبی سفر نقد و انشا سے عبارت ہے۔ اُن کے ہاں رومانویت متوازن نظر آتی ہے۔ اُنہوں نے زندگی ہائے رنگا رنگی کے ہر موضوع پر قلم اُٹھایا ہے۔ مشرقی انداز تحریر اُن کا خاصہ ہے۔ اُن کے مضامین میں تنقید کا وجود انشائے لطیف کے بھرپور عکس ملتا ہے۔ ان کے ہاں تاثراتی تنقید بھی نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر تحسین فراقی لکھتے ہیں:

> ”وہ کسی فن پارے میں سادگی، بے تکلفی، برجستگی سلاست، صداقت، اخلاق آموزی اور عبرت انگیزی کے عناصر تلاش کرتے ہیں۔ وہ اسے سوقیت اور بازاریت سے پاک دیکھنے کے متمنی ہیں۔ ان کا ادب کا تصور صالح ہے اور وہ روایتی، اخلاقی اور الہامی طرزِ احساس کے نقاد ہیں۔“ ۵۹

عبد الماجد دریا آبادی نے فلسفیانہ مضامین بھی لکھے ہیں جن میں اُردو زبان کے سنگلاخ زمینوں سے استفادہ کیا گیا ہے اُن کا اسلوب استدالی اور منطقی ہے لیکن تاثراتی اندازِ تحریر اور کہیں کہیں ثقیل الفاظ کی بھرمار سے اُن کی تحریریں بوجھل ہو جاتی ہیں۔ لیکن جذبے کی فروانی اُن کی تحریروں کو شگفتہ بنادیتی ہے۔ مولانا الطاف حسین حالی کے حوالے سے اپنی مضمون ”اُردو واعظ شاعر“ میں لکھتے ہیں:

> ”کون حالی؟ وہی جن کے تغزل و تشبیب کی کوئی وقعت دل میں تھی ہی نہیں بس شروع سے یہ خیال جمال ہوا تھا کہ غزل کی رنگینوں اور رنگین بیانوں سے انہیں واسطہ کیا۔ ایک خشک نظم نویس، کلام میں عاشقانہ مضامین کا قحط، بندشیں سست، خدا عزیق رحمت کرلے۔ دورِ اول کے اودھ پنچ کو اور بھلا کرے اس کے نقادانِ فن اور شہواران سخن کا۔ یہ اسی کا فیض تھا کہ ایک عامی اور مبتدی طالب علم ہی کے نہیں خدا جانے کتنے پڑھے لکھوں، پختہ کاروں، لائق فائق زبان دانوں کے دل میں بس یہی رچاؤ ہوا تھا۔ اِدھر حالی کا نام آیا اِدھر کلام کی بے نمکی، بے اثری، روکھے پن کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر گئی!.....“ ۶۰

فراق کی تنقید تاثراتی تنقید کے زمرے میں آتی ہے اور ”اندازے“ کا رنگ بھی جمالیاتی و تاثراتی ہے اردو غزل گوئی، اُردو کی عشقیہ شاعری، حاشیے، اندازے تخیل اور وجدان سے پُر تحریریں ہیں، فراق والٹر

پیٹر (Walter Peter) سے متاثر ہیں۔کلاسکی شعراء پر فراق نے تنقید کی اور رومانی و تخیلی فکر سے کلاسیکی شعراء کا تنقیدی احاطہ کیا۔ترقی پسند تحریک کے اثرات فراق کے ہاں قدرے معمولی نظر آتے ہیں۔فراق نے اُردو ادب کی شعری روایت کو زندہ رکھا شعری حسن و جمال سے فراق لطف اندوز بھی ہوتے ہیں اور شعری روایت کومسرت آمیز بھی قرار دیتے ہیں،فراق کی تنقید شعری نثر پارے نظر آتی ہے ان کے ہاں ذہانت اور جمال پرستی کا امتزاج ملتا ہے۔ جملوں اورفقروں میں رومانوی ارتعاش نظر آتا ہے۔فراق کا ناقدانہ تشخص ذاتیات سے بالاتر قطعی نہیں ہے تبھی ان کے تنقید میں سرشاری کا پہلو نمایاں ہے۔فراق نے ادبی تنقید کوفن کا درجہ دیا ہے۔فراق کے ہاں رومانوی انداز نثر ہونے کے ساتھ سماجی اور تہذیبی رچاؤ بھی ملتا ہے۔فراق شاعر کے روایتی اثر پر یقین رکھتے ہیں۔فراق کے تنقیدی اسلوب میں ان کا شعری مذاق بھی گھلا ملا نظر آتا ہے۔ وہ ہر شاعر کا تجزیہ اس کے جمالیاتی پیکروں کے توسط سے کرتے ہیں اور ان کلاسیکی شعراء کے مخفی شعری اسلوب وجمال کو اُجاگر کرتے ہیں۔

اُردو ادب میں ترقی پسند تحریک کا آغاز تو اُسی وقت ہوگیا تھا جب مختلف تحریکوں نے برصغیر پاک و ہند کو آزادی کے لیے جدوجہد تیز تر کردی تھی۔سرسید احمد خاں کی تحریک، شاہ ولی اللہؒ تحریک اور ہندوؤں کی مذہبی تحریکوں نے ادب اور سماج کا رشتہ استوار کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ روس میں ۱۹۰۵ء میں جو انقلاب آیا اور۱۹۱۷ء میں اس انقلاب کے اثرات جو رونما ہوئے اس نے برصغیر پاک و ہند کے باسیوں کو بیداری و شعور عطا کیا۔لنین نے روسی معاشرت اور سیاست کا مشاہدہ کرتے ہوئے عوامی استحصال کومحسوس کیا۔سرمایہ دار طبقہ جومتوسط طبقے اورغریب طبقہ کا استحصال کر رہا تھا اس دور کے دانشور سائنس دان اور ادیب لنین کے خیالات سے متفق ہوگئے یوں فردِ واحد کی حاکمیت کا زور ٹوٹا اور انقلابِ روس سے محنت کشوں، مزدوروں اورتنگ دستوں کو زبان عطا کی مزدوروں اور محنت کشوں کے لیے قصباتی اور اصلاحی پروگرام شروع کیے گئے۔ انقلابِ روس نے دنیا کے پست حال عوام کو حق خودارادیئت کے لیے کمربستہ کیا۔ مارکسی نظریات سے متاثر معاشرہ مادی ضروریات، معاشرتی مسائل اورفردِ واحد کی آزادی پر زور دیتا ہے۔لنین نے مارکسی وہیگل کے نقطہ نظر سے استفادہ کرتے ہوئے مزدوروں، محنت کشوں اور مفلوک الحال عوام کو آمریت کے خلاف ڈٹ جانے کا مژدہ سنایا یوں روس ادبی و سماجی، سیاسی تنظیموں نے برطانیہ، امریکہ اوردیگر ممالک کے ساتھ ساتھ برصغیر پاک و ہند بھی گہرے اثرات چھوڑے۔

کال مارکس جرمن ماہر معاشیات اور فلاسفر تھا وہ اپنے نظریات کے توسط سے معاشرتی انقلاب لایا۔ اس نے Communist Manifesto لکھوایا اس کے نزدیک فن پاروں کے موضوعات کو معاشی تغیر و تبدل اور مادی قدروں کے بدلنے سے بدل جانا چاہیے وہ جدلیاتی مادیت پر زور دیتا ہے اسی کے دور میں ہی اُسکے خیالات کا اثر سیاست، معاشرت پر پڑا، اور انقلاب دوس کا سبب بھی یہی مارکسی نظریہ بنا۔ اینگلو اور مارکس کی نظریاتی دوستی بھی تھی۔ اینگلز بھی فلاسفر تھا۔ یوں دونوں نے ملکر کیمونسٹ تھیوری پر کام کیا۔ جرمنی میں ہیگل برطانیہ میں آدم سمتھ، فرانس میں روسو اوردیگر اکابرین ادب مارکزم سے متاثر ہوئے۔

مارکسی نظریہ کے مطابق وہ طبقہ جو زیادہ محنت کے بدلے کم اُجرت حاصل کرتا ہے وہ مظلوم طبقہ ہے اوریوں کم سرمایہ دار معاشی استحکام کو کھوکھلا کر دیتا ہے اس لیے اس نے جدلیاتی مادیت کی بات کی جس کے تحت مادی ذرائع ووسائل کی اہمیت کو انسانی عقل وشعور پر ترجیح دی۔ اس نے ادیب سے بھی یہی توقع کی کہ وہ بدلتی ہوئی قدروں اور بدلتے ماحول کے مطابق زندگی کی نشیب و فراز کی حقیقی اور صادق تصویر دکھائے۔ لنین نے مارکس نظریہ کو اپنایا اور اپنی سیاسی پالیسوں میں کال مارکس کے نظریات شامل کیے اور زارا شاہی حکومت کے خلاف لنین نے آواز بلند کی۔

برصغیر پاک و ہند میں بھی حقوق کی پائمالی پر عوامی ردِعمل شروع تھا برطانیہ میں سجاد ظہیر نے چند دوستوں کے ساتھ ملکر ترقی پسند تحریک کی بنیاد ڈالی۔ یوں برصغیر پاک وہند میں اس تحریک کا آغاز ہوا۔

ترقی پسند تحریک کے مقاصد یہ تھے۔

۱۔ ہندوستان کے مختلف لسانی صوبوں میں ادیبوں کی انجمنیں قائم کرنا.....

۲۔ ان ادبی جماعتوں سے میل جول پیدا کرنا جو اس انجمن کے مقاصد کے خلاف نہ ہوں۔

۳۔ ترقی پسند ادب کو تخلیق و ترجمہ کرنا جو کہ صحت مند و توانا ہو اور اس سے تہذیبی پسماندگی کو مٹایا جاسکے۔ یوں ہندوستانی آزادی اور سماجی ترقی کی طرف بڑھ سکیں گے۔

۴۔ ہندوستانیوں کو قومی زبان اور انڈو رومن رسم خط کو قومی رسم خط تسلیم کرنے کا پرچار کرنا۔

۵۔ فکرونظر اوراظہار خیال کی آزادی کے لیے جدوجہد کرنا۔

۶۔ ادیبوں کے مفاد کی حفاظت کرنا، عوامی ادیبوں کی مدد کرنا جو اپنی کتابیں طبع کرانے کے لیے امداد چاہتے ہوں۔

ادب اور سماج کے باہمی روابط کو اُجاگر کرنے کے لیے ادیب اپنے قلم سے معاشی، معاشرتی ناانصافیوں، سامراجی تسلط، غاصبانہ قوتوں کی تیرگی مٹانے اورحال و مستقبل کو خوشحال بنانے کی دُھن میں مشغول ہوا تو پریم چند، سجاد ظہیر، مولوی عبدالحق، اختر رائے پوری، ڈاکٹر عبدالعلیم، اختر انصاری، عزیز احمد، علی سردار جعفری، فیض احمد فیض، علی عباس حسینی، ممتاز حسین اوردیگر ادیب سامنے آئے۔ ادب لطیف، نیاز ادب، ساقی جیسے نامور رسالوں میں ترقی پسند نظریوں کے حامیوں نے مضامین لکھنے شروع کیے۔ اختر حسین رائے پوری کا مضمون ''ادب اور زندگی'' جولائی ۱۹۳۵ء میں رسالہ اُردو میں شائع ہوا۔ جو اُن کی کتاب ''ادب اور انقلاب'' میں اکتوبر ۱۹۴۳ء میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں وہ ادب کو ہر زندگی کا ایک شعبہ اورماحول کا ترجمان قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ ادب اور زندگی کے مقاصد ایک ہیں اورادب زندگی کا عکاس ہے۔۱۹۴۱ء میں اختر انصاری کی کتاب ''افادی ادب'' ترقی پسند ادب کے زیر سایہ سامنے آتی ہے۔ جس میں وہ ادب کوتفسیر حیات ماننے کے ساتھ ساتھ ادب کوتنقید حیات بھی قرار دیتے ہیں اور متھو آرنلڈ کے اس قول کی تائید کرتے نظر آتے ہیں کہ ادب تنقید حیات ہے۔ اختر انصاری بھی اختر حسین رائے پوری کی طرح مارکس نظریے سے متفق نظر آتے ہیں کہ ادیب سماج کا مضبوط ستون ہے اوراُسے ادب تخلیق کرنا چاہیے جو ذہنی بالیدگی کا سبب ہو۔ وہ اصلاحی اورترقی پسند ادب میں واضح فرق محسوس کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ''جو چیز اس کے ادب کو اصلاحی ادب سے ممتاز کرتی ہے۔ وہ اس کا نقطہ نظر ہے وہ ہر طبقے کی زندگی اوراس زندگی کے ہر پہلو کا مطالعہ عوامی اور پرولتاری نقطہ نظر سے کرتا ہے۔''[۱۱]

ترقی پسند ادب تنظیم، ترتیب و اعتدال کا پرچار کرتا ہے اس تحریک کے تحت جو مضامین لکھے گئے وہ آمریت کے خلاف انقلاب برپا کرنے کا سبب بنے۔ ان میں سرمایہ داری اوراستعماری طاقتوں کے خلاف آوازبلند کی گئی۔ ان مضامین کی بنیاد تغیر وتبدل، فکری نشوونما، انقلابی ثابت قدمی، انقلابی کشمکش اورحریت عمل پر رکھی گئی۔ ڈاکٹر سلیم اختر تنقیدی دبستان میں لکھتے ہیں:

> ''اشتراکیت میں شعور، فکر اور تخیل سبھی مادی حقیقتوں اوراقتصادی عوام کے تابع ہیں اس لیے مادہ اوراس کے مظاہر کو اساسی اہمیت حاصل ہوتی ہے جبکہ خیال اورشعور کو ثانوی۔''[۱۲]

ترقی پسند تحریک کے تحت جو ادب لکھا گیا وہ تین ادوار پر مشتمل تھا۔

☆ پہلا دور ۱۹۳۶ء تا ۱۹۴۱ء

☆ دوسرا دور ۱۹۴۲ء تا ۱۹۴۷ء

☆ تیسرا دور ۱۹۴۸ء تا زوال تک

مارکسی نظریہ کے تحت لکھے جانے والے اکثر مضامین میں معاشرے کی غیر مساوی تقسیم دولت، غیر فعال اور مافوق الفطرت تصورات و احساسات کے خلاف افادی اور بامقصد ادب پیش کیا گیا۔ انحطاط، سقوطِ قلب ونظر اور بے راہ روی کو بھانپتے ہوئے عوام الناس کے عمل اور خیالات کو باہم مربوط کرنے میں ترقی پسند ادب کا اہم کردار ہے کیونکہ عمل کا فقدان حقیقت سے فرار کی بنا پر معاشرے میں ناسور کی طرح پھیل رہا تھا۔ لہٰذا اسی بنا پر آمریت نے اپنے خون آلود پنجوں میں رعایا کو جکڑ کر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑنے شروع کردیئے۔ بھوک، افلاس، فاقہ کشی پر عوام مجبور ہوگئے۔ غلام اور ذلت اُن کا مقدر بن چکی تھی غریب مزدور عوام کی محنت و مشقت اوران کی ساری دولت حیلہ باز سرمایہ دار ہڑپ کر جاتا تھا۔ ساجد اپنے مضمون ''نظریہ اشتراکیت مناظرہ کی روشنی میں'' اپنا نقطہ نظر یوں واضح کرتے ہیں:

''طبقات افرادِ انسانی کے وہ گروہ ہیں جن میں سے ہر ایک گروہ معاشرتی نظام کی مقرر کردہ مختلف حیثیتوں کے مطابق، دوسرے گروہوں کی محنت و مشقت کے نتائج پر قبضہ کرلیتا ہے۔''[۱۳]

کال مارکس کی فلاسفی نے اشتراکی ادب کی بنیاد رکھی۔ اشتراکی ادب بیمار ذہنیت کو توانائی اوراعتماد ادا کرتا ہے وہ فطرت کا میکانکی نقطہ نظر کا مطالعہ کرتا ہے اوریہ صرف سیاسی اورگروہو ہی موضوعات کا احاطہ ہی نہیں کرتا بلکہ زندگی کے ہر پہلو کا احاطہ کرتا ہے۔ یہ ادب فردِ واحد کی قوت اور صلاحیت کا ادراک کر کے جبری و استحصالی قوتوں کا سدباب کرنے میں مددگار و معاون ثابت ہوتا ہے۔ ایسا ادب عوام اور محنت کشوں میں جدوجہد کا شعور بھی اُجاگر کرتے ہوئے عزتِ نفس سے آگاہی دیتا ہے۔ ان ادیبوں کے محبوب موضوعات معاشی ناانصافی، سرمایہ داری، مشینیں، مزدور، بھوک و افلاس، بغاوت و انقلاب ہیں۔ ان ادباء نے سماج اور معاشرت کی کمزوریوں اور ناانصافیوں، محرومیوں کی عکاسی کرتے ہوئے سیاسی و ادبی شعور کو بھی اپنے مضامین میں اُجاگر کیا۔ صادق الخیر اپنے مضمون ''میکیسم گورگی ہمارے لیے ایک مثالی نمونہ'' میں ترقی پسند تحریک کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''ترقی پسند مصنفین کی انجمن'' کا مقصد اولی یہ ہے کہ وہ ایسے ادب کا تحفظ اور ترویج

وتوسیع کرے جو زندگی میں تڑپ، روح میں بیداری، دل و دماغ میں علوہمتی و عالی
حوصلگی اور خیالات میں استواری پیدا کرسکے۔ ہم اُس ادب کو ترقی دینا تو کیا شاید
کچل دینے پر تیار ہو جائیں جو ہم میں کاہلی، تنگ نظری، پست ذہنی، جذبات اسفل
اور طمع و حرص پیدا کرے بغور جس میں عمل کا فقدان ہو۔"[۱۴]

سجاد ظہیر نے ترقی پسند تحریک کی بنیاد رکھی۔ وہ اشتراکیت کے حامی تھے اور ترقی پسند ادب کے ذریعے غریب و مفلوک الحال طبقے کی عکاسی کرنے کے خواہاں تھے۔ وہ اپنی ذہانت اور جستجو و تحقیق کی بنا پر تنظیمی مصروفیت کے باوجود تنقیدی مضامین لکھنے میں کامیاب ہوگئے۔ "اُردو کی جدید انقلابی شاعری" "نیا ادب" اور "عصرِ محض" ادب لطیف میں شائع ہوئے اس کے علاوہ "روشنائی" اور "ذکر حافظ" میں بھی اُن کے تنقیدی خیالات ملتے ہیں۔ اُنہوں نے مارکسزم میں ڈوبنے کی بجائے مارکسزم کے ساتھ ساتھ مشرقی اقدار کو بھی ساتھ ساتھ رکھا۔ سجاد ظہیر کے ہاں فرد واحد کے احساسات کا پرتو بھی جھلکتا ہے تو اجتماعی تفکرات اور سماجی اقدار کا عکس بھی ملتا ہے۔ جہاں ادب زندگی کا قرینہ اور سلیقہ سکھاتا ہے وہاں زندگی کے نئے امکانات سے ادب میں نئی جہات کا آغاز بھی ہوتا ہے۔ سجاد ظہیر نے انہیں جہات کو مطمع نظر بنایا اور ذہنی بیمار اور پست تصور حیات رکھنے والے افراد کو اپنی تحریروں سے مثبت سوچ عطا کی۔ انہوں نے غفلت کی جگہ بیداری کی لہر سے نوازا۔ ہندوستان کے ذہین اور جدید خیالات کے لوگوں کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کر کے حقیقی ادب کا پرچار کیا۔ ایسا ادب جو انسان کو حرمت اور محنت کی عظمت کا قائل ہو۔ جو ادبی انقلاب کے توسط سے سیاسی انقلاب کا حامی ہو۔ سجاد ظہیر کی تحریروں اور اجلاسوں میں کی جانے والی تقریروں نے اُن کے مارکسزم اور لینن ازم کے خیالات سے آگاہ کیا۔ اُن کے نزدیک ادیب کا قلم اگر مختلف طبقوں کی کشمکش اور مسائل کی صداقت وحقیقت سے پیش کر کے معاشرے کی ناانصافیوں، محرومیوں کو اُجاگر کرے تو اس سے معیاری ادب کی جڑیں بھی مضبوط ہونگی اور سماج میں کھوکھلی حاکمیت، آمریت کی بیخ کنی بھی ہوسکے گی۔ سجاد ظہیر روشنائی میں ترقی پسند تحریک کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"ترقی پسند ادراک اندرونی اور بیرونی نظریاتی اور عملی، روحانی اور مادی دونوں
میدانوں میں رجعت اور ارتقاء کی قوتوں اور ان کے مختلف مظاہرے کے پیہم
مجاہدے اور مجادلے میں حصہ لینے اور اس کے تجربوں سے صحیح نتیجے اخذ کرنے کا دوسرا
نام ہے۔ اس لیے کسی خاص وقت یا فرد میں اس کی حد معین نہیں کی جاسکتی یہ

ادراک ایک ارتقا پذیر شے ہے۔"۱۵؎

ڈاکٹر عبد العلیم کا مقالہ "اُردو ادب کے رجحانات پر ایک نظر" میں نئی ادبی تحریک پر اس کے پس منظر کے حوالے سے بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے۔ مزدوروں، کسانوں کی سیاسی و اقتصادی جدوجہد اور تحریک نے عوام الناس کو ذہنی بالیدگی عطا کی۔ انسان دوستی کا جذبہ اُبھرا۔ مسائل کو قریب سے دیکھنے کا رجحان پیدا ہوا۔ جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کی جڑوں کو کھوکھلا کرنے کے منصوبے بنائے جانے لگے۔ جذبات اور تصورات کے بھنور میں پھنسے ہوئے لوگوں کو ساحل مراد نصیب ہوا۔ تو اُنہوں نے روٹی، کپڑا اور مکان کا نعرہ لگایا۔ زندگی کی قدر و منزلت سے آگہی ہوئی۔ جبکہ "مارکسزم اور ادب" میں ڈاکٹر عبد العلیم مارکس اور انگلیز کے حوالے سے مارکسزم کی وضاحت کر کے مارکسزم کے مسخ شدہ تصور کی تصحیح کرتے ہیں۔ مارکس نظریہ جمالیات سے متفق نہیں ہے لیکن ادب میں ایسی جمالیات کی شمولیت کو صحیح قرار دیتا ہے۔ جو سماج کی کشمکش و تضادات کی عکاس کرے۔ ٹیگور نے ادب اور انسانیت کی رفاقت کو اہم گردانا ہے۔ ڈاکٹر عبد العلیم اپنے مضمون "مارکس تنقید" میں مارکسزم کے حوالے سے کہتے ہیں کہ بہترین ادب وہ ہے جو صداقت کے ساتھ حقیقی تجربات کی حقیقی عکاسی کرے اور موضوع و ہیئت لازم و ملزوم ہیں اور ان کی علیحدگی فن پارے کی قدر کھو دیتی ہے۔ مادرائیت سے ہٹ کر انسان، آرٹ، سائنس پر صداقت و حقیقت کے دائرے میں بات کرنا مارکسزم سے فیض احمد فیض اپنے مضمون "طرزِ بیان اور مضمون شعر" میں جو ادب لطیف میں اگست ۱۹۴۷ء میں شائع ہوا اس میں شعر کی اہمیت اور صداقت کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> "شاعرانہ طرزِ بیان کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ مضمون پڑھنے والوں تک زیادہ سے زیادہ موثر طریقہ سے پہنچے اور اس کی کامیابی مضمون کی خوبی پر منحصر سے دائمی قیمت مضمون یا زندگی کے بنیادی تجربات کو حاصل ہے۔"۱۶؎

ارتقائے تاریخ نے سماجی عمل کو تیز تر کر دیا یوں شعر کا حسن صرف جذباتی اور لفظیاتی سطح کا مرہون منت نہیں رہا۔ بلکہ حقیقی موضوعات ہی شعر کا حسن گردانا جانے لگا اس طرح بورژوا اور پرولتاری تضاد و جنگ کی عکاسی ان مضامین کے ذریعے کی جانے لگی جس نے شعر و ادب کا ڈھانچا ہی تبدیل کر دیا۔

فیض اپنی ساری صلاحیتوں کو مجتمع کر کے ترقی پسند تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے اور مختلف اہم ادبی شخصیات سے ترقی پسند تحریک کے ممبران کا تعارف کرانے کے ساتھ ساتھ اپنے مضامین مختلف رسائل میں بھی شائع کرواتے رہے۔ نئے نئے خیالات اور نئے ادبی رجحانات فیض کی تحریروں کا مرکز بنے

ادب لطیف میں چھپنے والا مضمون ''ہماری تنقیدی اصطلاحات'' غالب کی لفظی حسن کاری سے قائل ہونے والے قاری و ادباء کی توجہ غالب کی مضمون آفرینی کی طرف بڑی ذمہ داری عقلی دلائل اور معاشرتی و سماجی خدوخال کی وضاحت سے ہوں دلاتے ہیں۔

> ''شاعر یا لکھنے والے کی منزل تو اُس کا مضمون، یا خیال، ہی ایک آلہ ہے اور ہر راستے یا آلے کی طرح اُس کا حسن و عیب اضافی ہے، ہم کسی شاعر کو اس کی تشبیہوں اوراستعادہ کی وجہ سے مستحسن یا مذموم قرار نہیں دے سکتے۔ نہ کوئی شاعرِ محض ان کے اٹاٹے پہ ہمیشہ زندگی رہ سکتا ہے ادب برائے ادب کی طرح تشبیہ برائے تشبیہ یا استعارہ برائے استعارہ غلط اور گمراہ کن نظریہ ہے۔'' ۱۷

احتشام حسین کی تحریریں اُن کے اشتراکی رجحان کی نمائندگی کرتی ہیں۔شعر و ادب پر تنقید اُن کا محبوب موضوع تھا۔ وہ لسانیات سے بھی کافی شغف رکھتے تھے۔ ان کے موضوعات میں تنوع نظر آتا ہے۔ انہوں نے نئے ادبی رجحانات، ادب اور اخلاق، تنقید اور عملی تنقید، نقدِ ادب ناقد کی اہمیت فرائض، ادبی تنقید، نیا ادب اورترقی پسندی و دیگر تنقیدی موضوعات اپنے لیے چنے، جن کے ذریعے تنقید کی غرض و غائیت اوراُصول پر سیر حاصل روشنی پڑتی ہے۔انہوں نے تنقید کو ماحول ہی سے ہم آہنگ نہیں کیا بلکہ تنقید کی اشتراکی رویے کو بھی واضح کیا۔ تاثراتی تنقید نے اس دور میں اُردو ادب کو مضمحل کردیا تھا۔ احتشام حسین نے تنقید کو رومانوی اثرات سے نکال کر اعتدال وتوازن عطا کیا سماج و ادب کو گہرے اٹوٹ رشتے میں سمویا۔اور شاعر یا ادیب کے فن پارے کا مطالعہ اس کے ماحول، عہد اورسماج کے حوالے سے کیا۔ اورتنقید کا رشتہ انسانیت کے جوڑتے ہوئے سائنٹفک تنقید کا آغاز کیا۔ احتشام حسین نے ہیئت اورمواد کے موضوع کے حوالے سے جو بھی تحریر کیا اس میں اس بات کا خیال رکھا کہ شاعر یا ادیب کے فن پارے کے موضوعات کی بہ نسبت لفظی حسن کاری سے کیا اور کس قدر اہمیت ہے؟ اگر مواد یا موضوع کمزور ہے اگر وہ فن پارے معیار نقد پر پرکھا جائے تو وہ معیاری نہیں کہلائے گا کیونکہ سماج کے حقائق اور معاشرتی رجحانات ہی ادب کے اصل موضوعات ہیں۔ احتشام حسین اپنے مضمون ''ادبی تنقید'' میں لکھتے ہیں:

> ''انسان کی معاشی معاشرتی زندگی ایک تصوراتی ڈھانچہ بھی تیار کردیتی ہے اور طبقاتی کشمکش میں زندگی کے بنیادی عناصر اورظاہری تمدنی ڈھانچہ کے درمیان خاص قسم کے تعلقات پیدا ہو جاتے ہیں، نقاد کے لیے اس تعلق کا پتہ لگانا ضروری ہے۔ کیونکہ



انفرادی، طبقاتی یا اجتماعی نفسیات کی حقیقت دونوں کے تعلق اور تناسب کو سمجھے بغیر
اچھی طرح سمجھی نہیں جاسکتی یہ تعلق طریق پیداوار و تقسیم میں تغیر پیدا ہونے کی وجہ
سے بدلتا رہتا ہے۔" ۶۸

"جدید اُردو شاعری اور سماجی کشمکش" بھی ان کے مضامین کے مجموعے "روایت اور بغاوت" میں شامل ہے۔ جس میں اُردو شاعری کے رجحانات اور سماج کے تغیر و تبدیل کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ ان رجحانات کے تغیر و تبدل پر احتشام حسین نے کڑی اور گہری تنقید کی ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعض موضوعاتِ ادب کی پرورش احتشام حسین کے نزدیک سماجی حالات، واقعات اور ان حالات وواقعات کے اثرات نے کی۔ احتشام حسین نے اصلاحی ادب کی داغ بیل ڈالی ایسا اصلاحی ادب جو ترقی پسندی کا رجحان اپنے اندر سموئے ہوئے تھا اور افادیت اور مقصدیت جس کا محور تھا۔

بیسویں صدی میں معاشرتی کشمکش اور نفسیاتی پیچیدگیوں کو شعراء نے اپنی شاعری کے موضوعات کے لیے چنا جن میں سوچ و تفکر اور انفرادی رنگ کے ساتھ ساتھ اجتماعی شعور بھی جھلکنے لگا غلامی سے نجات اور معاشی آزادی کی تڑپ جاگی تو پر فریب خواب انگیز نثر کو لکیر فراموش کر کے معاشی جدوجہد مادی ضرورتوں اور محرومیوں پر کھا جانے لگا۔ جنگ عظیم کے بعد کے حالات نے زندگی اور اُسکے تضادات مسائل جیسے موضوعات کی طرف شعراء نے توجہ دی یوں ترقی پسند تحریک کا موضوع انسان اور انسان کے مسائل بنے۔ احتشام حسین دوسری جنگ عظیم کے بعد کے حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس وقت جنگ سے بڑی حقیقت ہے۔ ہمارا سماج بدلے گا، ہمارا اقتصادی نظام
بدلے گا، ہم خود بدلیں گے، ہمارا شعور اور ادراک بدلے گا، ہماری شاعری اور ادب
بدلے گا۔ اس لیے اس کا سمجھنا ضروری ہے۔ وہ شعراء جو اس کے قائل نہیں کہ سماج
شاعری سے الگ کوئی غیر مادی چیز ہے وہ تو لازمی طور پر سوچنے اور سمجھنے پر مجبور
ہوں گے۔" ۶۹

احتشام حسین نے اپنے موضوعات میں مارکسی نظریات کو جابجا شامل کیا ہے۔ انہوں نے فن پارے کے تجزیہ میں اس دور کے اقتصادی و طبقاتی تصادم پر گہری نظر ڈالی۔ احتشام حسین نے مارکسی نظریات کو کہیں کہیں مبالغے کی حد تک اپنے مضامین کی بنیاد بنایا یہ اُن کی مارکسزم سے لگاؤ کا نتیجہ ہے۔

بیسویں صدی نے ادب کی نئی قدروں سے قاری کو روشناس کرایا۔ ترقی پسند تحریک کی شاخیں برصغیر

پاک وہند کے کونے کونے میں پھیل گئیں اور ترقی پسند نظریے نئے سماج کی تشکیل کے لیے کوشاں ہوئے۔ بنگال، بمبئی، احمد آباد، پٹنہ، لاہور و دیگر شہروں میں انجمن کی سرگرمیاں بڑھ کی گئیں۔ پریم چند کی ترقی پسند تحریک سے وابستگی نے اُن کے ترقی پسند خیالات سے قاری کو آگاہی دی۔ پریم چند افادی ادب کو ہے اعلیٰ ادب قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں:

> "ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اُترے گا جس میں تفکر ہو، آزادی کا جذبہ ہو، حسن کا جوہر ہو، تعمیر کی روح ہو، زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو، جو ہم میں حرکت ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے۔سلائے نہیں۔کیوں کہ اب اور زیادہ سونا موت کی علامت ہوگی۔"۷۰

George Steiner اپنی کتاب "Language an Slience" میں لکھتا ہے:

"The Marxist Ssensibility has contributed a sociological awareness to the best of modren criticism."۷۱

ترقی پسند ادب کے تحت جو ادب لکھا جاتا رہا اس میں لنین کے اس قول کو بھی مدنظر رکھا گیا:

> "لوگوں کیلئے سب سے پہلے کھانے، پینے، پہننے اور رہنے کا انتظام ہونا چاہیے۔اس کے بعد وہ اپنی توجہ آرٹ، سائنس اور مذہب کی طرف مبذول کر سکتے ہیں۔"۷۲

ترقی پسند ادب کے شاخسانہ فرانس کے نقاد طین(Tain) کے ہاں نظر آتے ہیں جو ادب کو انسانی حیات، اس کے عہد اور ماحول کا عکاس قرار دیتا ہے جبکہ سا جو (Sainte Beuve) کے نزدیک مصنف کا اس کے عہد کے سماجی، معاشی، تہذیب ماحول کے حوالے سے تجزیہ کر کے مصنف کے فن پارے کا تجزیہ کرنا ہی نقاد کا مطمع نظر ہونا چاہیے۔اسی لیے وہ ہی ادب عوامی ترقی پسند ادب قرار پاتا ہے جو عوامی اُمنگوں، آرزوؤں اور مصائب و آلام کو مدِنظر رکھ کر لکھا جائے۔اور تکنیکی و سائنسی طریقہ کار سے کسی بھی فن پارے کا تجزیہ کرے۔ادب زبان، ہیئت اور مواد کا مجموعہ ہے۔زبان کی جڑیں اپنی سرزمین میں مضبوط ہوا کرتی ہیں۔ کسی بھی ادب کی ہیت یا فارم اس ادب کے عہد کے مزاج اور اقدار کی عکاس ہوتی ہے اور موضوع ادب کا وہ اہم رکن ہے جس نے اعلیٰ ادب کو "عالمی ادب" کے زمرے میں لاکھڑا کیا ہے۔کسی بھی ملک کا اعلیٰ ادب وہ ادب کہلاتا ہے جو دنیا کے دیگر ادب سے ہم آہنگی رکھتا ہے۔اس لیے ترقی پسند ادب جس کے موضوعات میں تنوع ہے زبان اور ہیئت کو مستحکم، زندہ اور متحرک رکھتا ہے۔ترقی پسند ادب کے تحت برصغیر پاک و ہند

میں جو بھی مضامین لکھے گئے ان کے موضوعات خیالی، پر فریب دُنیاؤں کے رنگین، پر کشش پس منظر میں نہیں لکھے گئے بلکہ عالمی کساد بازاری، بے روزگاری، حاکم و محکومیت کے تضادات و تصادم اور طبقات و گروہو کی چپقلش کو مدِنظر رکھ کر لکھے گئے۔ اسی لیے ترقی پسند ادب کے موضوعات کو عالمی سطح پر آفاقیت ملی۔ ترقی پسندوں نے ادب اور معاشرے کے مستحکم رشتہ کی صداقت کو نہ صرف سمجھا بلکہ ایک امانت سمجھ کر اس کی آبیاری بھی کی عزیز احمد نے اپنی کتاب ''ترقی پسند ادب'' میں پہلی بار ترقی پسند ادب کی وضاحت کی ہے۔ پہلے یہ کتاب رسالہ اُردو میں شائع ہوئی بعد ازاں کتابی صورت میں منظر عام پر آئی۔ عزیز احمد مارکس نظریے کے ساتھ ساتھ مشرقی اخلاق و اقتدار کی پاسداری کو بھی ترقی پسند ادب کا خاطہ بتاتے ہیں۔ انہوں نے ترقی پسند تحریک کی وضاحت اور پس منظر کو بھی واضح کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''ترقی پسند تنقید کا اہم ترین فرض یہ ہے کہ وہ سختی سے جدید تحریک کے ہر پہلو کا جائزہ لے ہر رجعت پسند رجحان کو جو قدامت پرستوں کے خوف سے اس انقلابی تحریک کے سائے میں پناہ لینا چاہت ہے۔ بیخ و بنیاد سے اُکھاڑ پھینکے۔''۴۷

سردار علی جعفری بھی ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے اُنھوں نے اپنی کتاب ''ترقی پسند ادب'' میں ترقی پسند تحریک اور اس سے وابستہ لوگوں پر سیر حاصل روشنی ڈالی ہے۔

حلقہ ارباب ذوق ''ایک ہمہ گیر تحریک'' تھی۔ اس تحریک نے جدید اور نئے خیالات و موضوعات سے اردو ادب کو متعارف کرایا۔ حلقہ ارباب ذوق کی ابتداء اپریل ۱۹۳۹ء کو ہوئی۔ شیر محمد اختر اور نصیر احمد جامعی نے باہمی مشورے سے اس حلقے کی بنیاد کا منصوبہ بنایا۔ حلقہ ارباب ذوق کا اجلاس نصیر احمد جامعی کی رہائش گاہ پر ہوا اور ''بزم داستاں گویاں'' کے نام سے ابتداء کرنے والے اس حلقہ نے کئی نامور ادیب و شاعر اپنے گرد اکٹھے کئے۔ اکتوبر ۱۹۳۹ء میں اس کا نام تبدیل کر کے حلقہ ارباب ذوق رکھ دیا گیا۔ میرا جی اس حلقہ کے اہم رکن تھے۔ میرا جی کی تجویز پر حلقہ میں کسی ادیب یا شاعر کی تخلیقات پر فن نقد کے اصولوں کے مطابق بحث کی جاتی اور یوں ہر فن پارہ اپنے لیے نئے تنقیدی اصول و قواعد ساتھ لے کر آتا اور اس طرح حلقہ میں ہونے والی تنقید نے تنقید کے جدید تقاضوں سے تخلیقات کو متعارف کرایا۔ اردو زبان کی ترقی و اشاعت، نوجوانوں کی حوصلہ افزائی، اردو ادب کی بے لوث خدمت لکھاریوں کا تحفظ اور اردو ادب و صحافت کے لیے سازگار ماحول مہیا کرنا۔ حلقہ کے اغراض و مقاصد مندرجہ ذیل تھے۔

حلقہ ارباب ذوق اردو ادب، اردو زبان کی آبیاری کرنے کے ساتھ ساتھ نوآموز لکھاریوں کی تربیت



وحوصلہ افزائی بھی کرتا رہا۔ اُردو زبان کی علاقائی زبان و ادب اور تہذیبی و تمدنی ماحول سے روشناس بھی کراتا رہا۔ تنقید کے نئے اور جدید اصولوں کے تحت تخلیقات کو پرکھتا بھی رہا۔ ''حلقہ ارباب ذوق'' کی تحریک کو متحرک اور فعال بنانے میں میرا جی کا نمایاں کردار تھا۔ میرا جی اس ''حلقہ'' میں ریڑھ کی ہڈی کی مانند تھے اور حلقہ کے منتظم ہونے کے ساتھ ساتھ اس حلقہ کے اصول و قواعد بھی مرتب کیے۔ ڈاکٹر انور سدید ''اردو ادب کی تحریکیں'' میں حلقہ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''میرا جی کی شمولیت کے بعد ''حلقہ ارباب ذوق'' نے نہ صرف اجتہاد اور ترقی کی طرف قدم بڑھایا بلکہ اس نے ترقی پسند تحریک کی مقدمیت کے خلاف ردعمل بھی ظاہر کیا اور اس کی یکسانیت کے مقابلے میں تنوع پیدا کرنے کی کوشش بھی کی۔''۴؎

میرا جی نے مغرب کے شعراء مثلاً میلارمے، لارنس وغیرہ کا مطالعہ کررہا تھا اس لیے حلقہ ارباب ذوق میں پڑھے جانے والے مقالوں اور مضامین پر نہ صرف صحت مند تنقید کرتے بلکہ ان مضامین کی خامیوں سے بھی ادباء و شعراء کو آگاہ کرتے۔ حلقے کے لکھنے والوں میں سجاد باقر رضوی کا بھی نمایاں نام تھا۔ سجاد باقر رضوی ادب و تنقید، فکر و عمل کے مابین متوازن رویہ اختیار کرتے۔ مناسب الفاظ سے اپنی تنقید کو سہارا دیتے اور تخلیقی ذہن کی آبیاری کرتے اور غیر تخلیقی ذہن کی حوصلہ شکنی کیا کرتے۔

''حلقہ ارباب ذوق'' نے لکھاریوں کی تربیت کی۔ انہیں شعر و نظم، افسانہ و کہانی، تنقید و تخلیق لکھنا سکھایا حلقہ سے وابستہ لکھاریوں نے آگے چل کر نامور ادیب و شعراء بے۔ حلقہ ارباب ذوق ادب برائے زندگی کا نعرہ لگانے کے ساتھ ساتھ اس حلقے کے ذریعے ادب برائے ادب کے نظریے پر بھی عمل کیا یوں حلقہ ارباب ذوق نے ادب اور زندگی کے اصول اور جمالیاتی اقدار کو بھی مدنظر رکھ کر تخلیقات پیش کیں اور یوں حلقہ میں کسی بھی موضوع کو زیر بحث لایا جاتا۔ شہزاد احمد حلقہ ارباب ذوق کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''حلقہ ارباب ذوق ادبی اور فکری سطح پر ایک جمہوری ادارہ ہے۔ جہاں زندگی کے بارے میں کسی بھی نظریے کو بحث میں لایا جاسکتا ہے۔''۵؎

حلقہ ارباب ذوق کے موضوع میں جدت کے ساتھ ساتھ بوقلمونی تھی۔ تراجم بھی حلقہ ارباب ذوق کے ذریعے کیے گئے۔ حلقے میں تنقید برائے تنقید نہیں کی جاتی تھی بلکہ اس بات کو اہمیت دی جاتی تھی کہ ہر فن پارہ اپنے لیے نئے قواعد اور نئے اصول نقد لے آتا یوں حلقہ میں ہونے سے تنقید محدود نہیں رہی بلکہ

تنقید کی نئی جہتیں منظر عام پر آئیں۔ حلقہ ارباب ذوق کے تحت خارجیت کی جگہ داخلیت پر زور دیا جاتا رہا اور حلقہ کے لکھاریوں نے دھیمے اور ملائم لہجے میں بات کی۔ حلقہ ارباب ذوق کے توسط سے نہ صرف جدید اور متنوع موضوعات سامنے آئے بلکہ ان موضوعات کے اظہار کے بھی متنوع رنگ اجاگر ہوئے۔

ترقی پسند تحریک کے تین سال بعد حلقہ ارباب ذوق کا آغاز ہوا اور اسی لیے اکثر ناقدین حلقہ ارباب ذوق کو ترقی پسند تحریک کے خلاف ردعمل سمجھتے ہیں دونوں میں خاصا فرق ہے لیکن دونوں ہی انسان کے دکھ درد پر متفق ہیں۔ اور دونوں کا موضوع انسان، انسانیت اور انسان کی زندگی کے نشیب و فراز ہے۔ بس فرق یہ ہے کہ ترقی پسند تحریک خارجیت پر زور دیتی ہے اور حلقہ ارباب ذوق داخلیت کی نمائندگی کرتا ہے۔ پروفیسر سعدیہ شفقت ترقی پسند تحریک اور حلقہ ارباب ذوق میں حلقے کے حوالے سے لکھتی ہیں۔

> "حلقہ ارباب ذوق کا پسندیدہ لب ولہجہ علامتی ہے۔ حلقے کے شعر ونثر میں علامتوں کی رنگا رنگ قسمیں موجود ہیں۔"۲۶

حلقہ ارباب ذوق اپنے عہد کے لکھاریوں کے تخلیقی ذوق کی نشوونما اور نمود میں اہم اور نمایاں کردار ادا کرتا رہا نیز نوشق ادیبوں میں تخلیقی ذوق بھی ابھارتا رہا۔ لیکن لفظی بازیگری سے حلقہ ارباب ذوق نے ہمیشہ اجتناب کیا۔ حلقہ ارباب ذوق زوال آمادہ سماج و معاشرے کے تلخ اور کسمپرسی کو ادبی حسن میں پرو کر قاری کے سامنے پیش کرتا ہے اور زندگی کے تضادات اور انتشار کو علامتی انداز میں پیش کرکے ادب برائے ادب کا ترجماں بھی بنا۔ میرا جی حلقہ کے ایک اہم رکن تھے ان سے پہلے تنقید ناتراشی کرتی تھی۔ جس کا ذکر ہم پہلے بھی کر چکے ہیں میرا جی نے حلقہ میں تنقید کے معیار کو بلند کیا جس کے حوالے سے ڈاکٹر رشید امجد اپنی کتاب "میرا جی شخصیت اور فن" میں لکھتے ہیں:

> "میرا جی کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے نہ صرف تنقیدی گفتگو سے حلقہ کی تنقید کو ایک معیار عطا کیا بلکہ بہت سے نوجوانوں کو تنقید کرنے پر آکسایا اور ساتھ ساتھ تنقید برداشت کرنے کا ظرف سکھایا اس کے علاوہ انہوں نے تجربے کی اہمیت اور ہیئت و تکنیک کی تبدیلیوں کی اہمیت کو بھی اجاگر کیا۔"۲۷

حلقہ ارباب ذوق اور ترقی پسند تحریک میں اختلافات بھی نظر آتے ہیں اور دونوں تحریکیں ایک دوسرے کے متوازی بھی چلتی رہی۔ ترقی پسند تحریک خارجیت پر اور حلقہ ارباب داخلیت پر زور

دیتے رہے۔

حلقہ میں جو مضامین پڑھے گئے ان میں سے چند ایک کی فہرست سعدیہ شفقت نے ترقی پسندوں کی صدارت کے حوالے سے پیش کی ہے میں چند ایک کے نام لکھنا چاہوں گی۔ سید نصیر احمد کا مضمون ''پریم چند کی افسانہ نگاری'' پر حلقے سے دسمبر ۱۹۳۹ء گفتگو کی گئی۔ رفیق خاور کا مقالہ ''کیا اقبال ترقی پسند مفکر تھا'' جولائی ۱۹۴۱ء میں پیش کیا گیا۔ ظہیر کاشمیری کا مقالہ ادب اور معاشرہ فروری ۱۹۴۶ء میں پڑھا گیا۔ ان مقالوں سے ہم اس بات کا نتیجہ اخذ کرسکتے ہیں کہ حلقہ ارباب ذوق کی مجلسوں تک ترقی پسند ادیب کی رسائی تھی وہ بھی اپنے مقالات وہاں پڑھ کر لطف و سرور محسوس کرتے تھے۔ حلقے کے لکھنے والوں میں آفتاب احمد، فیض احمد فیض، مختار صدیقی، رفیق خاور، میرا جی، صلاح الدین احمد، یوسف ظفر و دیگر ارباب نشت شامل تھے۔ حلقہ ارباب ذوق کے اکثر ادیب فرائیڈ سے متاثر تھے۔ ریاض احمد، میرا جی دیگر احباب انسان کی نفسیاتی الجھنوں پر بحث مباحثہ بھی کرتے تھے اور تنقیدی مسائل پر ان کی نگارشات بھی ملتی ہیں۔ سعدیہ شفقت حلقہ ارباب ذوق کے حوالے سے اپنی رائے کا یوں اظہار کرتی ہیں:

> ''حلقہ ارباب ذوق میں ابتداء ہی سے انسانی نفسیات کے مختلف رخوں کا جائزہ لینے کا رجحان ملتا ہے۔''۸ے

حلقہ ارباب ذوق کہیں کوئی خاص موضوع نہیں چنا جاتا تھا بلکہ کسی بھی موضوع پر بحث کی جاتی تھی اور حلقہ کا کوئی خاص نظریہ بھی نہ تھا بلکہ کسی بھی موضوع پر بحث کی جاتی تھی اور حلقہ کا کوئی خاص نظریہ بھی نہ تھا ہر موضوع اور ہر نظریہ پر ''کچھ تو کہیے'' میں اظہار خیال کرنا ضروری ہوتا تھا یونس جاوید حلقہ ارباب ذوق کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''حلقہ ارباب ذوق نے ان ادیبوں کی ابتدائی شہرت اور ساکھ بنانے میں بڑا کام کیا۔ ان لکھنے والوں کے نزدیک جو حلقہ ارباب ذوق سے وابستہ تھے معاشرہ اور خرد دونوں یکساں اہمیت کے حامل تھے۔ صرف یہی نہیں بلکہ حلقہ ارباب ذوق کے نزدیک ہر لکھنے والے کو یہ حق پہنچتا تھا کہ وہ ذات کے حوالے سے کائنات کا احاطہ جس طرح جس رخ سے چاہے کرے اور ایسی اقدار کو اسی انداز سے سامنے لائے جس سے عالمگیر انسانیت سے ہمدردی اور روح کی بالیدگی کی صورت پیدا ہو۔''۹ے

مختصر یہ کہ حلقہ ارباب ذوق'' اردو ادب میں نئی ہیئت اور جدت کا آغاز کیا۔ متنوع موضوعات پر

صحت مند بحث کا سلسلہ شروع کیا۔ معیار تنقید کو بلند کیا۔ حلقہ سے وابستہ لوگ آگے چل کر نامور ادیب و شعراء سے اور اردو ادب میں حلقہ ارباب ذوق کی خدمت کو نہ صرف سراہا جاتا رہے گا بلکہ تاریخ اردو ادب میں اس تحریک کو یاد بھی رکھا جائے گا۔ حلقہ کے حوالے سے فیض کا یہ شعر یہاں کس قدر اور کتنا اہم لگتا ہے۔

ہم پرورش لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دل پر گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے

حواشی

۱۔ علامہ اقبال ، ''مقالات اقبال'' مرتبہ : عبد الواحد معینی، سید ،محمد عبد اللہ قریشی، لاہور: آئینہ ادب ، بار دوم ۱۹۸۸ء ص: ۳۸،۳۷

۲۔ ایضاً، ص:۷۵

۳۔ غلام حسین ذوالفقار ''اقبال کا اسلوب نگارش'' جرنل آف ریسرچ پنجاب یونیورسٹی لاہور، جنوری ۱۹۷۶، ۱۹۷۷ء ص: ۲۳،۲۲

۴۔ علامہ اقبال ''مقالات اقبال'' مرتبہ ،عبد الواحد معینی، سید، محمد عبد اللہ قریشی، لاہور: آئینہ ادب ،بار دوم ۱۹۸۸ء ص:۷۵

۵۔ عبادت بریلوی ،ڈاکٹر ،''اقبال کی اردو نثر'' لاہور:مجلس ترقی ادب ، طبع اول ،نومبر ۱۹۷۷ء ،ص: ۱۹۷

۶۔ علامہ اقبال ''دیباچہ پیام مشرق'' مشمولہ ''مقالات اقبال'' مرتبہ ،عبد الواحد مغنی، سید ،محمد عبد اللہ قریشی، لاہور: آئینہ ادب ، انارکلی ،بار دوم ۱۹۸۸ء ص: ۲۴۸،۲۴

۷۔ Muhammad Muzaffar Mirza Prof, "Allma Iqbal as a Politician" "Jaurnal Iqbal" Jan, Dec, 2009, Volume 56, No.1-4 Bazam-i-Iqbal, Lahore. P, 12

۸۔ علامہ اقبال، ''مقالات اقبال'' مرتبہ ،عبد الواحد معینی، سید ،محمد عبد اللہ قریشی، لاہور: آئینہ ادب ،انارکلی، بار دوم ۱۹۸۸ء ص: ۳۵۵

۹۔ لیاقت علی چودھری، پروفیسر، ''اقبال کی لغوی ولسانی بحثیں'' وزیر آباد: اسد بشارت پبلیکشنز، ۲۰۰۳ء ص:۵۰۱

۱۰۔ علامہ اقبال، ''مقالات اقبال'' مرتبہ: عبد الواحد معینی، سید ،محمد عبد اللہ قریشی، لاہور: آئینہ ادب ،انارکلی، بار دوم ۱۹۸۸ء ص: ۳۰۲،۳۰۳

۱۱۔ Mahbub Murshid, Syed (Late) "The Pebbled Shore" Journal "Iqbal Bazam a Iqbal, Jan, Dec, 2009, Lahore, P, 26

۱۲۔ انور سدید، ڈاکٹر، ''اُردو ادب کی تحریکیں'' کراچی: انجمن ترقی اُردو پاکستان، سن، ص: ۱۹

۱۳۔ Peter. J. Kiston, "English literatures incontext", New York, Cambridge Press, 2008, Page: 329

۱۴۔ Athur compion Rickett, "A History of English Literature"...., London....., Thomas Nelson and sons, L-T-D, 1956, Page-292

۱۵۔ Paul Davies "Romanticisim & Exoteric Tradiation" Hudson, United State, Linidisfarne Books, 1998, Page 18

۱۶۔ عبدالودود، ڈاکٹر، ''اُردو نثر میں ادبِ لطیف''، لکھنو: نسیم بک ڈپو، بار دوم فروری ۱۹۸۰ء، ص ۳۷

۱۷۔ William Hazlit, "Romantic Critical Essay" Edited by David Bromwich, Cambridge university Press, New Rochelle, Melbourne, Sydney, 1987, Page 96.

۱۸۔ Peter, J, Kiston, "English literature in Context," New York, Cambridge Press, 2998, Page:336

۱۹۔ محمد حسین، آزاد، ''درباب نظم اور کلامِ موزوں''، ''مقالات آزاد''، مرتبہ: آغا محمد باقر، لاہور: مجلس ترقی ادب، طبع اول، فروری ۱۹۶۶ء ص:۱۹۸

۲۰۔ محمد اشرف خان، ''مولانا محمد حسین آزاد سمینار''، لاہور: گورنمنٹ کالج، یونیورسٹی، اپریل ۲۰۱۰، ص:۴

۲۱۔ غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر، ''تیرنگ خیال'' (حصہ اول دوم) لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ستمبر ۱۹۷۲ء، ص:۲۹

۲۲۔ ایضاً ص:۱۴۰

۲۳۔ سجاد باقر رضوی، ''مغرب کے تنقیدی اُصول''، لاہور: اظہار سنز، ٹیمپل روڈ، طبع دوم، اکتوبر ۱۹۷۱ء ص: ۱۲۲

۲۴۔ ایضاً، ص:۲۷۴

۲۵۔ عبد الحلیم شرر، مضامین شرر، لکھنووی، جلد اوّل (حصہ اوّل) مضامین شاعرانہ و عاشقانہ، مرتبہ: مبارک علی، شاہ گیلانی، لاہور: مرکنٹائل پریس، سن ندارد، ص:ا

۲۶۔ ایضاً، ص: ۶۹۸

۲۷۔ ایضاً، ص: ۷

۲۸۔ ایضاً، ص: ۵۰

۲۹۔ محمد عالم خان، ڈاکٹر، ''اُردو افسانے میں رومانوی رُجحانات''، لاہور: علم و عرفان پبلشرز، سن ندارد، دیباچہ سن، اکتوبر ۱۹۹۸ء، ص:۶۶

۳۰۔ ابو الکلام آزاد، مضامینِ آزاد، مرتبہ: عبداللہ بٹ، لاہور: قومی کتب خانہ، پہلی اشاعت ۱۹۴۴ء، ص:۴۲

۳۱۔ محمد حسین، ڈاکٹر، ''اُردو میں رومانوی ادب'' ملتان: کاروانِ ادب، ص:۳۵

۳۲۔ سجاد حیدر یلدرم، (انتخاب) قراۃ العین حیدر، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۰ء، ص: ۱۵۵

۳۳۔ سجاد حیدر، یلدرم، (انتخاب) قرۃ العین حیدر، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۰ء، ص:۲۱۱،۲۱۰

۳۴۔ عبد الودود، ڈاکٹر، اُردو نثر میں ادبِ لطیف''، لکھنو: نسیم بک ڈپو، بار دوم فروری ۱۹۸۰ء ص:۱۴۳

۳۵۔ سجاد حیدر یلدرم، (انتخاب) قراۃ العین حیدر، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص: ۹۰

۳۶۔ سجاد انصاری، ''نثرِ خیال''، لاہور: آئینہ ادب، انارکلی، بارسوم ۱۹۷۱ء، ص:۱۱۷،۱۱۶

۳۷۔ عبد الودود، ڈاکٹر، ''اُردو نثر میں ادب لطیف''، لکھنو: نسیم بک ڈپو، بارِ دوم، فروری ۱۹۸۰ء، ص ۳۳۱

۳۸۔ سجاد انصاری، ''نثرِ خیال''، لاہور: آئینہ ادب، انارکلی، بارِ سوم ۱۹۷۱ء ص: ۱۳۱

۳۹۔ ایضاً ص:۹۰

۴۰۔ خلیقی دہلوی، (مرتب) اختر شیرانی، کتاب منزل، فروری ۱۹۳۰ء ص:۶۶

۴۱۔ ایضاً ص:۱۰۱

۴۲۔ عبدالودو، ڈاکٹر، ''اُردو نثر میں ادب لطیف''، نسیم بک ڈپو، بارِ دوم، فروری ۱۹۸۰ء، ص:۳۲۷

۴۳۔ مجیب احمد خان، ''حجاب امتیاز علی حیات اور اُنکے کارنامے''، نئی دہلی: تخلیق کار پبلشرز، ۱۹۹۶ء، ص:۱۳۹

۴۴۔ حجاب امتیاز علی، ''ادب زریں''، دہلی: عصمت بک ڈپو، بار دوم، ۱۹۴۳ء، ص:۳۴

۴۵۔ عبدالعزیز فلک پیما، مرتب بشیر احمد، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۶ء، ص:۱۱۵

۴۶۔ ایضاً ص:۴۰،۳۹

۴۷۔ عبدالودو، ڈاکٹر، ''اُردو نثر میں ادب لطیف''، لکھنو: نسیم بک ڈپو، بارِ دوم فروری ۱۹۸۰ء، ص:۳۵۴

۴۸۔ جوش ملیح آبادی، اشارات، ''قزلباش دہلوی''، دلی: نگارشات، ایجنسی، اُردو بازار، سن ندارد، ص:۱۷۲۔۱۷۱

۴۹۔ ایضاً، ص:۳،۲

۵۰۔ جوش ملیح آبادی، ''مقالاتِ جوش''، مرتب: سحر انصاری، کراچی: اُردو محل پبلیشرز، اپریل ۱۹۸۲ء، ص:۳۵۷

۵۱۔ ایضاً، ص:۳۵۶

۵۲۔ Martin Travers, "Evropeon Literature from Romanticisim of Past modrnism, London, Newyork contiunom, 2001, page 12

۵۳۔ عبدالرحمٰن، بجنوری، ''مقالاتِ بجنوری''، مرتب: اشرف صدیقی، خلیل صدیقی، اسلام آباد: ڈاکٹر عبد الرحمٰن بجنوری ٹرسٹ، بار اول مئی ۲۰۰۴ء، ص:۹۸

۵۴۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، کراچی: قومی زبان، جلد ۸۲، نمبر ۷، جولائی ۲۰۱۰ء، ص:۲۱

۵۵۔ نیاز فتح پوری، علامہ، ''انتقادیات''، لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء، ص:۱۱۸

۵۶۔ ایضاً، ص: ۱۸۷

۵۷۔ Warter Peter "Essays on literature and Art", Edited by, Jennifer Uglow, London, Rowman and Littlefild, 1973, Page: 69

۵۸۔ عبدالودود،ڈاکٹر،''اُردو نثر میں ادب لطیف''،لکھنو:نسیم بک ڈپو،بار دوم فروری،۱۹۸۰ء،ص:۲۳۹

۵۹۔ تحسین فراقی،ڈاکٹر، ''عبدالماجد دریا آبادی احوال و آثار''، لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، طبع اول ۱۹۹۳ء،ص: ۱۵۷

۶۰۔ عبد الماجد،دریا آبادی، مولانا،''انشائے ماجد یا لطائف ادب''،لاہور: ادارہ علم و عرفان، طبع اول،۲۰۰۰ء،ص: ۲۰۲،۲۰۱

۶۱۔ اختر انصاری،اکبر آبادی،''افادی ادب''، دہلی: دلی پرنٹنگ ورکس، نقش اول،۱۹۴۱ء،ص: ۹۱

۶۲۔ سلیم اختر،ڈاکٹر،''تنقیدی دبستان''،لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۱۹۹۷ء،ص: ۱۷۷

۶۳۔ ساجد،''ادب لطیف''، مارچ ۱۹۳۸ء، جلد ۷،نمبر۱،ص: ۲۴۔

۶۴۔ صادق الخیری،ساقی،دسمبر۱۹۳۶ء، جلد ۱۴، نمبر۴،ص:۸۱

۶۵۔ سجاد ظہیر،سید، روشنائی،لاہور: مکتبہ اُردو، دوسری بار جنوری ۱۹۷۶ء،ص: ۳۱۴

۶۶۔ فیض احمد فیض،''ادب لطیف'' اگست ۱۹۴۱ء،جلد،شمارہ،ص: ۱۳

۶۷۔ فیض احمد فیض، ادب لطیف ماہنامہ، جنوری ۱۹۴۲ء، جلد ۱۴، شمارہ۵،ص: ۲۹

۶۸۔ احتشام حسین،''روایت اور بغاوت'' حیدر آباد: ادارہ اشاعتِ اُردو، دکن، طبع اول ستمبر ۱۹۴۷ء،ص: ۴۵

۶۹۔ ایضاً،ص: ۲۰۵

۷۰۔ پریم چند،''روشنائی'' سجاد ظہیر،سید، لاہور: مکتبہ اُردو دوسری بار جنوری۱۹۷۶ء،ص: ۹۷،۹۶

۷۱۔ George Steiner "Language and Silence", Essay 1958- 1966, Londons boston, Faber and Faber 1985, Page, 352

۷۲۔ لینن مشمولہ مضمون ساحر لدھیانوی، ادب لطیف، نومبر۱۹۴۲ء، جلد۱۳،شمارہ۲۰،ص: ۶

۷۳۔ عزیز احمد،''ترقی پسند ادب''، ملتان: کاروانِ ادب،اشاعت ۱۹۸۶ء،ص:۱۶۴

۷۴۔ انور سدید، ڈاکٹر''اردو ادب کی تحریکیں''، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان ۱۹۹۹ء،ص:۵۴۵

۷۵۔ شہزاد احمد، مشمولہ، ''مقالات حلقہ ارباب ذوق''، مرتب سہیل احمد خان، لاہور: پولیمر پبلی کیشنز، اشاعت اول جولائی ۱۹۹۰ء،ص: ۸۱

۷۶۔ سعدیہ شفقت، پروفیسر، ترقی پسند تحریک اور حلقہ ارباب ذوق، مماثلتیں اور اختلافات، لاہور: اظہار

سنز، اردو بازار اپریل ۲۰۱۰ء، ص: ۱۰۶

۷۷۔ رشید امجد، ڈاکٹر، ”میرا جی شخصیت اور فن“، لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، اشاعت اول ۱۹۹۵ء، ص: ۱۹۴

۷۸۔ سعدیہ شفقت، پروفیسر، ترقی پسند تحریک اور حلقہ ارباب ذوق، مماثلتیں اور اختلافات، لاہور: اظہار سنز، اردو بازار اپریل ۲۰۰۰ء، ص: ۹۴

۷۹۔ یونس جاوید، ڈاکٹر، ”حلقہ ارباب ذوق“ لاہور: مجلس ترقی ادب، طبع اول، جنوری ۱۹۸۴ء، ص: ۳۶

باب ششم

اُردو مضمون نگاری کے اہم اسالیب

اُردو مضمون نگاری کے اہم اسالیب

اسلوب نہ تو ذات کا اظہار ہے نہ اجتماعیت کی پکار، یہ تو روشنی ہے تخیل و احساسات کو واضح کرنے کی، اسلوب کی دوستی قلم کار کو ادبی فضا اور ادبی دنیا سے متعارف کراتی ہے جبکہ اسلوب کی دشمنی قلم کار کو ادبی فضا میں رسوا کراتی ہے۔ اسلوب کیا ہے؟ اس کے سوتے کہاں سے پھوٹتے ہیں؟ یہ کن زاویوں سے متاثر ہوتا ہے؟ کن اصناف کو جنم دیتا ہے۔لفظ و معنی کے باہمی رشتے میں کیونکر مددگار و معاون ثابت ہوتا ہے۔ مبہم، بے معنی اور بے ربط اسلوب کے نقصانات کیا ہیں اور با محاورہ روزمرہ اسلوب کے اثرات ادب کو کس طرح تحفظ فراہم کرتے ہیں۔ یہ وہ سوالات ہیں جن پر بحث کرنا دنیائے ادب کا دلچسپ اور مفید طرز عمل رہا ہے اور رہے گا کیونکہ جب تک معاشرہ حیات و متحرک ہے تب تک انسان اور انسان کے متعلق موضوعات لکھے جاتے رہیں گے۔ اس وقت تک اسلوب بھی تجربہ گاہوں سے گزرتا رہے گا۔ مختلف مکاتیب فکر نے اسلوب کی مختلف تعریفیں کی ہیں۔ جن میں مغربی امریکی، ایرانی، عربی، اردو قلم کاروں کے حوالے دیئے جا سکتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ادبی تخلیق ادبی شخصیت کا حصہ ہوتی ہے۔ ادبی شخصیت کا حصہ ہوتی ہے۔ ادبی شخصیت کا ادبی تخلیق میں حصہ دو طرح سے ہوتا ہے:

۱۔ موضوعات میں شخصی رجحان جھلکتا ہے۔

۲۔ اسلوب میں شخصی رویہ نظر آتا ہے۔

ہمارا موضوع سخن دوسرا نکتہ ہے۔ یعنی اسلوب شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ واقعی اسلوب انسان کے مزاج اور تخیل کا مرہونِ منت ہوا کرتا ہے۔ تخلیق اور تخلیق کار کا ذہن لفظوں اور تخیل کے باہمی ربط سے جو اسلوب اپنے موضوعات کے لئے منتخب کرتا ہے وہ ہی اسلوب اس کی پہچان بن جاتا ہے۔ نیز اسی حوالے سے وہ اسلوب کی تعریف بھی کرتا ہے۔ ارسطو لکھتا ہے:

"زبان کی خوبی یہ ہے کہ اس میں صفائی ہو مگر سوقیانہ پن نہ ہو۔"[۱]

طارق سعید "اسلوب اور اسلوبیات" میں مختلف نقادوں کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"شوپنہار کے نزدیک اسلوب دماغ کی خارجی تصویر ہے۔۔۔ جبکہ ڈاکٹر جانسن کے نزدیک ہر شخص کی اپنی طرز ہوتی ہے۔"۲

مسز روبینہ کامران اپنے مقالے میں اسلوب کے حوالے سے مغربی آراء کا کچھ یوں حوالہ دیتی ہیں:

"Wasley اسلوب کی یوں تعریف کرتا ہے:

"Style is the dress of thought; a modest dress. Neat, but not gaudy, will true crities please."

Georges De Buffon کے نزدیک اسلوب کی تعریف یہ ہے:

"Style is the man himself."

Marvin Block لکھتا ہے:

"Clarity begins at home."

Confucius کے نزدیک اسلوب سے مراد:

"In language, clearness is every thing."۳

Walter Pater اپنے مضمون Style میں لکھتا ہے:

"The special function of mind, in style."۴

Ezra Pound اپنی کتاب ABC Of Reading میں لکھتا ہے:

"Literature is language charged with meaning."۵

اسلوب کی مختلف تعریفوں کے بعد ہم اس پر بحث کرتے ہیں کہ اسلوب کا لفظ کہاں سے مشتق ہے اور اسلوب کی تشکیل میں کن عوامل کا ہاتھ ہے۔لفظ اسلوب انگریزی لفظ "Style" کے مترادف ہے یونان والے Styles سٹلائیز کہتے ہیں۔ لاطینی میں Styles کہلاتا ہے۔ ہنری شیلی Shelly کہتے ہیں جبکہ عربی، اردو میں اسلوب کہا جاتا ہے۔"

آکسفورڈ ڈکشنری میں اسلوب کا مطلب درج ذیل ہے:

"۱۔ لکھنے کا طریقہ جس کے لغوی معنی پیدائش کے ہیں اور لاطینی میں Styles جس کا مطلب قلم ہے۔

۲۔ کسی ادبی شخصیت، ادبی گروہ یا ادبی دور کا اپنا منفرد طریقۂ اظہار۔"

زبان ایک اہم اور قیمتی سرمایہ ہے اور یہ تبدل وتغیر سے متحرک و زندہ رہتی ہے اور علم لسانیات زبان کا علم ہے۔ زبان کا علم یہ معلومات فراہم کرتا ہے کہ کسی بھی زبان کی ساخت کیا ہے اور اس کے بنیادی قواعد و گرائمر کیا ہے۔ Roger Fowler کہتا ہے:

> "A linguistic analysis of a literary text could, judging by some precedents, be exclusirely grammatical or metrical, or Lexical, or phonetic, and which ever of these emphases governs it, it could use the Language of any one of a number of existing froms of linguistic."[۱]

اس سے ثابت ہوا کہ زبان علامتوں کا مکمل نظام ہے جو لسانی گروہوں میں ابلاغ کا ذریعہ بنتا ہے۔

لسانیات کے بنیادی عناصر صوتیات، لفظیات، معدنیات ہیں۔ زبان ان سب سے مل کر بنتی ہے اور جدید دور میں ساختیات کا علم اس میں شامل ہو گیا ہے۔ لسانیات زبان کی اندرونی ساخت کو سمجھنے کا علم ہے اور زبان کی شناخت کی سائنس ہے زبان کے تین اہم رکن ہیں۔

(۱) اظہار کی ساخت، (۲) مواد کی ساخت، (۳) ذخیرۂ الفاظ کی ساخت۔

زبان میں تغیر وتبدل ہر قصبہ، ہر شہر اور مضافات شہر میں تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ عرصہ یعنی تقریباً ربع صدی کے بعد زبان میں تغیر وتبدل ماحول، عہد ثقافت اور بین الاقوامی یلغار کی بنا پر بہت زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ مثلاً اس کے اس گلوبل ویلج میں پاکستان میں ہندی الفاظ کی کثرت کیبل کا وہ قاتلانہ انعام ہے جس نے اردو زبان کافی حد تک مسخ کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً ہندی کے یہ الفاظ اردو زبان میں اس ربع صدی میں رچ بس گئے ہیں۔ شروعات، پریوار، من، سواگت، وشواس، چنتا، شانتی، اب شگون، انت ہوگا۔ پروس دو۔ آشیرباد وغیرہ۔ ہندوستان میں اردو اب شاذو نادر ہی کہیں لکھی نظر آتی ہے اور اردو زبان بھی صرف اہل زبان بولتے ہیں۔ اب ہندوستان میں ربع صدی کے اندر اندر ہندی کا راج ہو گیا ہے۔ عبدالسلام ''عمومی لسانیات'' میں جے لائیس کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''نسل میں اور زبان میں کوئی داخلی تعلق نہیں ہوتا۔ کسی بچے کو آپ جس ماحول میں ڈھال دیجئے وہ ان کی زبان اس طرح سیکھتے ہیں اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ بچہ کوئی

بھی زبان ورثہ میں لے کر پیدا نہیں ہوتا۔ زبان سیکھنا اکتسابی عمل ہوتا ہے مگر یہ عمل
غیر شعوری اور فطری ہوتا ہے۔"[۷]

آج ہم برصغیر پاک و ہند کے لسانی تغیر و تبدل پر غور کریں تو پاکستان پر ہندوی زبان کے اثرات شدت سے حملہ آور ہوتے نظر آتے ہیں۔ نیز انگریزی زبان بھی پاکستان میں نمایاں اثرات قائم کر رہی ہے۔ انسان اپنے پیغام کی ترسیل کے لئے آواز کا سہارا لیتا ہے اور زبان صوتیاتی لہروں سے منعکس ہو کر پیغام دینے والے اور پیغام لینے والے تک پہنچتی ہے۔ زبان کے اس نظام کو صوتیات یعنی آوازوں کا نظام کہا جاتا ہے۔ آواز کا نظام مختلف اوقات کار میں مختلف ہوا کرتا ہے۔ ہم ایک لفظ کی ادائیگی کو مختلف مواقع پر مختلف طریقہ کار سے ادا کرتے ہیں۔ لسانیات میں صوتیات کے حوالے سے جو تعریف لکھی گئی ہے اس کے حوالے سے مسز روبینہ کامران اپنے مقالے میں لکھتی ہیں:

"The study of the vocal organs, Through which are pronounced the basic sounds of speech, The study of waves, which is the way sounds are transmitted through the air from one person to another, and the study of the way in which human beings percive sounds are three interdependent aspects of a single branch of a single branch of lingustics which goes under the seperate name of phonetic. Phonetic is thus the science of human speach sounds."[۸]

صوت وہ نظام تلفظ ہے جو انسان کے نظام حلق و نظام اعصاب سے منسلک ہے اور آوازوں کا اتار چڑھاؤ نیز ادائیگی انسانی نفسیات کے تابع بھی ہے۔ ماہر لسانیات صوتیات پر جب بھی بحث کرتے ہیں وہاں نظام صوت یعنی حلق و تالو اور دیگر رکن اصوات کے ساتھ ساتھ انسان کی ذہنی ساخت اور آوازوں کے مختلف اقسام کو بھی مدنظر رکھتے ہیں۔ ایک ہی لفظ کو مختلف علاقوں کے لوگ مختلف آوازوں میں ادا کرتے ہیں۔ مثلاً ہم اہل پنجاب کراچی کو "کراچی" صحیح تلفظ میں ادا کرتے ہیں۔ لیکن کراچی والے اہل زبان کراچی کو "کرانچی" تالو سے جوڑ کر لفظ ادا کرتے ہیں اور یوں "ن" کا اضافہ کر دیتے ہیں۔ یا جو خاص لاہوری ہیں "ڑ" کی آواز نہیں نکال سکتے اور گھڑی کو گھری، چڑیاں کو "چریاں" کہتے ہیں۔ صوتیات کا علم آوازوں کی

شناخت کا علم ہے۔صوتیات یعنی فونولوجی بھی اہم ہے جس میں پہلے حرف کی تبدیلی سے مفہوم بدل جانا ہے۔ جیسے انگریزی میں Cat اور Rat میں پہلے حرف کی تبدیلی سے نام اور جنس بدل گئی ہے۔ فارسی میں۔ اردو میں رات اور بات میں ''ر'' اور ''ب'' کے لگنے سے لفظ کا مفہوم تبدیل ہو گیا۔ لسانیات زبان کا سائنٹفک علم ہے اور حروف کا بامعنی ہونا ہی اسلوب ہے۔لفظ انسانی احساسات اور واقعات کے عکاس ہوتے ہیں یہ جاندار ہوتے ہیں جوش ملیح آبادی ''الفاظ اور شاعر'' مضمون میں لکھتے ہیں:

''الفاظ تو ذی حیات ہیں۔انسانوں کی روح ذی حیات۔''۹

Henry Sweet صوتیات کی یوں تعریف کرتا ہے:

"Phonetics is the science of speach-sounds, or from a practical point of view, The art of pronounciation. Phonetics is to science of language generally what mathematics is to astronomy and the physical sciences. Without it, we can neither observe not record the simplest phenomena of language. It is equally necessary in the theoretical and in the practical study of Language."۱۰

معانیات Samantics لسانیات کی وہ شاخ ہے جس کے ذریعے معنی کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ جملے اورلفظ کے درمیان کے رشتے اور معنی کی نشاندہی کی جاتی ہے۔ زبان کا ہرلفظ معنی کا حامل ہوتا ہے۔ ہرلفظ کی اپنی اہمیت ہوتی ہے نیز ہرلفظ کے معنی سماجی و معاشرتی رویوں کا محتاج ہوتا ہے۔ مثلاً ان دو جملوں کے معنی ملاحظہ ہوں۔

۱۔کل جلدی اٹھو گے تو کالج جاؤ گے۔

۲۔کالج جاؤ گے تو کل جلدی اٹھو گے۔

ان دو جملوںؔ میں سماجی شعور مختلف ہے۔ پہلے جملے میں جلدی اٹھنے کی شرط کالج جانے سے قبل لگا دی گئی ہے جبکہ دوسرے جملے میں کالج جانے کے لئے جلدی اٹھنے کی شرط عائد کر دی ہے۔ یوں معنی کا تعلق لفظ سے جب محال ہوتا ہے معنی لفظ کو نہ صرف معتبر بناتا ہے بلکہ لفظ میں جان بھی ڈال دیتا ہے۔ یوں لفظ

کے حوالے سے جو بھی اندیشے لاحق ہوتے ہیں۔ معنی کا پھیلاؤ، جدت تنوع ان کی نفی کرتا ہے۔ معنی لفظ کو فکری سنجیدگی عطا کرتا ہے۔ یوں معنی لفظ کا طلبگار ہوتا ہے۔ جبکہ معنی لفظ سے منسلک ہو کر لفظ کا سہارا بنتا ہے۔ کیونکہ کسی مہمل لفظ کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ نیز فکر مضبوط ہو گی تو لفظ معنی کا بوجھ سہار سکے گا۔ اسلوب کی تشکیل لفظوں کی مہارت اور چابکدستی پر منحصر ہے۔ الفاظ حروف معنی کے باہمی ربط سے وجود پاتے ہیں۔ زبان حروف سے مل کر بنی ہے اور زبان کیا ہے۔ Bloch's & Trager لکھتا ہے:

"A Language is a system of arbitrary vocal symbols by means of which a social group co-operates."[11]

الفاظ، معنی و مفہوم کے لحاظ سے یہ مثال ملاحظہ ہو۔

"سچ بھی طاقت ہے۔"

میں نے "سچ بھی طاقت ہے" "بھی" سے سچ کی طاقت کو مشکوک کر کے معنی و مفہوم کو بھی مشکوک کر دیا ہے لیکن اگر یہ کہیں:

"سچ ایک طاقت ہے۔"

تو الفاظ بھی مستحکم نظر آتے اور معنی بھی صداقت کا ڈول ڈالتے۔ اس سے ثابت ہوا کہ فکر مضبوط ہونے کے باوجود لفظ مہمل ہو تو بھی بامعنی جملہ یا فقرہ نہیں بنتا۔ قواعد کی غلطیوں سے دیکھا گیا ہے کہ فن پارے کے متن پر اتنا برا اثر نہیں پڑتا بلکہ ناقص طرز ادا سے کسی فن پارے کی قدر و قیمت گھٹتی ہے۔ مناسب اور مترفع الفاظ کا استعمال اسلوب کی قدر کو کم کرتا ہے۔ روزمرہ عام بول چال ہے جبکہ محارہ مجازی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ روزمرہ و محاورہ زبان کی تخلیق میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ روزمرہ زبان کا قرینہ و سلیقہ ہے۔ حقیقت پر مبنی نہ ہونے کے باوجود حقیقت سے قریب ترین ہوا کرتا ہے مثلاً:

۱۔ آج صبح سے موسم خوشگوار ہے۔

۲۔ آج صبح سے موسم میں خنکی ہے۔

۳۔ آج صبح سے موسم قدرے سرد ہے۔

یہ جملے روزمرہ کے ہیں۔ صاف اور شستہ زبان میں لکھے گئے ہیں۔ لیکن یہ جملے یہ نہیں بتاتے کہ موسم کتنا خوشگوار ہے۔ کتنی موسم میں خنکی ہے اور کس حد تک موسم سرد ہے۔ اس کا صحیح تعین ناممکن ہے لیکن

چونکہ ''خوشگوار''، ''خنک'' اور ''سرد'' سے موسم کے مزاج اور تبدل کا بہ آسانی احساس ہو جاتا ہے۔ اس لئے مصفا زبان وہ ہے جو اہل زبان کی نشستہ زبان کہلاتی ہے اور یہ حقیقت سے قریب ترین ہے۔ روزمرہ زبان کا ''معیار خاص'' ہے جس کے تحت اسلوب میں تسلسل، روانی، توازن و تناسب ترتیب پاتا ہے۔ روزمرہ جس قدر بول چال کے قریب ہوگا فن پارہ اتنا ہی فعال و متحرک ہوگا۔ طارق سعید ''اسلوب اور اسلوبیات'' میں لکھتے ہیں:

> ''روزمرہ خاص قسم کی بندھی ہوئی ترکیب ہے جو عام طور سے اہل زبان پر سائر اور روزانہ کی بات چیت میں دائر ہو۔''[۱۲]

روزمرہ کے حوالے سے حالی نے مقدمہ شعر و شاعری میں کہا ہے کہ اہل زبان کی بول چال کے مطابق ہو اور قیاسی نہ ہو۔ اہل زبان کے مستعمل جو الفاظ ہوں گے وہ ہی روزمرہ کہلائیں گے۔ لیکن روزمرہ قیاسی نہ ہونے سے مراد یہ ہے کہ جو الفاظ زبان کو تردد میں ڈال دیں اور ذہن کو الجھاؤ دیں وہ روزمرہ نہیں ہو سکتے۔ مثلاً سید عابد علی عابد اصول انتقادیات میں لکھتے ہیں:

> ''اگر روزمرہ سے ادیب ناواقف ہوگا یا روزمرہ کی نزاکتوں پر مطلع نہ ہوگا تو لازماً اظہار ناقص رہے گا اور ابلاغ (Communication) نامکمل۔''[۱۳]

روزمرہ اور محاورے کے حوالے حالی کے کلام (نظم و نثر) میں اہمیت اور فوقیت کے حوالے سے مقدمہ شعر و شاعری میں رقمطراز ہیں:

> ''شعر کی معنوی خوبی کا اندازہ اہل زبان کا حصہ ہے۔ اہل زبان عموماً اس شعر کو زیادہ پسند کرتے ہیں جس میں روزمرہ کا لحاظ کیا گیا ہو اور اگر روزمرہ کے ساتھ محاورہ کی چاشنی بھی ہو تو وہ ان کو اور زیادہ مزا دیتی ہے مگر عوام اور خواص کی پسند میں بڑا فرق ہے۔ عوام محاورہ یا روزمرہ کے ہر شعر کو سن کر سر دُھن دھننے لگتے ہیں۔ شعر کا مضمون کیسا ہی تبذل یا رکیک اور سُبک ہو اور اگرچہ محاورہ کیسا ہی بے سلیقگی سے باندھا گیا ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جن اسلوبوں میں وہ ایک دوسرے سے بات چیت کرتے ہیں جب انہیں اسلوبوں میں وزن کھچاوٹ اور قافیوں کا تناسب دیکھتے ہیں اور معمولی بات چیت کو شعر سانچے میں ڈھلا ہوا پاتے ہیں تو ان کو ایک نوع کا تعجب اور تعجب کے ساتھ خوشی پیدا ہوتی ہے مگر خواص کی پسند اور تعجب کے لئے صرف روزمرہ کا وزن کے سانچے میں ڈھال دینا کافی نہیں۔ ان کے نزدیک

محض تک بندی اور معمولی بات چیت کو موزوں کر دینا کوئی تعجب خیز بات نہیں ہے۔
ہاں اگر وہ دیکھتے ہیں کہ ایک سنجیدہ مضمون معمولی روزمرہ میں کمال خوبی اور صفائی
اور بے تکلفی سے ادا کیا گیا ہو تو بلاشبہ ان کو بے انتہا تعجب اور حیرت ہوتی ہے۔"[۱۴]

ضرب الامثال فرد واحد کے ذاتی تجربات، مشاہدات و مطالعات کی بنا پر بھی وجود میں آتی ہیں۔ اجتماعی طور پر بھی ان کا انتخاب افراد معاشرہ کے احساسات اور تجربات کی بنا پر کیا جاتا ہے۔ضرب الامثال تاریخ کی طرح بنتی بگڑتی رہتی ہیں۔ کئی سالوں پر محیط تجربات و مشاہدات و واقعات سے بھی ان کا ڈیل ڈول ڈالا جاتا ہے اور کبھی ایک لمحہ کے سیاسی و معاشی معاشرتی فیصلے سے بھی تاریخ ایک اہم موڑ کاٹ لیتی ہے۔ بالکل اس طرح کبھی کبھی ایک لمحہ کا تجربہ، مشاہدہ بھی ضرب الامثال کو جنم دیتا ہے مگر اس کی دغا بازی سے میرے ذہن میں یہ جملہ آیا جو ضرب الامثال بن گیا۔

"سازشی ڈھکوسلے اندر باہر کوسے۔"

مراد یہ ہے کہ جو لوگ ہمارے خلاف سازش کرتے ہیں منصوبے سازشی بناتے ہیں وہ ہم پر الزام بھی دھرتے ہیں۔لڑتے بھی ہیں اور گھر سے باہر ہمیں بدنام بھی کرتے ہیں۔ ہر زمانے کے تغیر و تبدل سے امثال کا سبھاؤ بھی بدلتا رہتا ہے اور زبان میں ماحول، سماجی، سیاست، تاریخ و جغرافیہ کے حوالے سے جو انار چڑھاؤ آتے ہیں۔ اکثر و بیشتر امثال بھی ان انار چڑھاؤ کے رنگ میں رنگ جاتی ہیں۔ضرب الامثال کا استعمال بھی نثر کو حسن و دلنوازی عطا کرتا ہے۔ضرب الامثال کے استعمال میں اس بات کا خیال رکھا جائے کہ رکیک و سطحی ضرب الامثال سے اجتناب کرنا چاہیے۔متروک ضرب الامثال کے استعمال سے اسلوب کی شان ماند پڑنے کا سو فیصدی خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔ضرب الامثال حقیقی اور روزمرہ زبان میں ہو تو کلام نظم ونثر کی زندگی لمبی ہو گی۔ لیکن دیگر زبانوں عربی، فارسی، ہندی، پنجابی وغیرہ سے جو ضرب الامثال مستعار لی گئی ہیں وہ ناقص ہو گی۔ضرب الامثال نثری کاوش کو اس لئے بے وقت کر دے گی ایسا کرنے سے اپنی زبان کی علمیت اور وسعت پر کاری ضرب لگنے کا اندیشہ لاحق ہو جائے گا۔ امیجری یا تخیل کے ذریعے بھی اسلوب میں شعریت، دلکشی اور دلفریبی پیدا کی جا سکتی ہے اور شاعرانہ لوازمات، تشبیہ و استعارہ کے ذریعہ بیانیہ نثر کے ساتھ ساتھ وصفیہ نثر لکھی جاتی ہے۔ امیجری کیا ہے۔ امیج تصور ہے۔ اس کے لغوی معنی صورت اور شکل کے ہیں۔ شاعرانہ تصویر کاری یعنی محاکات کے ذریعے اسلوب میں تصویر کشی کی جاتی ہے۔ Wallace Stevens امیجری کے حوالے سے لکھتا ہے:

"The imagination is one of the great human powers. The romantic belittles it. The imagination is the liberty of mind."۱۵

امیجری لفظوں کی پیکر تراشی ہے۔فن پارے کو آرائش زبان میں مقید کرتی ہے۔کوئی بھی مشاہدہ، مطالعہ، تجربہ تصور کی پیدائش کا سبب بنتا ہے اور تصور انسان کو ایک تازگی اور حُسن بخشتا ہے جب اس تصور کو الفاظ کی زبان ملتی ہے تو یہ ہی تصور ترجمانی حیات کرتا ہے۔مزید یہ کہ ایک لفظ بھی تصور کے کئی معنی و مفہوم ادیب کو عطا کرتا ہے۔مثلاً غروب آفتاب کا تصور شام ڈھلنے، اور تنہائی کے عذاب کا تصور دیتا ہے۔لفظ بھیانک کا تصور کوئی بلا، ناگہانی آفات یا دہشت گردی، ہائی جیکنگ وغیرہ تصور لاتا ہے۔رائفل سے جو تصور بنتا ہے وہ فن حرب میں مہارت، ڈاکہ زنی، شکار وغیرہ کا تصور ہے۔امیجری یا تصور کتنا ہی خوبصورت و دلنشیں کیوں نہ ہو جب تک الفاظ پہ دسترس نہ ہو گی نیز ادبی معنویت اس تصور کو متناسب پرشکوہ الفاظ میں مقید نہ کرے گی۔اس وقت تک تصور کی اہمیت، تصور کا استعمال کمزور اور نامناسب ہو گا۔مثلاً اودھ پنچ کے نثر نگاروں کے ہاں طنز و استہزا تو ضرور موجود ہے لیکن ان کے ہاں معاشرتی ابتری کا بیان میں کہیں کہیں رکاکت اور پھکو پن ان کے مضامین کی امیجری کو داغ دار کر دیتا ہے۔مثلاً شرر کے مضامین کے الفاظ پرشکوہ اور رعب دار ہیں لیکن ان کے ہاں تصور قدرے کمزور اور ہلکا نظر آتا ہے۔لیکن آزاد کے ہاں لفظی پیکر تراشی، تمثیل نگاری، محاکات، تصویر کشی کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔یلدرم اور جوش بھی امیجری کا بہ خوبی استعمال کرتے ہیں۔ان کے ہاں اسلوب میں امیجری کا استعمال موضوع کو توانائی و تقویت بخشتا ہے۔مس حجاب اسمٰعیل کے ہاں بھی امیجری بھرپور جوبن پر نظر آتی ہے۔سید عابد علی عابد لکھتے ہیں:

"ادب اور آرٹ کا منصب یہ ہے کہ وہ مصنف اور فنکار کے نقطۂ نظر سے زندگی کی تصویر کشی کرے تو ہمیں صرف یہ دیکھنا ہے کہ وہ اس تصویر کشی میں خلوص اور دیانت داری سے کام لیتا رہا ہے یا نہیں۔"۱۶

شاعر و نثار اپنے اسلوب میں علامت کا استعمال بھی کرتے ہیں کیونکہ ادبی حُسن برقرار رکھنے کے لئے علامتی زبان کا سہارا بھی لینا پڑتا ہے۔علامت کا لغوی معنی سراغ، نشان کے ہیں۔کسی لفظ کے لغوی معنوں کی جگہ مجازی معنوں میں استعمال علامت کہلاتا ہے۔علائم و رموز کا استعمال ہمارے ادب پاروں کا ایک اہم رکن ہے۔استعارے کا استعمال ہی میں لغوی معنی کی جگہ مجازی معنی میں کیا جاتا ہے۔



"چلتا ہوا کارواں سوز و ساز نہیں یہ تو صرف خبر ہے۔"

یہاں زندگی کو کارواں کہا گیا ہے۔سوز و ساز عیش وطرب کے لئے مستعار لئے گئے اور خبر تحرک و فعالیت کے لئے مستعار لیا گیا۔ مطلب یہ ہے کہ زندگی ایک کارواں ہے جو ہمیں پل پل کی معلومات فراہم کرتی ہے۔ چاہے یہ خبر ہماری اندرونی ذہنی حالت کی ہو یا داخلی کیفیات کی عکاس ہو یا بیرونی سماجی ماحول کی خبر رساں۔ یہاں لفظ کارواں، خبر، سوز و ساز علامت ہے۔ سمبل کا لفظ بطور ادبی اصطلاح کے جرمن زبان کے ایک فعال لفظ سمالین سے ماخوذ ہے۔قوت متخلیہ کی بلند پروازی علامتی اسلوب کو فکر نو عطا کرتی ہے۔ قوت متخیلہ اگر زمینی اور حقیقی ہو گی تبھی علامتوں کا استعمال بعید از قیاس نہ ہو گا۔ علامتیں کئی قسم کی ہوتی ہے۔ معاشرتی علامتوں میں روایتی کہانیوں مثلاً لیلیٰ مجنوں، سوہنی مہینوال وغیرہ جیسی علامتیں شامل ہیں۔ ادبی علامتوں میں علم بدیع و صنائع کا استعمال شامل ہے۔ آفاقی علامتیں اقبال کے تصور شاہین مرد مومن گل لالہ وغیرہ علامتوں کو زندہ اور متحرک رکھنے کی علامتیں ہیں۔ مضامین کی تخلیق انسانی ذہن کی وہ خلاقی ہے جس میں مضمون نگاری کے داخلی جذبات و احساسات کے ساتھ ذاتی و شخصی تاثرات بھی ملتے ہیں۔ علامت کا تعلق ذوق انسانی سے ہوا کرتا ہے۔ علامت کا بھونڈا اور ناقص استعمال اسلوب کو کاملیت سے محروم رکھتا ہے جبکہ علامت اور اسلوب میں ربط ہو گا تو نہ صرف موضوع میں جان پڑ جائے گی۔ بلکہ اسلوب بھی موضوع کی ترسیل اور ابلاغ میں مددگار اور معاون ہو گا۔

شبلی کا اسلوب مرصع ہونے کے باوجود علامتوں کے متوازن و متناسب استعمال کی بنا پر ادبی وفکری حُسن سے مالا مال نظر آتا ہے۔ آغاز میں اسلوب میں ہمیں فارسی علامتوں کا دور نظر آتا ہے اس کی بنا پر آزاد، شرر کے ہاں فارسی و عربی اور ہندی اور یلدرم کے ہاں فارسی، ترکی کی علامتوں کا بھرپور استعمال ملتا ہے۔ یوں علامتوں کے بتدریج ارتقا سے ہمیں احساس ہوتا ہے کہ علامتوں کے زوال ہی اردو ادب میں سادہ صاف نثر کا باعث بنا۔ تبھی حسن نظامی، شیخ عبدالقادر، فرحت اللہ بیگ، رشید احمد صدیقی، حافظ شیرانی، مولوی عبدالحق، مہدی آبادی، سید عبدالماجد کی سادہ و سلیس نثر ہمارے سامنے آتی ہے۔ ادیب معاشرتی خامیوں اور خوبیوں کو جب اپنے تخیل اور اسلوب کی مدد سے کسی فن پارے کا روپ عطا کرتا ہے تو اسے اسلوب بھی ادبی زبان کا اختیار کرنا پڑتا ہے۔ سید عابد علی عابد اپنی کتاب "اسلوب" میں لوکس کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ لوکس نے خاص طور پر اس بات پر زور دیا ہے کہ ادائے مطلب کے لئے صحیح الفاظ کا انتخاب بہت ضروری

ہے۔اس سے یہ ثابت ہوا کہ اسلوب کا دارومدار تصنع و بناوٹ پر نہیں بلکہ اظہار کا وہ حقیقی سلسلہ ہے جس کی بنیاد تخلیق کار کے تخلیقی شعور کی مرہون منت ہوا کرتی ہے۔

اسلوب مافی الضمیر بیان کرنے کا حقیقی آلہ ہے۔لفظ کی ساخت،لفظ کی ادائیگی بھی اس میں شامل ہوتی ہے۔ ہر لکھاری اپنے عہد، اپنے ماحول یا پھر اپنے شوق و ذوق اور اصناف نظم ونثر سے ذاتی دلچسپی کی بنا پر اسلوب اختیار کرتا ہے۔ چونکہ ہمارا موضوع مضمون نگاری ہے اس لئے ہم مضمون نگاری کے حوالے سے اسلوب کی جہتوں اور سمتوں کا تجزیہ کریں گے۔ غالب اپنے عہد کا ایک بڑا نام ہے۔ غالب کے خطوط میں جو مضامین باندھے گئے۔ یہ مضامین سادہ، سہل اور روزمرہ کی زبان میں لکھے گئے ہیں۔ ان مضامین میں مزاح کی چاشنی بھی نظر آتی ہے اور حادثاتِ زمانہ کی تلخ تصویریں بھی عیاں ہوتی ہیں۔ یہ خطوط بے بسی کا نازیانہ بھی ہیں اور ناقدری و کسمپرسی کا رونا بھی۔ غالب کے ان خطوط میں اسلوب کی لذت و چاشنی کے ساتھ ساتھ اسلوب کی ندرت و جدت عیاں ہے۔ان خطوط کے موضوعات متنوع ہیں۔ غالب کا عہد، عہد آشوب تھا۔ غالب کے اردگرد موضوعات دہر بکھرے ہوئے تھے۔ غالب نے پُرتصنع اور بناوٹ سے بھرے اسلوب کی جگہ اپنا درد و کسک کا اپنے خطوط میں فی البدیہہ اظہار کیا ہے۔ ڈاکٹر ظہور احمد اعوان اپنی کتاب ''نگارشات'' میں غالب کے تشکیل کردہ اسلوب کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''غالب خطوط لکھتے لکھتے نئی زبان، نئی نثر اور نئے اسلوب کا ڈول بھی ڈال گئے.....
> انہوں نے اردو نثر کو مشکل پسندی، قافیہ بندی، ترصیع نگاری اور شعری سانچے سے
> نکال کر اسے صحیح معنوں میں سادہ سلیس قابل فہم اور ادبی نثر بنا دیا۔''۱۷

غالب کے خطوط کا فکری اسلوب سہل ممتنع کا عکاس سے نثر پارہ ملاحظہ ہو:

> ''بھائی کیا پوچھتے ہو؟ کیا لکھوں؟ دلی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر تھی۔ قلعہ، چاندنی
> چوک، ہر روز مجمع مسجد کا، ہر ہفتے سیر جمنا کے پُل کی، ہر سال میلہ پھول والوں کا۔
> یہ پانچوں باتیں اب نہیں۔ پھر کہو دلی کہاں، ہاں کوئی شہر قلم رو ہند میں اس نام کا
> تھا۔''۱۸

مضمون جو ہمیں حقائقِ زندگی سے آگاہ کرتا ہے وہ اسلوب کی ندرت کا حامل ہوتا ہے۔ اسلوب کی کارکردگی میں ذہنی بالیدگی، ذہنی صداقت، فکری و ذہنی بصیرت اہم رول ادا کرتی ہے۔اسلوب جو باطنی شعور کا عکاس ہوتا ہے مضمون نگار اسلوب کی مندرجہ بالا خوبیوں کو مدِنظر رکھے گا تو اس کا مضمون بھی ادبی دنیا میں

جگہ پا سکے گا اور ادیب کی صلاحیتوں کا لوہا بھی مانا جائے گا۔

اسلوب کی کئی اقسام ہیں۔ان اقسام کے تحت لکھنے والے نثار بھی کئی طرز اور کئی ادا سے اسلوب کو اردو ادب سے متعارف کراتے ہیں۔ یہاں چند ایک اسلوب کی اقسام اور ان اقسام سے منسلک نثار کا مختصراً مطالعہ کرتے ہیں۔ اسلوب کی اقسام میں سے چند ایک درج ذیل ہیں۔ مرصع اسلوب، رومانوی اسلوب، لطیف اسلوب، مزاحیہ اسلوب، تنقیدی اسلوب، تحقیقی اسلوب، تاریخی اسلوب، توضیحی اسلوب۔ وغیرہ وغیرہ۔ مرصع اسلوب کے علمبردار اردو ادب میں مولانا شبلی نعمانی، مولانا ابو الکلام آزاد اور قاضی عبدالغفار ہیں۔ مرصع اسلوب آرائش زبان کا مرہون منت ہوا کرتا ہے۔ پُرجوش تخیل سے لبریز اسلوب کے ذریعے مضمون نگار اپنے مضامین میں زباندانی سے کام لیتا ہے۔ مبالغہ اور تحیر اس اسلوب کا خاصہ ہیں۔ محاکات اور تخیل انسانی جذبات کو برانگیختہ کرتے ہیں۔ مرصع اسلوب کا انحصار الفاظ کی نشست و برخاست پر ہوا کرتا ہے۔

مضمون نگار کے مضامین کے موضوعات میں تنوع اگر ہو تو تخیل و حقیقت کی ہم آہنگی موضوع کو ابدی موضوع بنا دیتی ہے اور فصاحت و بلاغت کے نمونے نثر پارے میں نظر آتے ہیں۔ جیسے شبلی نعمانی کا اسلوب جوش و جذبے کے ساتھ ساتھ تخیل کی اعلیٰ کارفرمائی کا ثبوت ہے۔ متانت، شائستگی، شکوہ الفاظ شبلی کی تحریروں کا خاصہ ہے۔شبلی نے جو موضوعات چُنے ان میں ان کی تحریریں بلاغت وفصاحت، جوش اور قدرے مبالغے سے پُر نظر آتی ہیں۔شبلی نے تاریخ لکھی یا سوانح عمری، تنقید کی یا مذہبی کتب، شبلی کا اسلوب ان تمام تخلیقات میں اسلوب کی ندرت، فکر و منطق کی باریکیوں کے ساتھ ساتھ ان کے فنی شعور کی بہترین عکاسی کرتا ہے۔شبلی کے اسلوب کا عالمانہ طرزِ تخاطب قاری کو نہ صرف اپنی طرف متوجہ کرتا ہے بلکہ شبلی کے تنقیدی و تحقیقی شعور کی پختگی کا احساس بھی دلاتا ہے۔شبلی کی تحریروں میں احساسِ تفاخر نظر آتا ہے۔نثر میں شاعری کا انداز ملتا ہے۔ مقالاتِ شبلی کے موضوعات ان کے اعلیٰ تخیل کے عکاس ہیں۔ اس ذہنی و شعوری سفر کے علمبردار بھی جو تحریر کے پسِ پردہ نظر آتا ہے۔ان کی باطنی صداقت ان کے اسلوب کو سہارا دیتی ہے۔ اس لئے ان کا اسلوب باوجود قدرے مبالغہ کے توازن و تناسب ترتیب وربط سے جڑا نظر آتا ہے۔

شبلی کا انفرادی اسلوب ان کے اسلوب کو مرصع اسلوب کے زمرے میں لا کھڑا کرتا ہے۔شبلی کا اسلوب تعمیری اسلوب ہے۔اسلوب اور تخیل کی ہم آہنگی شبلی کے اسلوب کو بامعنی اور حسین بنا دیتی ہے۔شبلی نے کئی اصناف نثر پر کام کیا ہے۔ مثلاً سوانح عمری، تاریخ ، تنقید، ادب، تحقیق۔ مذہبی مضامین، شبلی کا مرصع

اسلوب ہر موضوع میں ایک جداگانہ رنگ لیے نظر آتا ہے۔ بلند و جدید اردو زبان کا عکس شبلی کے ہاں ملتا ہے۔ خطابت کا جوش ان کی تحریروں کو قدرے مبالغے کی جانب دھکیل دیتا ہے۔ لیکن شبلی ایسے موقع پر قلم و تخیل کی باگ اپنے ہاتھ میں رکھتے ہیں اور بڑی نفاست و ذہانت سے یہاں لفظوں کی بدنمائی اور موضوع کی تکرار سے بچ نکل جاتے ہیں اور یہ ہی کمال فن ہے جو کسی نثر نگار کو اردو ادب میں ایک اعلیٰ مقام پر لا کھڑا کرتا ہے۔ شبلی کے ہاں احساسِ عظمت بھی نظر آتا ہے۔ شبلی کا اندازِ تخاطب حاکمانہ ہے اور لفظ ''میں'' کی تکرار بھی ملتی ہے۔ ان کے اسلوب میں معنی آفرینی اور اثر آفرینی یکجا ہو کر قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ مثلاً ''شعر العجم'' میں لکھتے ہیں:

> ''اکثر لوگوں کے نزدیک شاعری صرف قوتِ تخیل کا نام ہے اور اگر یہ صحیح ہے تو کلیم ہمہ تن شاعری ہے۔ اس کا ہر شعر قوت تخیل کا ایک مظہر ہے۔ شاعر کو تمام عالم اور عالم کے تمام واقعات قوتِ تخیل کی وجہ سے ایک اور ہی صورت میں نظر آتے ہیں۔ مثلاً ہوا کے زور سے پھول کا ایک پتہ ٹہنی سے ٹوٹ کر پانی میں گر گیا۔ یہ ایک معمولی واقعہ ہے لیکن شاعر کو قوت تخیل سے نظر آتا ہے کہ یہ بہارِ حسن کا دفتر ہے اور چونکہ معشوق کے حُسن کے سامنے اس کی قدر نہیں ہو سکتی اس لئے بہار نے اس دفتر کو پانی سے دھو ڈالنا چاہا ہے۔''[۱۹]

شبلی کا تخیلاتی جوش ان کی نثر کو جذباتی رنگ عطا کرتا ہے اور یہ جذباتی رنگ ان کے اسلوب کو مبالغے سے جا ملاتا ہے۔ مثلاً موازنہ انیس و دبیر کا جملہ آغاز ہی سے جذباتی تاثرات سے لبریز ہے۔ مولانا ابو الکلام آزاد کے ہاں مرصع اسلوب اپنی بھرپور آب و تاب سے جلوہ گر ہوتا ہے۔ مضامین آزاد کا پُر جوش تخیل، جرات پسندی اور بے باکانہ انداز تخاطب آزاد کے مرصع اسلوب کی نشاندہی کرتا ہے۔ مرصع سازی نہایت اہم اور نازک کام ہے۔ آزاد کے ہاں اندازِ تحیر جب نمایاں ہوتا ہے تو کہیں کہیں لفظوں کی چکا چوند ان کے اسلوب کو داغدار کر دیتی ہے۔ یوں وہ لفظوں کے بہاؤ میں بہتے چلے جاتے ہیں۔ جانبداری اور غیر جانبداری کے چکر میں الجھنے کے چکر میں الجھے بنا آزاد نہایت چابکدستی سے اپنا مُدعا بیان کرتے ہیں۔ کسی ماہر نقاش کی مانند لفظوں کے رنگوں سے حسین اور رنگین فضا قائم کرتے ہیں اور قاری کو بھی اپنے اس رنگین شیشے میں اتارتے چلے جاتے ہیں۔ اس وجہ سے ان کی نثر میں بانکپن کے باوجود کہیں کہیں بیزاری کھٹکتی ہے۔

آزاد کا اسلوب عصبیت سے قدرے پاک نہیں ہے وہ بڑے پرجوش انداز میں اپنا فیصلہ سناتے ہیں اور آگے بڑھ جاتے ہیں۔ تاثراتی اسلوب ابو الکلام آزاد کا خاصہ ہے۔ دلکش طرز ادا ابو الکلام آزاد کا اصول ہے۔ مولانا ابو الکلام آزاد کا تخیلاتی شعور "الہلال" کے مضامین میں ابھر کر سامنے آتا ہے۔ مسجع و مقفی عبارت میں لکھے گئے یہ مضامین اسلوب کی نیرنگی کے عکاس ہیں اور الفاظ کا تناسب اور بہاؤ ان کے اسلوب کو دل آویز بناتا تو ضرور ہے لیکن ان کی فکر اور تخیل کا تضاد ان کے اسلوب کو کمزور بھی کر دیتا ہے۔ ان کے اسلوب کی خاصیت یہ ہے کہ موضوع کی مطابقت سے ان کے ہاں لفظ بولتے ہیں اور یوں اسلوب کی تاثیر شائقین ادب کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے۔ آزاد کا مطالعہ بھی وسیع ہے اور مشاہدہ بھی کڑا لیکن اس کے باوجود اپنا مافی الضمیر ادا کرتے وقت اکثر و بیشتر اسلوب کے کورکھ دھندے میں اس طرح ابو الکلام آزاد الجھ جاتے ہیں کہ موضوع و اسلوب میں ہم آہنگی نہیں رہتی۔ آزاد کے اسلوب کے حوالے سے افضل حق قریشی لکھتے ہیں:

> "ابو الکلام کی نثر کا آہنگ ان کی ذہنی رغبتوں کا آئینہ دار ہے۔ ان کی تحریر سبک گام اور نرم رو نہیں۔ ان کے فقروں کی زنجیروں سے جو جھنکار نمودار ہوتی ہے وہ صرف چونکا دینے والی ہی نہیں مبہوت کر دینے والی ہوتی ہے۔ ان کے غریب اور ثقیل الفاظ ان کی انشاء کے سچے کارندے ہیں اور ان کے ذہن کے بعض رجحانات کے حقیقی نمائندے ہیں ان سے وہ ولولہ انگیزی اور جوش انگیزی کا کام لیتے ہیں۔"[۲۰]

ابو الکلام آزاد کے ہاں زورِ بیان عروج پر نظر آتا ہے۔ ہر لفظ اور ہر جملہ اپنے اندر قوتِ نمو رکھتا ہے۔ اُن کی تحریروں کے لفظ خاموش نہیں ہوتے بلکہ متحرک اور فعال الفاظ ان کے موضوعات کو نہ صرف تنوع بخشتے ہیں بلکہ کہیں کہیں اُن کے موضوعات کو ذو معنویت سے بھی روشناس کراتے ہیں۔ انتخابِ الفاظ میں ابو الکلام آزاد مکمل حاوی نظر آتے ہیں اور ہیجان آمیز فقرے یا جملے ان کی تحریر کو گھن گرج جیسا لہجہ عطا کرتا ہے۔ مولانا ابو الکلام آزاد کے ہاں لفظی و معنوی آہنگ بھی ملتا ہے۔ صنائع بدائع کا استعمال مولانا ابو الکلام آزاد کی نثر کو متحرک اور فعال بنا دیتا ہے اور روح و وجدان کی کیفیت ان کے نثر پاروں میں نظر آتی ہے۔ "صبح امید" میں لکھتے ہیں:

> "جب زمین آفتاب کے آتشکدہ حرارت سے قریب ہو جاتی ہے اس کی شعلہ ماریوں سے زمین کا ذرہ ذرہ تپنے لگتا ہے۔ زندگی کی تمام علامتیں مفقود ہو جاتی

ہیں۔ ہر شے پر مردنی اور ہر چہرے پر افسردگی چھا جاتی ہے دریا اتر جاتے ہیں
نمایاں خشک ہو جاتی ہیں، زمین اندر خزانہ رطوبت بھی خالی ہو جاتا ہے اور سبزہ وگُل
کی تروتازگی اور کھیتوں کی شادابی دونوں خشک سالی کی تیغ سے ہلاک ہو جاتی
ہیں.....اور کوئی آنکھ نہیں ہوتی جو آسمان کی طرف امید سے نہ اٹھتی ہو اور پھر مایوس
ہو کر العطش! العطش! پکارتی ہو۔"[۲۱]

مولانا ابوالکلام آزاد کے ہاں اندازِ بیان ثقیل نظر آتا ہے۔ عربی و فارسی زبان سے مستعار لیے ہوئے الفاظ ان کی تحریر کو مشکل ترین بنا دیتے ہیں۔ لیکن لفظوں کا اپنی جگہ مناسب انداز میں رکھنے کی مہارت بھی مولانا ابو الکلام آزاد کو حاصل تھی نیز ان کی عبارت میں قدرے شوخی بھی نظر آتی ہے ان کا اسلوب جذباتی بھی ہے۔ مولانا کے اندر خطابت کے جوہر موجود تھے۔ خطابت کا انداز والہانہ ہوا کرتا تھا۔ جہاں جہاں مضامین میں خطابت کا لب و لہجہ نظر آتا ہے کہیں کہیں جھول تو ضرور ملتا ہے لیکن زیادہ تر یہ خطابت مولانا ابوالکلام آزاد کے مافی الضمیر کو اس طرح بیان کر جاتی ہے کہ قاری اس کے سحر میں بھی مبتلا ہو جاتا ہے۔ موضوع پر گرفت، بے ساختگی اور مؤثر اندازِ تحریر مولانا کا خاصہ ہیں۔ ایک نثر پارہ ملاحظہ ہو:

"درخت سب بوتے ہیں لیکن ہر شخص کے نصیب میں یہ نہیں ہوتا کہ پھل کھائے۔
پس نہایت مبارک ہے وہ ہاتھ جو تخم پاشی کرے اور اپنے دامن میں سے اس کے
پھلوں کو بھی دیکھے۔"[۲۲]

مولانا ابو الکلام آزاد کے ہاں قرآنی آیات کا تذکرہ بھی ملتا ہے جو ان کے اسلوب کو رفعت و جلال عطا کرتا ہے۔ الہلال ایک مقصد ایک دعوت بن کر ابھرا۔ اسی لئے اس کی زبان پُرشکوہ ہے اور جلال و جمال اس نثر کا خاصہ ہے۔ یلدرم کے ہاں رومانوی اسلوب تیزی سے حرکت کرتا نظر آتا ہے۔ اُن کی تحریروں میں شعوری و غیر شعوری طور پر رومانویت کی آمیزش ملتی ہے۔ سرسید کی عقلی نثر کے ردعمل میں پروان چڑھنے والی رومانوی نثر، تشبیہ و استعارات سے مزین نثر کہلائی۔ ایسی نثر جس میں فکری تخیل بھی یلدرم کو نئی دنیاؤں کی سیرا کرتا ہے۔ یلدرم سبک، نرم اور خوبرو الفاظ اپنی نثر کے لئے چنتے ہیں تبھی ان کی نثر شعریئت سے لبریز نظر آتی ہے۔ یلدرم ترکی و اردو کی آمیزش ان کے نثر پاروں کو لافانی نثر پارہ بنا دیتی ہے۔ یلدرم نے شعوری طور پر جمالیاتی قدروں کو اپنی تحریروں میں سمویا ہے۔ تخیل کی آزادانہ پرواز نے یلدرم کی نثر کو حُسن و رنگینی بھی عطا کی ہے اور لہجہ کا بانکپن بھی۔ یلدرم خالص رومانوی نثر نگار ہیں تبھی تو

فراخ حوصلگی سے شاعرانہ نثر کا اپنے مضامین میں اہتمام کرتے ہیں۔ان کے ہاں لفظ بولتے ہیں۔ لہجہ دمکتا اور مسکراتا ہے۔خیال کی روشنی موضوع کو نیا اسلوب مہیا کرتی ہے۔یلدرم اپنے طرز کے خود ہی موجد ہیں۔ اسی لئے فکری و رومانوی اسلوب کا امتزاج ان کے موضوعات کو آہنگ کی قوت عطا کرتا ہے۔ مثلاً ''مصاحبت ادبیہ'' میں لکھتے ہیں:

> ''میں ادب کا ادنیٰ اور گمنام شیدائی ہوں اور اس پر ستم یہ ہے کہ مجبور اور وطن سے دور! تاہم زبان اور ملک کی محبت جو دل میں جاگزیں ہے وہ اس بات پر مجبور کرتی ہے کہ بیابانِ عرب میں بیٹھ کر دل کی بھڑاس نکال لیا کروں۔''[۲۳]

نیاز فتح پوری کے جذباتی، تاثراتی اندازِ تحریر ان کی نثر کو رومانوی نثر بنا دیتا ہے۔ان کا اسلوب خود شناسی کا سفر طے کرتا ہوا خود پرستی تک جا پہنچتا ہے۔نثری تخلیقات میں شعورِ حُسن اور حسنِ جمال کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ان کی نثر مرصع ہے اور فکر باوجود تاثراتی ہونے کے تعمیری شعور رکھتی ہے۔مختصر فقروں کی چاشنی ان کی نثر میں گداز پیدا کر دیتی ہے۔سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نیاز کا اسلوب ہمیں اسلوب کے نئے پن سے متعارف بھی کراتا ہے یا نہیں۔ نیاز کا اسلوب فکر اور تخلیق کی منصوبہ بندی سے ترتیب پاتا ہے اور ''انتقادیات'' کے ذریعے ہمیں جو معلومات نیاز فراہم کرتے ہیں وہ رومانوی تحریک مزید کھنگالنے کا مژدہ سناتا ہے۔ نیاز کے ہاں تجرباتی نثر سے زیادہ جذباتی اور تاثراتی نثر کا اہتمام کیا گیا۔لیکن پھر بھی ہمیں ان کے نثری فقروں میں صفائی، شستگی، منطق نظر آتی ہے۔ نیاز لکھتے ہیں:

> ''الغرض تغزل نے زبان و بیان کے لحاظ سے اس عہد تک نمایاں ترقی حاصل کر لی اور ایک سودا و میر ہی پر موقوف نہیں۔ آپ اس عہد کے جس شاعر کا کلام اٹھا کر دیکھیں گے، زبان کی صفائی اور جذبات کی صداقت و سادگی آپ کو ہر جگہ نظر آئے گی۔''[۲۴]

نیاز یلدرم سے متاثر نظر آتے ہیں اور اسی لئے ان کے ابتدائی رنگ رومانیت یلدرم کے زیر اثر نظر آتا ہے۔ نیاز جدید ترکیب اور استعاروں، تشبیہات سے اپنی نثر کو مزین کرتے ہیں اور ساتھ ہی جذباتی لہجہ اختیار کر کے رومانوی تحریک کے علمبردار نظر آتے ہیں۔ ان کی تحریریں متحرک اور فعال ہیں۔ البتہ جہاں جہاں تاثراتی رنگ ملتا ہے نیاز وہاں کٹھور ہو جاتے ہیں انہوں نے غالب پر مومن کو ترجیح دیتے ہوئے اس کٹھور پن کا مظاہرہ کیا ہے۔ نیاز کی قوت تخلیق مستحکم و مضبوط ہے جس کی بنا پر ان کے مضامین میں مثبت فکر

کے سُوتے پھوٹتے ہیں۔ مثلاً ''ادبیات اور اصولِ نقد'' مضمون میں لکھتے ہیں:

''ادب حقیقتاً ایک ریکارڈ ہے ان تمام تجربات اور احساسات کا جن سے ایک انسان اپنی زندگی میں دوچار ہوتا ہے۔ گویا بہ الفاظ دیگر یوں کہہ سکتے ہیں کہ ادب زندگی کا اظہار ہے۔ الفاظ کے ذریعے سے اور اسی لئے جس طرح ادب کی تخلیق زندگی سے ہوتی ہے اسی طرح زندگی کی تخلیق بہت کچھ ادب پر منحصر ہے۔''۲۵

نیاز کے ہاں لفظوں کی نفاست اور شیرینی و ترنم ان کے مضامین میں فطری حُسن پیدا کر دیتا ہے۔ نیاز کے ہاں جہاں تنقیدی، مذہبی، تاریخی، تحقیقی مضامین ملتے ہیں وہاں نیاز کے مضامین کا لہجہ منطق و دلائل سے پُر نظر آتا ہے۔ وہ ایک شریف النفس ادیب کی طرح ادبی حُسن بھی برقرار رکھتے ہیں اور ان کے اسلوب پر بُفن (Buffon) کا یہ خیال ہے:

"The Style is what you are."

نیاز کے ہاں زبان متناسب فقروں پر مبنی ہے۔ لیکن نیاز کی کچھ کمزوریاں اور خامیاں بھی ہیں۔ نیاز ایک استاد کی طرح اپنے مضامین میں جو فضا قائم کرتے ہیں وہ نقاشی و مصوری سے کم نہیں ہوتی۔ ان کا اسلوب قاری کو تخیلاتی مسرت سے آشنا کراتا ہے اور لفظوں کے چناؤ میں وہ محتاط رویہ اختیار کرتے ہیں۔ نیاز لکھتے ہیں:

''ادبیات میں اہم ترین اس کی ''جذباتی قیمت'' ہے جو تصنیف ہمارے جذبات کو ابھار سکتی ہے وہ یقیناً ادبیات میں داخل ہے۔''۲۶

مس حجاب اسماعیل کے اسلوب میں رومانویت کا مسکراتا ہوا لہجہ نظر آتا ہے۔ درد و کسک میں ڈوبے فقرے بہار آفرینی کا پتہ دیتے ہیں۔ جوش انگیزی اور ہیجان خیزی جو رومانویت کا طرۂ امتیاز ہے حجاب کے ہاں اس کے نادر نمونے ملتے ہیں۔ زندگی اور رومان کی قرابت داری حجاب کے لہجہ کو مٹھاس عطا کرتے ہیں ان کے موضوعات ایک نفیس عورت کے تخیلاتی ذہن کے عکاس ہیں۔ ایسی عورت جو حُسن سے متاثر بھی ہوتی ہے، حُسن سے لطف اندوز بھی ہوتی ہے لیکن تڑپتی، سسکتی زندگی کا عرق اور نچوڑ بھی حجاب کے ہاں نظر آتا ہے۔ لفظوں کے چناؤ میں حجاب اس قدر محتاط ہیں کہ ان کے ہاں پھکو پن کا شائبہ بھی نظر نہیں آتا۔ ان کے موضوعات کی ساخت فراخ و کشادہ ہونے کے ساتھ ساتھ استدلالی بھی ہے اور نتیجہ خیز بھی۔ وہ موضوع کی وضاحت نہیں کرتیں، لیکن اسلوب کی دھیمی اور سبک رفتار ان کے موضوع کی وضاحت کر دیتی ہے۔ وہ

لکھتی ہیں:

"اے میری آرزو کے گلاب! تو مرجھا کیوں گیا
باغوں کے گلاب شگفتہ ہو گئے
سرد سرد شبنم نے ان کی پنکھڑیاں کھول دیں
گرم گرم آنسو تیری بند پنکھڑیاں نہیں کھول سکتے؟"[۲۷]

حجاب زندگی کے مثبت و منفی رویوں پر نظر رکھتی ہیں اور زندگی کے رجائی پہلو پر قلم اٹھاتی ہیں۔ ان کا اسلوب تیکھا اور جاندار ہے۔ مختلف فقروں سے وہ تصویر کشی کرتی ہیں۔ لطیف اسلوب میں پہلا نام حسن نظامی کا ہے۔ حسن نظامی کا اسلوب نرم، سبک اور دل آویز ہے۔ حسن نظامی کے اسلوب میں خالص مزاح کا عکس بھی جھلکتا ہے۔ ان کے موضوعات اپنے ہی معاشرے کے موضوعات ہیں۔ ان موضوعات کا اسلوب سہل اور تخیل آفریں ہے۔ لفظوں کے ہیر پھیر نے ان کے اسلوب میں معنویت اور نغمیت بھر دی ہے۔ وہ کمال کے انشا پرداز ہیں۔ وہ کوئی بھی موضوع ہو مذہبی، علمی، معاشرتی، سیاسی اس کا اسلوب فلسفے کے گورکھ دھندوں میں نہیں الجھتا۔ بلکہ وہ سیدھے سادھے اور قابل فہم زبان میں ادا کرتے جاتے ہیں۔ یوں عوام میں رہ کر عوام کی قدر و منزلت کا احساس بھی رکھتے ہیں اور عوام پر طنز بھی کرتے ہیں لیکن یہ طنز شگفتہ ہوتا ہے۔ ابتذال یا پھکڑ پن سے اسے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ دھیما لہجہ اور پھر اس لہجے میں سرود و شادمانی حسن نظامی کے مضامین کو لطیف اسلوب کے زمرے میں لا کھڑا کرتی ہے۔ ان کے موضوعات میں تنوع بھی ہے اور جاذبیت بھی۔ اسلوبِ بیان پر انہیں مکمل قدرت حاصل ہے۔ سوز و گداز ان کی تحریروں کا خاصہ ہے۔ حسن نظامی کی تحریروں میں بے ساختگی اور بے تکلفی اس طرح کی ہے کہ قاری کو ان مضامین کا ماحول اپنا ماحول نظر آتا ہے۔ خواجہ حسن نظامی کی تحریروں میں دہلی کی ٹکسالی زبان کا مزا ملتا ہے۔ ان کے اسلوب میں ایک طلسماتی کیفیت نظر آتی ہے اور بیان کی تاثیر قاری کو سحر میں مبتلا کر دیتی ہے۔ مثلاً یہ پیرا ملاحظہ ہو:

"میرے مالک پچھلی رات ہے، سب سوتے ہیں، تُو جاگتا ہے، میں جاگتی ہوں۔ تُو سامنے کے آسمان میں ہے یا خود میرے دل کے مکان میں ہے۔ جہاں ہے میری التجا کو سن۔ صبح کا نور چمکنے سے پہلے، تاروں کی روشنی چھپنے سے پیشتر، پرندوں کی نغمہ سرائی سے قبل، میری مراد مجھ کو دے۔"[۲۸]

حسن نظامی مرقع نگاری کے فن میں طاق تھے۔ ان کے مضامین میں تنوع تھا اور ان کا لہجہ فی

البدیہہ اور فطری تھا۔ اس لئے ان کے مضامین کا مطالعہ کرنے والا ان کے اسلوب بیان کے توسط سے ان موضوعات کو اپنے اردگرد محسوس کرتا تھا۔ یہ سب کچھ اس کے سامنے ہو رہا ہے اور وہ اپنی آنکھوں سے ان کا مشاہدہ کر رہا ہے۔ یہ اسلوبِ بیان کی وہ طاقت ہے جو ہر کسی کو میسر نہیں ہوتی اور بیانیہ فطری اندازِ تحریر خواجہ صاحب کا خاصہ تھی۔ لفظ ان کے سامنے دست بستہ کھڑے ہوتے تھے۔ لیکن ثقیل یا بھاری بھر کم لفظ نہیں بلکہ سلیس عام فہم زبان میں اپنے مطلب کو بیان کر کے خواجہ صاحب آگے قدم بڑھا دیتے ہیں۔ پیچھے مُڑ کر دیکھنا وہ موضوع و اسلوب کی توہین سمجھتے تھے۔ اسی لئے ان کا ہر نیا موضوع نئے اسلوب کے جلو میں اُبھرتا تھا اور قاری کو اپنے سحر میں مبتلا کر دیتا تھا۔ یہ نثر پارہ ملاحظہ ہو:

"اے پروفیسر! اے فلاسفر! اے متول درویش! اے نغمۂ ربانی گانے والے قوال!
ہم تیرے غم میں نڈھال ہیں اور توپ کی گاڑی پر تیری لاش اٹھانے اور اپنے بازو پر
کالا نشان باندھنے کا ریزولیشن پاس کرتے ہیں۔ خیر! اب تو چیونٹی کے پیٹ کی قبر
میں دفن ہو جا۔ مگر ہم ہمیشہ ریزولیوشنوں میں تجھے یاد رکھیں گے۔"۲۹

حسن نظامی کے مخاطب ان پڑھ عوام تھے اسی لیے نظیر اکبر آبادی کی طرح وہ ان ہی لوگوں کی زبان میں گفتگو کرتے تھے۔ لیکن نظیر اکبر آبادی کے ہاں ابتذال ہے جبکہ حسن نظامی کا مذاق صاف ستھرا ہے ان کی تحریروں میں گھلاوٹ، دلکشی اور دردمندی ملتی ہے ان کا دور کشمکش و ابتلا کا دور تھا۔ عبدالقادر بہترین انشا پرداز اور خوش مذاق ادیب تھے انہوں نے اردو کے فروغ اور اردو کے تحفظ کے لئے مخزن کا اجراء کیا۔ انہوں نے تحقیقی و تدوینی و تنقیدی کام کیا۔ دلی کی زبان ان کے لہجے میں جھلکتی تھی۔ انہوں نے مخزن کا اجراء اس لیے کیا تھا کہ اردو زبان کو جدید زبان بنایا جائے مخزن کے ذریعے علم و ادب کی خدمت کی اور مخزن ایک تاریخ ساز عہد بن کر ابھرا۔ نثر کا سلیس، عام فہم اور سادہ انداز عبدالقادر نے اختیار کیا۔ شیخ عبدالقادر کے مضامین کا اسلوب سادہ اور شُستہ مذاق کا حامل ہے۔ ان کے موضوعات میں تنوع تھا۔ سیاسی، معاشرتی، معاشی، مذہبی، ادبی، تحقیقی و تنقیدی ہر قسم کے مضامین لکھے۔ شیخ عبدالقادر کا اسلوب شگفتہ اور فعال اسلوب ہے۔ ان کے اسلوب نے ادب برائے ادب کی لاج بھی رکھی اور ادب برائے زندگی کو سہارا بھی دیا۔ سرسید کی عقلی نثر سے ہٹ کر شیخ عبدالقادر نے جو اسلوب وضع کیا وہ حرکت و حرارت، تازگی و دلکشی اور حُسن و جمال سے آراستہ اسلوب، انشائے لطیف کا علمبردار ہے۔ محمد حنیف شاہد "مقالاتِ عبدالقادر" میں لکھتے ہیں:

"ان کا موضوع خواہ ادبی ہو یا سیاسی، خارجی ہو یا داخلی، تاریخی ہو یا ثقافتی وہ ایک

یکساں مہارت اور ایک ہموار انداز سے بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔"[۳۰]

شیخ عبدالقادر لفظوں کے زیر و بم سے اچھی طرح واقف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ الفاظ ہمیشہ ان کی گرفت میں رہے۔ وہ چھوٹے چھوٹے فقروں سے عبارت میں حُسن پیدا کر دیتے ہیں۔ ان کی تحریروں کو بار بار پڑھنے کے بعد بھی دوبارہ پڑھنے کو جی چاہتا ہے کیونکہ ہم آہنگی کی بنا پر اعلیٰ ادبی تخلیقات انہوں نے اردو ادب کو دیں۔ نیز ان کے ہاں موضوع اور اسلوب کی ہم آہنگی نے ان کے موضوعات کو زندہ اور متحرک و فعال موضوع بنا دیا۔ ان کے اسلوب میں قدرے جوش ہے لیکن یہ جوش و جذبہ ان کے اسلوب کے لئے زہرِ قاتل نہیں ثابت ہوتا اور نہ ہی ان کی تحریروں کو بوجھل کر دیتا ہے۔ "معیارِ زیست" مضمون میں لکھتے ہیں:

> "اب وہ وقت آ گیا ہے کہ اہل ملک معیارِ زیست پر باقاعدہ غور کر کے یہ طے کر لیں کہ اسے آئندہ گھٹانا ہے یا بڑھانا اور جو فیصلہ ہو اس کے مطابق اس صورت سے عمل کریں کہ سب طبقات قریب قریب یکساں اس قرارداد سے متاثر ہوتے رہیں۔"[۳۱]

پہلے بھی واضح کر چکے ہیں کہ رومانیت کی تحریک مخزن کے ذریعے شروع ہوئی اور جمالیاتی حُسن اس کا خاصہ رہا۔ شیخ عبدالقادر کا اسلوب رومانوی ہے۔ انہوں نے طبع زاد مضامین بھی لکھے اور ترجمہ شدہ مضامین بھی۔ ان کے ترجمہ شدہ مضامین ان کی ذہانت و متانت کا بین الثبوت ہیں۔ ان کی نثر میں بہاؤ اور روانی ہے۔ اسلوب بیان واضح اور روشن ہے۔ محاورے کا استعمال بھی ان کے اسلوب کو بوجھل و ثقیل نہیں بناتا بلکہ جہاں کہیں انہوں نے محاورے کا استعمال کیا ہے بہت خوب کیا ہے مثلاً:

> "خدا جانے کس مقبول گھڑی میں سید احمد خاں مرحوم کی زبان سے "زندہ دلانِ پنجاب" کا فقرہ نکلا تھا کہ تیر کی طرح نشانہ پر بیٹھا اور جزوِ زبان ہو گیا۔"[۳۲]

اس پیرے میں "مقبول گھڑی"، "زندہ دلانِ پنجاب"، "تیر نشانہ پر بیٹھنا" اور "جزو زبان ہو گیا" یہ چار محاورے اس جملے میں آئے ہیں۔ اگر ایک محاورے کو بھی نکال لیا جائے تو یہ عبارت بے رونق ہو جائے گی۔ محاورے کا کمال یہ ہی ہے کہ اسے برتتے ہوئے اسلوب ایسا ہو کہ محاورہ زبان سے ہم آہنگ ہو جائے۔ شیخ عبدالقادر کے ہاں محاورے کا استعمال برجستہ ہوتا ہے اور یہ ہی ان کی نثر کی خوبی اور دلکشی ہے۔ سادہ اور دلنشیں اندازِ بیان نے نہ صرف ان کی نثر کو مقبول بنایا بلکہ اردو زبان کے فروغ و پھیلاؤ میں بھی

حصہ لیا اور یوں اردو زبان نئے رنگ و آہنگ اور جدید لسانی رویوں سے آشنا ہو سکی۔ زندگی نشیب و فراز سے گزرتی ہے اور دکھ سکھ زندگی کا لازوال سرمایہ ہیں۔ ان ہی غم و الم اور حزن و ملال میں اگر کوئی ادیب اور نثار چند لمحے شگفتگی کے مہیا کر دے تو زندگی کا دکھ کچھ لمحوں کو ٹل بھی جاتا ہے۔ طبیعت ہشاش بشاش ہو جاتی ہے اور بسا اوقات یہ طنز و مزاح اصلاحِ معاشرہ بھی کر دیتا ہے۔ طنز و مزاح کی اگر تعریف کی جائے تو طنز ایسا نشتر ہے جو کٹاری بن کر سامع کے دل پر لگتا ہے اور ذہنی و جسمانی ناسوروں کو کاٹ کر پھینک دیتا ہے۔ طنز کڑوا کسیلا اور تلخ ضرور ہوتا ہے لیکن اگر یہ ہی طنز معیار سے گر جائے تو پھڑک پن میں تبدیل ہو جاتا ہے جو ریاکاری اور رکاکت میں شمار کیا جاتا ہے۔ طنز کی ریاکاری قاری کو نہ صرف چوکنا کرتی ہے بلکہ اصلاح برائے طنز سے نابلد ہو کر قاری طنزیہ علاج سے بے بہرہ ہو جاتا ہے اور مزید گھٹن اپنے اندر محسوس کرنے لگتا ہے۔ خواجہ عبدالغفور اپنی کتاب ''طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ'' میں لکھتے ہیں:

> ''طنز نگار سرجن ہوتا ہے، جراح ہوتا ہے، احساسِ کمتری کا شکار ہوتا ہے، کچھ نہ کہہ کر سب کچھ کہنے کے فن میں ماہر ہوتا ہے، بددماغ ہوتا ہے، بے درد ہوتا ہے، بے لحاظ ہوتا ہے۔''۳۳

اردو ادب میں مزاح کا تجزیہ کرتے ہوئے پہلا نام غالب کا سامنے آتا ہے جو فطرتِ انسانی کے ماہر نباض ہیں۔ سہل ممتنع میں وہ ایسے فقرے لکھ جاتے ہیں جو ظریف بھی ہوتے ہیں اور لطیفِ بیاں اور شوخی ندرت کے ساتھ ساتھ فلسفے کی گہرائی سے بھی بھرپور ہوتے ہیں۔ چُست اور جاندار لفظ ان کے اسلوب کو اضطرابی کیفیت سے دوچار کرتے ہیں۔ ان کے جملوں فقروں میں تکرار نہیں ملتی۔ اس لئے ان کے ہاں نثر بھی مرہم بن جاتا ہے۔ خطوطِ غالب میں اسلوب کے کئی رنگ نظر آتے ہیں۔ غالب کا مزاج شوخ ہے اور انفرادی سوچ و فکر بھی ان ہی کا خاصہ ہے۔ غالب کا اسلوب تبسم پر منحصر ہے لیکن کہیں وہ ظرافت سے اپنے اسلوب کو خوشگوار لہجے عطا کرتے ہیں۔ ان کے اسلوب کی خوش طبعی بذلہ سنجی، شستہ مزاجی ان کے اسلوب کو بھونڈا اور بدنما، بدہیت ہونے سے بچا لیتی ہے۔ ان کے اسلوب کی ایک بات یہ ہے کہ ان کے مزاحیہ اسلوب میں رمز و کنایہ کا بھی عمل دخل ہے۔ یہ خطوط ۱۸۵۷ء کے نوحہ کے بعد لکھے گئے۔ اس لیے بیا کی بات غالب نے رمز و کنایہ میں ہی کی ہے۔ غالب کی تحریر کا اصل کمال ایجاز و اختصار ہے۔ بڑے سے بڑے مفہوم کو ایک دو فقرے میں سمو کر اسلوب کے حُسن کو بڑھا دیتے ہیں۔ غالب مقفیٰ و مسجع اسلوب کی نفی کرتے ہوئے ایک فی البدیہہ اسلوب قارئین ادب کو مہیا کرتے ہیں۔ ایسا اسلوب جس میں استدلال اور

منطق کے ساتھ ساتھ طنز وظرافت کے نقوش بھی نظر آتے ہیں۔

مرزا فرحت اللہ بیگ کے مضامین میں اسلوب عہدِ رفتہ کی کہانی سناتا نظر آتا ہے۔ان کے ہاں مشرقی اندازِ تحریر ملتا ہے۔ان کے مضامین میں مقصدیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے۔مزاح ان کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا اس لئے طنز وظرافت کا اچھوتا اور نادر انداز ان کی تحریروں میں نظر آتا ہے۔سبک اور نرم اسلوب کے مالک مرزا فرحت اللہ بیگ کے موضوعات میں ندرت اور تنوع ملتا ہے۔اسلوب کے ذریعے مرقع نگاری کرنے کا فن بھی انہیں آتا ہے۔اسلوب کے جوہر جب کھلتے ہیں تو ایک طرف تو لطفِ بیان کا احساس ہوتا ہے اور دوسری طرف لہجہ کی کاٹ انسان کو ہلا کر رکھ دیتی ہے۔برجستہ مکالمہ ان کے اسلوب کی خوبی ہے۔ وہ بات نہایت قرینہ اور سلیقے سے سمجھاتے ہیں اور اسلوب کی یہ شان ان کے ہاں نظر آتی ہے۔وہ حقائق کو طنز کی روشنی میں عیاں کرتے ہیں۔ان کی نثر روزمرہ بول چال کے قریب ہے۔لیکن جہاں محاورہ کا استعمال کیا ہے وہ بہت خوب ہے۔نذیر احمد کے شاگردِ رشید ہونے کے باوجود محاوروں کو ٹھونستے نہیں بلکہ محاورہ نگینے کی طرح ان کے اسلوب میں فِٹ ہو جاتا ہے۔فرحت کے ہاں شگفتہ طنز ملتا ہے۔وہ استہزا سے کام نہیں لیتے اور نہ ہی چبھتا ہوا مذاق ان کے مضامین میں نظر آتا ہے۔البتہ ان کا اسلوب برجستہ اور بے ساختہ ہے۔فرحت کے ہاں مزاح لفظوں کی بازی گری سے نہیں بنتا بلکہ ان کا اسلوب لفظوں سے دوستی کرتا ہے۔ مشرقی تہذیب کو سہارا دیتا ہے۔ان کے اسلوب کو بغور مطالعہ کریں تو ہمیں احساس ہوگا فرحت کا اسلوب عوامل ومحرکات کی نشاندہی بھرپور ادبی شعور کے ساتھ کرتا ہے۔ان کی زبان چٹخارے دار زبان ہے۔دلی کے رہنے والے تھے اسی لئے اسلوب میں دلی کی زبان ملتی ہے۔

اخلاقی نصیحت سے لبریز اسلوب اتنا دلکش اور سحر آفریں ہوتا ہے کہ جسے پڑھتے جاؤ اور سر دُھنتے جاؤ۔ پہلے پہل مرزا الم نشرح کے نام سے لکھتے رہے۔ان کے یادگار مضامین میں ''یادگار مشاعرہ''، ''پھول والوں کی سیر''، ''نذیر احمد کی کہانی''، ''ایک وصیت کی تکمیل'' میں ان کے اسلوب کے جوہر کُھل کر سامنے آئے ہیں۔ان کے اکثر مضامین قدیم دلی کی تہذیب بھی نظر آتی ہے ان کا اسلوب مرقع نگاری کا نمونہ ہے۔''نذیر احمد کی کہانی''، ''ایک وصیت کی تکمیل'' میں مرقع نگاری عروج پر ہے۔نئی تہذیب کی دلکشی اور پرانی تہذیب کی مٹتی اقدار کا نوحہ میں بھی ان کا اسلوب بڑی سچی تصویر مہیا کرتا ہے۔لفظ ان کے ہاں بولتے، مسکراتے اور حُجت کرتے نظر آتے ہیں۔فرحت کے ہاں تحقیقی عنصر بھی بعض مضامین میں نظر آتا ہے۔

جیسے خواجہ احسان، انشاء اور نظیر اکبر آبادی پر ان کے تحقیقی مضامین ملتے ہیں۔ یہ جستجو تحقیقی جستجو کے قریب ترین تو ہے لیکن فرحت اللہ بیگ محقق نہیں، تحقیق ان کا میدان نہیں وہ مضمون نگار ہیں اس لئے ان کے مضامین کی شان ان کی مضمون نگاری ہے نہ کہ تحقیق نگاری۔

رشید احمد صدیقی کے ہاں فکاہی وطنزیاتی اسلوب نظر آتا ہے۔ وہ ایک ماہر سرجن کی طرح معاشرے کی ناہمواریوں کی کاٹ چھانٹ کرتے ہیں۔ ان کا اسلوب طنزیہ کاٹ رکھتا ہے۔ ڈاکٹر رؤف پاریکھ، رشید احمد صدیقی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> "رشید احمد صدیقی کو ان کے مخصوص اسلوب کی بنا پر جس میں قول محال (Paradox) اور حاضر جوابی (repartee) شامل ہے۔"[۳۴]

رشید احمد صدیقی علی گڑھ سے وابستہ رہے اس لئے ان کے ہاں علی گڑھ کی فضا نظر آتی ہے۔ رشید احمد صدیقی کے اسلوب میں طنزیہ فکر، اختصار، معنی آفرینی، شگفتہ بیانی اور نفاست و معنویت نظر آتی ہے۔ ان کے ہاں طنز کٹیلا ہے وہ معاشرے سے موضوعات کا چناؤ کر کے اعلیٰ فکری صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے اور معاشرے کی کمزوریوں کو طنز کا نشانہ بناتے لیکن اسلوب کی نفاست سے دامن نہ چھڑاتے اس لئے ان کے ہاں رکاکت اور پھکو پن نظر نہیں آتا ہے۔ ان کا لہجہ عامیانہ نہیں ہے اور نہ ہی رکیک۔ ان کا اسلوب معتبر اور عالمانہ اسلوب ہے مثلاً اپنے مضمون "گھاگھ" میں لکھتے ہیں:

> "گھاگھ کا مسلک صرف گھاگھیت ہے وہ جذبات سے یکسر معرا ہوتا ہے۔ وہ فکر مجسم اور انائے مثل ہوتا ہے۔ اپنے مقاصد کے حصول میں نہ جاہل کو جاہل سمجھتا ہے اور نہ عالم کو عالم۔"[۳۵]

ان جملوں میں گھاگھ پر گہرا طنز کر کے گھاگھ کی اصلیت بے نقاب کر دی۔ رشید احمد صدیقی بات کہنے کے فن میں طاق نظر آتے ہیں۔ بڑے سے بڑے نکتے کو بھی مختصر الفاظ میں اس طرح بیان کرتے ہیں کہ مدعا بھی پورا ہو جائے اور عبارت طوالت سے بھی بچ جائے۔ رشید احمد صدیقی بات سے بات پیدا کرنے کے فن میں ماہر ہیں جس طرح ان کے موضوعات میں تنوع ہے ویسے ہی ان کا اسلوب بھی نئی جہتیں کھولتا نظر آتا ہے وہ نئے نئے الفاظ کے ذریعے اپنے جدید خیالات سے مزاح نگاری کو فروغ دیتے ہیں مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں:

> "آرٹ کا خبط دراصل آرٹ کا خبط نہیں ہوتا بلکہ اپنے آرٹ کا پروپیگنڈا ہوتا

ہے۔"۳۶

بہترین طنز وہ ہے جو متعلقہ شخص کو بھی محظوظ کرے اور رشید احمد صدیقی کے اسلوب میں یہ خاصیت ہے کہ وہ جس فرد، معاشرے پر طنز کر رہے ہوتے ہیں وہ اپنی خامیوں پر خود بھی مسکرا اٹھتا ہے اور اس کا ضمیر جاگ اٹھتا ہے۔ مختصر جملے میں کتنا خوبصورت اور گہرا طنز پوشیدہ ہے اور مختصر الفاظ میں اتنی بامعنی بات کہنا رشید احمد صدیقی کا ہی کمال ہے۔ پطرس بخاری مزاح نگاری کا ایک اور بڑا نام ہے۔ پطرس بخاری لفظوں سے ماحول بناتے ہیں اور پھر اس ماحول میں قاری کو اپنے ہمراہ لے جاتے ہیں۔ ان کی ان کی مزاح نگاری سے قاری لطف اندوز بھی ہوتا ہے اور اپنے اوپر طنز کو بھی سہل انداز میں سہہ لیتا ہے۔ مثلاً "ہوسٹل میں پڑھنا" کا آخری جملہ کتنا دلچسپ اور کٹیلا ہے ملاحظہ ہو:

"ہم پر تو جو ظلم ہوا سو ہوا۔ یونیورسٹی والوں کی حماقت ملاحظہ فرمایئے کہ ہمیں پاس کر کے اپنی آمدنی کا ایک مستقل ذریعہ ہاتھ سے گنوا بیٹھے۔"۳۷

پطرس خالص مزاح نگار تھے۔ پطرس کی ذہانت ان کے اسلوب میں جدت پیدا کرتی ہے۔ وہ اپنے طرز کے موجد تھے۔ اپنے ماحول کا گہرا مشاہدہ کر کے پطرس اپنے لئے موضوعات چنتے ہیں اور انہیں موضوعات کو بڑے سلیقے سے اپنے اسلوب میں پرو دیتے ہیں۔ پطرس انسانی نفسیات سے واقف ہیں۔ تبھی "مرید پور کا پیر" ہو یا "مرزا کی بائیسکل"، "ہاسٹل میں پڑھنا" ہو یا "میبل اور میں" ہر مضمون میں انسانی کمزوریوں اور کوتاہیوں کو سہل اور سادہ طرز تحریر میں بیان کرتے ہیں کہ قاری باوجود درد سے کراہنے سے مسکرائے بغیر نہیں رہتا۔ پطرس اگرچہ انگریزی ادب کے پروردہ تھے لیکن ان کے مضامین انگریزیت سے نتھی نہیں تھے۔ پطرس لفظی ہیر پھیر سے مزاح میں رنگ بھرتے ہیں۔ ان کا اسلوب شگفتہ اور لطیف ہے وہ جوش اور شدت جذبات میں نہیں بہتے۔ پطرس کی مزاح نگاری معاشرے سے محبت کرتی ہے۔ اس کی دلجوئی کرتی اور اس کی اصلاح کے لئے کوشاں رہتی ہے۔ تبھی وہ فکری اسلوب میں پوشیدہ مزاح سے اپنے موضوعات کو جلا بخشتے ہیں۔ "لاہور کے جغرافیہ" کے یہ جملے ملاحظہ ہو:

"لاہور کی سب سے مشہور پیداوار یہاں کے طلبا ہیں جو بہت کثرت سے پائے جاتے ہیں اور ہزاروں کی تعداد میں دساور کو بھیجے جاتے ہیں۔ فصل شروع سرما میں بوئی جاتی ہے اور عموماً اواخر بہار میں پک کر تیار ہوتی ہے۔"۳۸

پطرس بخاری کے ہاں تحریف کی بہترین امثال موجود ہیں۔ لفظوں کے الٹ پھیر سے وہ سامعین

کے لئے ایک نئی فضا قائم کر دیتے ہیں۔ وہ سامعین کے لئے ایک نئی فضا قائم کر دیتے ہیں جو ان کی ذہانت اور متانت کا بھرپور عکاس ہے۔عظیم بیگ چغتائی کے باب طنز کی جگہ مزاح کا پہلو نظر آتا ہے وہ بذلہ سنج ہیں۔ انہوں نے زندگی کے ہر پہلو پر قلم اٹھایا ہے وہ کسی نہ کسی موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے مسکراہٹوں کے ساتھ ساتھ معاشرے کی کوتاہیوں، کمزوریوں پر گہری چوٹ کر جاتے ہیں اور یوں اپنے مضامین میں اپنا مقصد اور اپنا مدعا پورا کر جاتے ہیں۔ سادہ سہل اور عام فہم زبان میں اپنا مافی الضمیر بیان کرتے ہیں۔ عظیم بیگ چغتائی کی ظرافت میں فلسفیانہ رنگ کی تلاش بے سود ہے۔ وہ اپنے قہقہوں، مسکراہٹوں اور مزاح کو اپنے غم کا مداوا سمجھتے ہیں۔ اس لیے نشاط انگیز پرمسرت یہ مضامین اپنے اندر درد و کسک بھی رکھتے ہیں۔ عظیم بیگ چغتائی کے ہاں بے ساختگی، برجستگی کے ساتھ ساتھ ان کی تحریروں میں آمد کا گمان ہوتا ہے۔

تحقیق حقائق کی جستجو، جدوجہد اور تلاش ہے۔ کسی گمنام فن پارے کو منظر عام پر لانا اور اس کے مآخذ و مصادر کا کھوج لگانا تحقیق ہے۔ تحقیق کے میدان میں وہی کامیاب محقق کہلاتا ہے جس کا مطالعہ وسیع ہو۔ جس کا مشاہدہ عمیق ہو جو ماہر لسانیات ہو اور جسے ماضی و حال کی تخلیقات کا بھرپور علم ہو۔ مولوی عبدالحق بابائے اردو ایک محقق، نقاد اور مدون تھے۔ آپ کا نام اردو تحقیق میں بڑے احترام سے لیا جاتا ہے۔ آپ نے فن پاروں کے دفینے کو منظر عام پر لا کر اردو ادب پر جو احسانات کیے ان سے کسی کو بھی انکار نہیں۔ انہوں نے اردو زبان و ادب کی خدمت میں اپنی زندگی صرف کر دی۔ تنقید و تحقیق کے نئے زاویے عطا کیے۔ ہمیشہ اردو زبان کے تحفظ اور فروغ کے لئے کوشاں رہے۔ مولوی عبدالحق کا اسلوب خالص تحقیقی اسلوب ہے۔ اسلوب دو طرح کا ہوتا ہے۔

۱۔ تخلیقی اصناف کا اسلوب

۲۔ تحقیق و تنقید کا اسلوب

تخلیقی اسلوب تخلیقی اصناف کا اسلوب ہے جیسے ناول، ڈرامے، افسانے، انشائیہ وغیرہ کا اسلوب ہے جو حُسن کاری سے مزین ہوتا ہے اور جذباتی فقرے اور شاعرانہ بات اس میں کی جاتی ہے لیکن تحقیق و تنقید کا اسلوب میں شاعرانہ بات نہیں کی جاتی بلکہ حقائق پر بات کرتے ہیں۔ تحقیقی اسلوب میں ہم اِدھر اُدھر کی بات نہیں کرتے بلکہ بڑے محتاط انداز میں خالص علمی سطح پر چھان بین کر کے کسی نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔ مولوی

عبدالحق کے تحقیقی اسلوب کا مطالعہ کریں تو ان کا تحقیقی اسلوب منطقی اور معروضی معیارات پر مبنی دکھائی دیتا ہے انہوں نے علمی نکتہ نگاہ سے بات کی ہے۔مولوی صاحب کے تحقیقی کام میں تاریخی شعور بھی نظر آتا ہے۔ تحقیقی اسلوب منظر نگاری سے مُبرا ہوتا ہے۔اسی لئے مولوی عبدالحق کے ہاں حُسن اور خوبصورتی کے بیان نہیں نظر آتے اور نہ ہی واقعات و جزئیات کو چند حسین مرقعوں میں انہوں نے پیش کیا ہے بلکہ سادہ، عام فہم اور فی البدیہہ اندازِ تحریر اختیار کیا۔ جو تحقیقی کھوج، تحقیقی وجوہات اور تحقیقی اصولوں پر مبنی ہے۔ ''مقدمہ معراج العاشقین'' کا یہ نثر پارہ ملاحظہ ہو:

> ''اسی اثنا میں مولوی غلام محمد صاحب انصاری وفا، مدیر ''تاج'' نے ایک رسالے ''معراج العاشقین'' کا پتا ڈاکٹر محمد قاسم صاحب کے کتب خانے سے لگایا اور جب انہوں نے مجھے یہ نسخہ دکھایا تو چند سطریں پڑھنے کے بعد مجھے یہ خیال آیا کہ اس کا ایک نسخہ میرے پاس بھی موجود ہے۔ نکال کر دیکھا تو ایک ہی کتاب کی دو نقلیں تھیں۔البتہ کہیں کہیں الفاظ اور عبارت کا اختلاف تھا جو قلمی نسخوں میں اکثر پایا جاتا ہے۔مگر ڈاکٹر صاحب کے نسخے میں ایک بات کام کی نظر آئی کہ اس کے آخر میں یہ تحریر ہے کہ یہ ایک قدیم نسخے سے جس کا سنہ کتابت سنہ ۹۰۶ ہجری تھا نقل کیا گیا ہے۔اصل عبارت یہ ہے۔''[۳۹]

مولوی صاحب نے لسانیات، شعر و ادب پر بھی تحقیق کی ہے۔ ''اردو کی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا کام''، ''مرحوم دہلی کالج''، ''مقدمہ قطب مشتری''، ''مقدمہ سب رس''، ''مقدمہ باغ و بہار''، ''قواعد اردو''، ''مقدمہ گلشنِ ہند'' و دیگر تحقیقی و تدوینی کام نے مولوی عبدالحق کو ایسا محقق و مدون ثابت کیا جس کی محققانہ نظر جامع اور واضح ہے اور ان کا اسلوب اپنے موضوع سے مطابقت رکھتا ہے۔مولوی عبدالحق نے دکنی ادب پر جو کام کیا ہے اس کی تفصیل اوپر بھی دی ہے۔ یہ تحقیقی کام اپنی نوعیت کا منفرد کام ہے۔ایک ایک فن پارے کی کھوج کرنا اور اسے تحقیق اسلوب میں پیش کرنا دقت طلب تھا۔مولوی صاحب نے باریک بینی سے ان فن پاروں کا کھوج لگایا اور معروضی و منطقی اسلوب میں ان تحریروں کا احاطہ کیا انہوں نے مختلف رسالے بھی نکالے جن میں سہ ماہی رسالہ ''اردو'' جنوری ۱۹۲۱ء سے نکالا یہ خالص تحقیقی رسالہ تھا۔اس پر باب چہارم پر تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے۔مولوی صاحب نے ماہر لسانیات کی طرح اردو قواعد اور لغت کبیر بھی مرتب کی اور اردو زبان کے لحظ کے لئے تقاریر کیں۔ جلسے منعقد کیے۔ مضامین لکھے اردو زبان کے فروغ اور تحفظ میں

مولوی صاحب کے کام کو آج بھی سراہا جاتا ہے۔

تحقیق میں حافظ محمود شیرانی ایک معتبر نام ہے۔ انہوں نے ''پنجاب میں اردو'' لکھی یا مجموعہ نغز کی تدوین کی یا فردوسی کے شاہنامے پر مقالے لکھے یا ''شعر العجم'' پر تحقیق و تنقید کی یا پھر اورینٹل کالج میگزین میں علم وعروض، علم مسکوکات کتب نصاب اور تغیر پر مضامین لکھے ان کا تحقیقی اسلوب تحقیقی اخلاقیات سے مُبرا نہیں۔ تحقیق میں صداقت ان کا پہلا ایمان ہے اور جھوٹ سے احتراز ان کا اصول۔ شیرانی کا تحقیقی اسلوب تحقیقی خیانت کی نفی کرتا ہے۔ ان کا تحقیقی کام محنتِ شاقہ کا نتیجہ ہے ان کا تحقیقی اسلوب علمی نکتہ نگاہ سے بات کرتا ہے اور نامعلوم سے معلوم کی کھوج لگایا ہے۔ ان کی تحریروں کا صوتی لب و لہجہ کسی محاکاتی نثر یا تخیلاتی ترفع کا متقاضی نظر نہیں آتا بلکہ فکری انتشار اور معاملہ بندی سے پرے یہ اسلوب شواہد و مواد کے مطابق گفتگو کرتا ہے لیکن مواد کو جمع کرنا ہی تحقیق نہیں ہوتی بلکہ مواد کی چھان بین کر کے اسے صحیح سمت عطا کرنا تحقیق ہے اور شیرانی کا محققانہ ذہن اس نکتہ سے پوری طرح آگاہ تھا۔ تبھی ان کا تحقیقی اسلوب منطق و اصطلاحات پر مبنی ہے کہیں بھی بے ربط ترتیب اور جھول نظر نہیں آتی۔ تحقیق کا اسلوب شواہد کی نشاندہی کرتا ہے اور علم و آگہی کے ذریعے فن پارے کا کھوج لگاتا ہے۔ تحقیق اصطلاحات کو شامل تحقیق کرتا ہے اور شیرانی کے اسلوب میں تحقیقی اصطلاحات بھی نظر آتی ہیں اور اختلاف نسخ کے ذریعے اساسی نسخے تک پہنچنے کا ٹھوس اور واضح منطقی عمل بھی ملتا ہے اور شواہد کی نشاندہی بھی کی جاتی ہے۔ خارجی و داخلی شہادتوں کے حوالے سے بھی تحقیق کی جاتی ہے۔ ''رباعی کے اوزان یاد رکھنے کا ایک آسان طریقہ'' میں لکھتے ہیں:

> ''رباعی یا ترانہ ایرانیوں کی ایجاد ہے۔ بقول دولت شاہ تیسری صدی ہجری کے وسط میں بدعہد یعقوب صفار اور بقول شمس الدین محمد بن قیس اس صدی کے اواخر میں رباعی ایجاد ہوئی۔''[۴۰]

شیرانی کی کارِ تحقیق میں جو اسلوب نظر آیا وہ سنجیدہ اور علمی اسلوب ہے۔ سماجی تحقیق ہو یا تاریخ تحقیق ادبی تحقیق ہو یا جسمانی تحقیق شیرانی کا اسلوب کہیں بھی انتشار اور جھول کا شکار نہیں ہوا۔ بلکہ حقیقت کی تلاش میں انہوں نے معتبر ذرائع کے ساتھ ساتھ معتبر اسلوب کا اہتمام بھی کیا۔ شیرانی کا ذوق تحقیق بھی برا نہیں اس لئے ان کا طرزِ تحریر اول تا آخر تک محققانہ ہے۔ نصیر الدین ہاشمی، شوکت سبزواری، مولوی محمد شفیع کا لکھنا ہے۔

تنقید اہم ہے اور تنقید نگار فن پارے کے حسن و قبیح پر تفصیلی نگاہ ڈال کر کسی نتیجہ پر پہنچتا ہے۔ تنقید

اگر خواہ مخواہ کی جائے تو وہ بے محل ثابت ہوتی ہے۔تنقید کے سُوتے انسانی باطن سے پھوٹتے ہیں۔تنقید فیصلہ سناتی ہے۔تنقید میں تشریح کی جاتی ہے حکم لگایا جاتا ہے اور پھر تعین مراتب کا مرحلہ آتا ہے۔ جو نقاد ان تینوں مراحل سے بہ آسانی سے گذر جاتا ہے وہ ہی کامیاب نقاد کہلاتا ہے۔ نیز تنقیدی اسلوب بھی اپنی الگ اہمیت رکھتا ہے۔اختر حسین رائے پوری کے ناقدانہ کام کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ وہ ترقی پسند نقاد ہیں اور ان کا اسلوب بھی سادہ ہے لیکن کہیں کہیں ان کا اسلوب پُرشکوہ بھی ہو جاتا ہے۔ اختر حسین رائے پوری کا فکری سرمایہ تنقید پر مشتمل ہے اس میں ''ادب اور انقلاب'' سنگِ میل اور روشن مینار ہے۔ اختر حسین رائے پوری کے ہاں تنقیدی بصیرت میں ترقی پسند تحریک کے نقوش نظر آتے ہیں۔ وہ مارکسی تنقید کے پہلے باقاعدہ تنقید نگار ہیں۔ ان کا تنقیدی اسلوب ادب و تنقید کی گتھیاں سُلجھاتا نظر آتا ہے۔ان کے ہاں مقصدی اور افادی تنقید ملتی ہے۔ان کا اسلوب تنقید ماحول اور اقتصاد کے گرد گھومتا ہے اور یہ ان کی انتہا پسند ہے انہوں نے اردو تنقید کو نئی راہوں سے متعارف کرایا ہے۔ان کا تنقیدی اسلوب سماجی و اشتراکی ہے۔ حُسن و جمال اور سرور و انبساط ان کے اسلوب کا دائرہ کار نہیں بلکہ سماج اور معاشرے کا اثر ان کے اسلوب میں نظر آتا ہے۔ وہ اپنے مضمون ''ادبی ترقی پسندی کا صحیح مفہوم'' میں لکھتے ہیں:

> ''آج سچے ادب کی تخلیق صرف اس وقت ممکن ہے جب شخصیت ماحول کی مخالفت سے بے نیاز ہو کر حق کی اذن پر لبیک کہے۔ ماحول کو بدلنے سے پہلے ہمیں خود کو بدلنا ہو گا۔ لیکن ہم ایسا نہیں کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم جو کچھ لکھتے ہیں۔اس میں حقیقت نہیں ہوتی۔ وہ کذب و افترا کے سوا کچھ نہیں ہوتا اور اگر ہماری طبیعت حق کی طرف جاتی ہے تو ماحول سے مانوس نہ ہو کر نامراد رہ جاتی ہے۔''[۱۴]

اختر حسین رائے پوری کے اسلوب میں مارکسی رنگ نظر آتا ہے اور ان کا اسلوب فنی اور جمالیاتی پیراہن کا متقاضی نہیں۔ وہاں تو تلخ کڑوی حقیقتوں کی نشاندہی کی گئی۔صناع اور مہارت سے انہیں قطعی دلچسپی نہیں بلکہ ٹھوس واضح، منطقی اور دلائل سے بھرپور اسلوب ان کی ناقدانہ تحریروں میں جھلکتا ہے۔ اختر حسین رائے پوری کے اسلوب کی تعمیر حقیقت پر ہوئی انہوں نے ماورائی نثر سے احتراز کیا اس لئے زندگی اور ادب کے رشتے کو برقرار رکھا۔اسی لئے ان کے ہاں تاثراتی تنقید کا شائبہ تک نہیں ہے اور غیر جانبدارانہ پرکھ ان کا اصول اولین ہے۔

اختر حسین رائے پوری زبان کا استعمال بڑے محتاط انداز میں کرتے رہے۔کئی زبانوں پر عبور رکھنے

کی وجہ سے ہندی، فارسی، بنگالی، فرانسیسی، سنسکرت کے لفظ ان کے اسلوب میں شامل ہو جاتے تھے اور یہ ان کے اسلوب کو متاثر بھی کرتے رہے لیکن ''ادب اور زندگی'' کے باہمی ربط نے انہیں انتہا پسند نہ ہونے دیا کہیں کہیں جوش و جذبہ سر اٹھاتا ہے لیکن جلد ہی وہ اس پر قابو پا لیتے ہیں اور اسلوب کو سہل نرم بنا دیتے ہیں۔ اختر حسین رائے پوری کا اسلوب تنقیدی الفاظ کا گورکھ دھندا نہیں بلکہ فکری اسلوب میں زندگی اور اس کا شعور نظر آتا ہے۔ انتظام حسین، عزیز احمد، سردار علی جعفری و دیگر اربابِ نثر کے اسلوب میں خالصتاً عالمگیری اسلوب نظر آتا ہے۔ اشتراکی تعمیر، انقلابی سوچ کے حامل یہ اربابِ نثر سرمایہ درانہ نظام کی بیخ کنی کرتے ہیں۔ ان کا اسلوب شعری حسن و جمال سے مبرا ہے۔ شعور و آگہی، ظلم و ناانصافی، حقوق و فرائض کی بات کرنے والے ان نثاروں کا اسلوب محنت کش کی پختی و سکستی حیات کا علمبردار ہے انھوں نے صناعات برائے صناعات کے نظریہ کو ترک کر کے واضح، سادہ پُر حقیقت، زندگی سے قریب تر اسلوب اختیار کیا۔ جس میں ظلم، کشمکش، جبر اور محرومی کی نشاندہی کی گئی اور جو حسن کو رد تو نہیں کرتا لیکن حسن میں کھونے جانے سے انکاری ہے حسن میں مخفی بیچارگی کو اپنے موضوع و اسلوب کا مطمع نظر بنایا۔

نصیرالدین ہاشمی کی کتاب ''دکن میں اُردو'' ۱۹۲۳ء میں سامنے آتی ہے۔ علامہ اقبال نے ایک خط میں اس کی تعریف بھی کی اور لکھا ہے کہ پنجاب میں اردو زبان کی تحقیق پر مصالحہ بھی موجود ہے نصیرالدین ہاشمی براہِ راست لسانی تحقیق کے ماہر نہیں لیکن پھر بھی اُن کے اس لسانی تحقیق کے سامنے آنے پر ''دکن میں اُردو'' کو اولیت حاصل ہے۔ اس کتاب کے بعد حافظ محمود شیرانی کی کتاب ''پنجاب میں اُردو'' ۱۹۲۸ء میں ہمارے سامنے آتی ہے اور شیرانی نے کھوج لگا کر اردو زبان کا مولد پنجابی کو قرار دے کر اس بحث کو ختم کر دیا ہے۔ شیرانی کا بطور محقق ایک مستند اور ٹھوس کارنامہ ہے۔ شوکت سبزواری کی کتاب نظریہ ساز کتاب ہے ''اردو زبان کا ارتقاء'' ان کا پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ ہے اور شوکت سبزواری ماہر لسانیات ہیں۔ وقار عظیم بنیادی طور پر فکشن کے استاد ہیں ان کے ہاں تخلیقی اسلوب نظر آتا ہے۔ بنیادی طور پر انہوں نے داستان وافسانے پر کام کیا ہے۔ تاریخ ماضی کے جھروکے میں جب جلوہ گر ہوا کرتی ہے تو شان وشوکت ،تمکنت، عزو جمال وجلال، حسن ادا قاری کے لیے سامان تسکین مہیا کرتے ہیں۔ تاریخی لب ولہجہ حقائق وسنائن پر مبنی ہوتا ہے۔ تاریخی مضامین میں ہوا میں گرہ نہیں لگائی جاتی بلکہ ٹھوس اور مدلل ثبوت مہیا کیے جاتے ہیڈ۔ اور اس کے لیے تحقیق وجستجو، انتھک محنت، عمیق مشاہدے ومطالعہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ تبھی کوئی محقق تاریخ



کے گوشوں کو بے نقاب کر سکتا ہے ۔مشاہیرِ تاریخ عمارات،باغات،شخصیات،سرائے ودیگر .....پر مبنی ہوتی ہے ۔شمس اللہ قادری ،مرزا سعید اور حسن برنی کے تاریخی مضامین اہم ہیں ۔شمس اللہ قادری اور مرزا سعید کے تاریخی مضامین اپنے دور کے رسائل میں نظر آتے ہیں ۔رسائل پر ہم سیر حاصل گفتگو کر چکے ہیں ۔حسن برنی کے مضامین ''مقالات برنی'' کے نام سے دو جلدوں میں شائع ہوئے ہیں ۔اسلامی شان وشوکت پر یہ تاریخی مضامین تاریخ کی اہمیت اور عظمت کے عکاس ہیں ۔تاریخی مضامین نہ صرف معلومات مہیا کرتے ہیں بلکہ یہ حقائق سے بھی پردہ اٹھاتے ہیں اور اعدادوشمار کے ذریعے تاریخی ادوار کی نشاندہی بھی کرتے ہیں۔

تاریخی مضامین لکھتے وقت تاریخی اسلوب کی اہمیت مسلم ہے ۔لفظی گورکھ دھندوں میں لپٹے تاریخی موضوعات کا تحقیق وجستجو سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا اور ایسے مضامین قاری کو بھٹکانے کے سوا اور کوئی کام سر انجام نہیں دیتے ۔تاریخی اسلوب میں اختلاف کی گنجائش نہیں ہوتی ۔اعدادوشمار مستند ہونے چاہئے ۔اور انداز بیان گرچہ خشک تو نہیں ہو لیکن شوخ اور تخیل آمیز بھی نہ ہو ۔زبان وبیان سادہ،عام فہم لیکن علمی وتحقیقی ہونا چاہئے۔ جہاں تاریخ واقعات میں اختلاف کرنا ہی مورخ کی ذہانت وقابلیت کا خاصہ ہونا چاہئے ۔مورخ جو بات بھی کرے وثوق سے کرے لہجہ کا جھول تاریخی اسلوب کو داغدار کر دیتا ہے ۔تاریخی اسلوب عالمگیریت کا حاصل ہونا چاہئے ۔مورخ کا اسلوب اس بات کی بھی نشاندہی کرے کہ وہ عالمی زبانوں پر عبور رکھتا ہے ۔مورخ کا انداز بیان محتاط اور معتدل ہونا چاہئے ۔لہجہ کی پھسلن مورخ کی نالائقی کی چغلی کھاتی نظر آتی ہے ۔جس مورخ کو تاریخی شہادتوں اور واقعات پر عبور ہو گا وہ ہی مورخ بااعتماد طریقے سے ان کو اپنے مضامین میں پیش کر سکے گا ۔حسن برنی کے تاریخی مضامین ان کے بااعتماد مورخ ہونے کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ اردو مضمون نگاری کے اہم اسالیب نے اردو ادب کو وسیع کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے ۔آج اردو زبان سائنس وٹیکنالوجی کی زبان کو بھی اپنے اندر احسن طریقے سے سمو سکتی ہے ۔اس گلوبل ویلج میں موضوع ،اسالیب کی بنا پر دنیا کی تیسری یا چوتھی بڑی زبان بن چکی ہے ۔



حواشی

۱۔ ارسطو، "بوطیقا" ترجمہ عزیز احمد، کراچی: انجمن ترقی اُردو، پاکستان، اشاعت ششم، ۲۰۰۱ء، ص: ۸۳

۲۔ طارق سعید، اسلوب اور اسلوبیات، لاہور: نگارشات، میاں چیمبرز، ٹمپل روڈ، ۱۹۹۸ء، ص: ۱۷۰

۳۔ Mrs Rubina Kamran Thesis,"The teaching of stylistics at the Post-Graduate, Level in Pakistan Oniversties" The National University of modren languages Islamabad Pakistan May 2001, Page 6

۴۔ Jennifer Uglow,Walter pater, Essays on Literature and Art Dent, London Rowman and Littlefield totowa, N.J, 1973 page 71.

۵۔ EZRA POUND, ABC of Reading" Faber and Faber 24 Russel Square London, Year not shown page 28

۶۔ Roger folwer, "Essay on Style and Language", Roultedge and kegan paul London and Henley, Reprinted in 1981, page 3.

۷۔ عبد اسلام، عمومی لسانیات، کراچی، رائل بک کمپنی، ۱۹۹۳ء، ص: ۱۲

۸۔ Mrs Rubina Kamran, Thesis "The teaching of stylistics at the Post-Graduate, Level in Pakistan Oniversties" The National University of modren languages Islamabad Pakistan May 2001, Page 23,22 "مقالہ" Mrs. Rubina Kamran

۹۔ جوش ملیح آبادی، مقالاتِ جوش، مرتب سحر انصاری، کراچی: اُردو محل پبلشرز بک سیلر، اپریل ۱۹۸۲ء، ص: ۲۰۷

۱۰۔ Henry sweet, "The practical study of languages" london oxford

university press, 1989, page 4

۱۱۔ Bloch & Trager,Jhon Lyons "Language and Linguistics", cambridge university press combridge london..... 1981, page 4

۱۲۔ طارق سعید"اسلوب اوراسلوبیات،لاہور: نگارشات، میاں چیمبرز ٹیمپل روڈ، ص: ۲۰۲

۱۳۔ عابد علی عابد سید، اُصول انتقادیات، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۷ء، ص: ۱۷۲

۱۴۔ الطاف حسین حالی، مقدمہ شعر و شاعری، لاہور: پاپولر پبلشنگ اُردو بازار، جنوری ۲۰۰۰ء، ص:۱۷۲

۱۵۔ Wallace Stevens "The Necssary Angel" Essay on reality and imagination faber and faber london Boston, 196, 138

۱۶۔ عابد علی عابد، مشمولہ، "اسلوب اور اسلوبیات"، تالیف، طارق سعید، لاہور: نگارشات، میاں چمبرز، ٹمپل روڈ، ۱۹۹۸ء، ص:۹۵

۱۷۔ ظہور احمد، اعوان، ڈاکٹر، نگارشات، اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، طبع اوّل ۱۹۹۳ء، ص: ۵۹

۱۸۔ اسد اللہ خاں غالب، مشمولہ، "محاسنِ خطوطِ غالب" تالیف غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر لاہور: بزمِ اقبال مارچ، ۲۰۰۳ء، ص: ۱۵۵

۱۹۔ شبلی نعمانی، مولانا، "شعر العجم" جلد سوم، لاہور: الفیصل ناشران و تاجران کتب اردو بازار، جون ۱۹۹۹ء، ص: ۲۰۰، ۱۹۹

۲۰۔ افضل قریشی، مولانا ابو الکلام آزاد، ادبی شخصی مطالعہ، لاہور: الفیصل ناشران و تاجران کتب، جون ۱۹۹۲ء، ص: ۵۷۰

۲۱۔ عبداللہ بٹ، مضامین آزاد، لاہور: قومی کتب خانہ، ریلوے روڈ، پہلی اشاعت ۱۹۴۴ء، ص ۳۶

۲۲۔ ایضاً ص: ۱۴۴

۲۳۔ سجاد حیدر یلدرم، انتخاب سجاد حیدر یلدرم، مرتبہ ومقدمہ، قرۃ العین حیدر، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۰ء، ص: ۱۴۵

۲۴۔ نیاز فتح پوری، علامہ "انتقادیات"، لاہور: الوقار پبلی کیشنز، سال اشاعت ۲۰۰۵ء، ص: ۱۰۲، ۱۰۱

۲۵۔ ایضاً، ص: ۳۵۶، ۳۵۵

۲۶۔ ایضاً، ص: ۳۵

۲۷۔ حجاب اسماعیل، ''ادب زریں''، دہلی: عصمت بک ڈپو، بار دوم، ۱۹۴۳ء، ص:۷

۲۸۔ علی محمد خان، ڈاکٹر، مولف ''خواجہ حسن نظامی کے مضامین''، لاہور: مقبول اکیڈمی، شاہراہ قائداعظم، ص:۳۵

۲۹۔ ایضاً، ص: ۲۷

۳۰۔ محمد حنیف شاہد، مقالات عبدالقادر، (مرتبہ) لاہور: مجلس ترقی ادب، کلب روڈ، طبع اول، فروری ۱۹۸۶ء، ص: ۱۰

۳۱۔ عبدالقادر، شیخ ''انتخاب مخزن'' ترتیب وتعارف احمد سلیم، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز ۲۰۰۴ء، ص:۷۶

۳۲۔ ایضاً، ص:۴۳

۳۳۔ عبدالغفور، خواجہ ''طنز ومزاح کا تنقیدی جائزہ''، نئی دہلی: ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، جون ۱۹۸۳ء، ص: ۷۹

۳۴۔ رؤف پارکھ، ڈاکٹر ''اردو نثر میں مزاح نگاری کا سیاسی وسماجی پس منظر''، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، پہلی اشاعت ۹۷-۱۹۹۶ء، ص: ۲۸۷

۳۵۔ رشید احمد صدیقی، ''میزان نثر'' جلد مرتبین مہر الٰہی ندیم، لطیف الزماں خاں، کراچی: دانیال، اشاعت اوّل جون ۲۰۰۰ء

۳۶۔ ایضاً، جلد سوم، ص: ۲۳۴

۳۷۔ پطرس بخاری ''کلیاتِ پطرس'' مرتبہ شیما مجید، لاہور: بک ٹاک، میاں چیمبرز ٹمپل روڈ، ۲۰۰۳ء، ص: ۴۷

۳۸۔ ایضاً، ص: ۱۲۲

۳۹۔ عبدالحق، مولوی، معراج العاشقین، مقدمہ، مشمولہ مقدمات عبدالحق، مرتب: عبادت بریلوی، ڈاکٹر، پہلا پاکستانی ایڈیشن، ۱۹۶۴ء، لاہور: اُردو اکیڈمی، ص:۲۶۸

۴۰۔ محمود شیرانی، حافظ، مرتبہ مظہر محمود شیرانی، لاہور: مجلس ترقی ادب، طبع اوّل ۱۹۸۵ء، ص: ۲۰۵

۴۱۔ اختر حسین رائے پوری ''ادب اور انقلاب'' حیدر آباد دکن: ادارہ اشاعت اردو، اکتوبر ۱۹۴۳ء، ص ۱۱۵

باب ہفتم

اُردو مضمون نگاری کا مجموعی جائزہ

اُردو مضمون نگاری کا مجموعی جائزہ

انسان ازل ہی سے جستجو میں لگا ہوا ہے کیونکہ ہ جستجو اس کی ضرورت ہے۔ یہ ہی جستجو اسے علم کی میراث عطا کرتی ہے، یہی جستجو اسے ترقی کے راستے پر گامزن کرتی ہے اور یہ جستجو بندے کو رب سے ملا دیتی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جستجو ہے کیا اور جستجو کرنے سے انسان کو کیا تقویت ملتی ہے۔ جستجو حقائق کی تلاش ہے، صداقت و دیانت سے جو جستجو کی جائے تو کامیابی اس کا مقدر بن جاتی ہے۔ انسان نے جستجو کی تو پہیہ ایجاد کیا۔ یوں آمد و رفت کے کئی ذرائع میسر آگئے۔ ایڈیسن نے بلب ایجاد کیا تو رات کو دن کا سماں لگنے لگا۔ گراہم بیل نے ٹیلی فون ایجاد کیا تو پیغام رسانی آسان ہوگئی۔ اخبار ایجاد ہوا تو ہر نگر کی خبریں ملنے لگیں۔ انسان کو جستجو سے توانائی ملتی ہے اور وہ خود کو محفوظ سمجھنے لگتا ہے۔

جستجو کے حوالے سے اردو زبان کا جائزہ لیں تو پہلے پہل یہ زبان علمی موضوعات و علمی مطالعات کا احاطہ کرنے سے قاصر تھی اور اس میں کچھ مذہبی رسائل نظر آتے تھے۔ فورٹ ولیم کالج کے توسط سے سلیس نثر سامنے آتی ہے یا فورٹ ولیم کالج سے باہر نثار بھی اردو میں داستانیں لکھتے رہے یوں اردو کے دو اسالیب وجود میں آئے۔ فورٹ ولیم کالج کے تحت ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازمین کے اسباق کے لیے سہل اور سادہ طرز تحریر اپنایا گیا اور میر امن، حیدر بخش حیدری و دیگر ارباب نثر نے سلیس اور عام فہم زبان میں داستانیں لکھیں۔ دوسری طرف رجب علی بیگ سرور نے ''فسانہ عجائب'' مشکل زبان میں لکھی۔ داستانوں کے طلسم کو غالب نے اپنے خطوط میں فطری اور فی البدیہہ انداز تحریر اپنا کر توڑ ڈالا، یوں اردو زبان فطری لب و لہجہ سے متعارف ہوئی۔ دہلی کالج نے اردو مضمون نگاری کا سلسلہ ''قران السعدین'' سے شروع کیا، یوں اردو میں مضمون نگاری کا آغاز ہوا۔ ماسٹر رام چندر کے رسائل ''محب ہند'' اور ''فوائد الناظرین'' کے ذریعے بھی علمی و سائنسی مضامین لکھے جانے لگے۔ عہد سرسید کی نثر جدید نثر کہلائی۔ پچھلے ابواب میں سرسید کی مضمون نگاری کی

وضاحت کی جاچکی ہے۔اب مضمون نگاری کی اہمیت اور افادیت پر نظر ڈالتے ہیں۔

مضمون نگاری کی اہمیت و افادیت وضرورت ہر دور میں رہی ہے اور مستقبل میں بھی مضمون نگاری کی جاتی رہے گی۔ انسان کسی اور صنف ادب میں اپنا مافی الضمیر اتنے واضح اورٹھوس انداز میں بیان نہیں کرسکتا جتنا مضمون نگاری کے ذریعے کرسکتا ہے۔مضمون چونکہ براہ راست قاری سے مخاطب ہوتا ہے اس لیے اس میں براہ راست اور To The Point بات کی جاتی ہے۔ انسان کو مضمون نگاری پر اس وقت عبور ہوتا ہے جب اس کا مطالعہ وسیع اور مشاہدہ عمیق ہو۔ تخیل اعلیٰ کی کارفرمائی ہو۔ نیز زبان دانی پر بھی مکمل گرفت ہو۔ اردو میں مضمون نگاری کا آغاز دہلی کالج سے ہوا۔ پہلے گنے چنے موضوعات پر مضامین لکھے جاتے تھے۔ ۱۸۲۵ء تا ۱۸۴۷ء تک کے عرصے میں اردو زبان اپنی وسعت کی بنا پر ہر قسم کے موضوعات پر مضامین لکھنے کے قابل ہوگئی۔ یہ حقیقت ہے کہ ہر عہد اپنے طور پر نئے موضوعات اور نئے اسالیب لے کر آتا ہے۔ مضمون نگاری کے سلسلے میں بھی یہی ہوا کہ جوں جوں وقت گزرتا گیا مضمون نگاری کے نئے نئے موضوعات منظر عام پر آتے رہے۔ میں نے جب ۱۹۰۰ء تا ۱۹۴۷ء تک اردو مضمون نگاری کے ارتقاء پر نظر ڈالی اور ان مضامین کا مطالعہ کیا تو احساس ہوا کہ یہ مضامین موضوع کے تنوع اسالیب کے تجربوں کے ساتھ ساتھ اپنے دور کی بلاواسطہ تاریخ بھی بنا رہے تھے۔

اپنے مقالے کے لیے میں نے اسی موضوع کو اسی لیے منتخب کیا کہ اردو مضمون نگاری پر کام تو ہوا ہے لیکن مضمون نگاری کے حوالے سے بہت ہی کم ہوا ہے۔ یہ کام بکھرا ہوا ہے کہیں بھی مضمون نگاری کے حوالے سے یکجا کام نظر نہیں آتا۔ اس لیے میں نے اسی موضوع کو اہم سمجھ کر اس پر کام کیا ہے۔

مضمون نگاری کیا ہے؟ اس کی تعریف تو پچھلے ابواب میں کر دی گئی ہے۔ مضمون نگاری کے حوالے سے میری تحقیق وتنقید کے مقاصد مندرجہ ذیل تھے۔

۱۔ اردو مضمون نگاری کب اور کیسے شروع ہوئی؟

۲۔ اردو مضمون نگاری کے ماخذ کیا تھے؟

۳۔ اردو مضمون نگاری کے تحت کون کون سی تحریکیں اور رجحانات سامنے آئے؟

۴۔ اردو مضمون نگاری کے ذریعے کون کون سی زبانوں سے اردو تراجم کئے گئے؟

۵۔ یورپ میں ہمارے مخطوطے کہاں کہاں اور کس کس لائبریریوں میں موجود ہیں۔

جہاں تک رسائل کا تعلق ہے تو میں نے واضح کیا ہے کون کون سے رسائل مضمون نگاری کے کس کس نظریے اور اسالیب کی نشاندہی کرتے ہیں۔

ان مضامین کے ذریعے جو بھی تحریکیں، رجحانات اور اسالیب منظرِ عام پر آئے اور جن مضامین کے تراجم کئے گئے ہم نے ان پر تفصیل سے پچھلے ابواب میں روشنی ڈالی ہے۔ ان مضامین کے ذریعے اردو ادب میں تحقیقی و تنقیدی ذوق سے جلا پائی۔ یہ مضمون سائنٹیفک رجحان کے علمبردار ہیں۔ ان مضامین نے ادب اور زندگی کو گہرے رشتے میں پرویا۔ ان ہی مضامین کی ورق گردانی سے احساس ہوتا ہے کہ مضمون میں کسی قسم کی بے تکی اور فروئی باتیں نہیں کیں جاتیں۔ بلکہ معاشرے اور فرد، قاری اور مصنف کی ذہنی کیفیت، تجربات و مشاہدات، انفرادیت، خارجیت اور عصریئت پر کڑی نظر ڈالی جاتی ہے۔ اعلیٰ مضمون اپنے اندر زبان رکھتا ہے وہ خود بخود بولتا ہے اور لکھاری کی قدر متعین کرتا ہے۔ میں نے جب ان مضامین کا مطالعہ کیا تو احساس ہوا کہ ان مضامین کے لکھاری اپنے دور کی قدروں کے نباض بھی تھے اور ان قدروں کے قدر شناس بھی۔ تبھی یہ مضامین قاری کے ادبی ذوق اور ادبی رجحانات کو اعلیٰ و ارفع بنانے میں مددگار و معاون ثابت ہوئے۔ یہ مضامین جدیدیئت کے علمبردار ہیں۔ مضمون نگاری کے وصف نے ہر نئی صداقت کو اس کی مناسب جگہ عطا کی۔ قاری کے ذہن کی تربیت بھی کی۔ ان مضامین کے موضوعات کی بنا پر مصلحت کوشی اور لفظی کاریگری سے جو کہ داستانوں کا عنصر تھا یکسر چھٹکارا ہوگیا۔ ان مضامین کے موضوعات شعر و ادب، تحقیق و تنقید، سائنس و تاریخ، طنز و ظرافت، دین و مذہب، سیاست و اقتصادیات و دیگر موضوعات ہیں اور ان مضامین میں ہر صنف شعر و ادب کے حوالے سے خاصیت بھی نظر آتی ہے۔ مثلاً دہلی کالج کے رسالے ''قران السعدین'' کے مضامین میں علمی متانت کا شعور ملتا ہے۔ دہلی کالج کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی یہاں سے بھی سائنسی مضامین کا آغاز ہوا اور انگریزی سے اردو میں سائنسی کتب کا ترجمہ کیا جاتا رہا۔ ترجمہ کرتے وقت اس بات کو مدنظر رکھا گیا کہ اگر کسی سائنس کے لفظ کا اردو ترجمہ نہیں ہوسکتا تو اس لفظ کو اردو میں شامل کرلیا جائے اور یوں اردو زبان کو وسعت ملی اور اکثر سائنسی لفظ مثلاً کاربن، سوڈیم وغیرہ کو جوں کا توں اردو زبان میں شامل کرلیا گیا اردو زبان کے ذخیرہ الفاظ میں اضافہ ہوا۔ سائنسی کتب اور مضامین لکھے جانے لگے۔ خواجہ احمد فاروقی ''دلی کالج اردو میگزین'' میں لکھتے ہیں:

''اس کالج کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں تمام علوم حد یہ ہے کہ

مغربی سائنسی، ہیئت، ریاضی، فلسفہ وغیرہ کی تعلیم بھی اردو میں دی جاتی تھی۔ مادری
زبان میں تعلیم دینے کا تجربہ کامیاب رہا۔"[1]

ماسٹر رام چندر کے رسالوں "محبِ ہند" اور "فوائد الناظرین" میں بھی ادبی و معاشرتی موضوعات کے ساتھ ساتھ سائنسی و علمی نوعیت کے مضامین نظر آتے ہیں۔

تاریخ ایک عمل ہے جو خود بخود اپنی راہیں متعین کرتا ہے۔ان مضامین نے زبان اردو کی تاریخ بھی لکھی۔ حالی و آزاد سے جدید اردو تنقید کا آغاز ہوا۔ انجمن پنجاب کے تحت جو مضامین لکھے گئے وہ نہایت شستہ اور سلیس زبان میں لکھے گئے۔اس دور میں فرسودہ رنگِ غزل کی حوصلہ شکنی کی گئی اور غزل کے موضوعات کو تنوع ملا۔ یہ دور نظم کی ابتدا کا دور ہے۔ حالی کی "مقدمہ شعر و شاعری" اور محمد حسین آزاد کے شاعری پر دیئے گئے "لیکچرز" نے بھی اردو زبان کو تخیلاتی و جذباتی رنگِ سخن سے نکال کر حقیقتوں، صداقتوں کی ترجمانی کی طرف راغب کیا۔ اس طرح حالی اور آزاد نے جدید شاعری کی بنیاد رکھی۔ پروفیسر مشرف انصاری اپنے مضمون "جدید اردو تنقید کا نقاش اول..... آزاد" میں آزاد کو جدید تنقید کا بانی قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"جہاں تک اردو ادب میں تبدیلیوں کا تعلق ہے اس کے بانی وہ ہی لوگ تھے جو کسی
نہ کسی طرح نئے حالات سے متاثر تھے۔ جن لوگوں نے ان انقلابی خیالات کا علم
بلند کیا وہ جدید تنقید کے بانی کہلائے۔اس میں شک نہیں کہ اس عہد کے سب سے
بڑے اور اہم نقاد حالی ہیں مگر تاریخی لحاظ سے دیکھا جائے تو مولانا محمد حسین آزاد کا
نام سب سے پہلے آتا ہے۔"[2]

یوں کہا جاسکتا ہے کہ حالی نے مقدمہ شعر و شاعری لکھ کر شبلی نے رومانوی لہجہ میں موازنہ انیس و دبیر، فکری لہجہ میں شعر العجم لکھ کر، آزاد نے جدید شاعری پر لیکچر دے کر اپنے مضامین و کتب کے ذریعے اردو زبان میں تحقیقی زبان تو شامل کرکے اردو زبان کو وسعت و تنوع عطا کیا۔ زبان کسی بھی معاشرت و ثقافت کی عکاس ہوتی ہے۔ اردو زبان اپنے آغاز سے ہی کئی زبانوں کے اختلاط سے وجود میں آئی اور عہد سرسید میں اردو زبان کو فروغ حاصل ہوا۔ اردو زبان ہر قسم کے مطالب و مفاہیم ادا کرنے کے قابل ہوگئی۔ سرسید احمد خاں نے باقاعدہ مضمون نگاری شروع کی۔ سرسید کا دور معاشرتی المیے اور سیاسی زوال کا دور ہے۔ جمہوریت کی جگہ آمریت کے شکنجے میں جکڑی عوام مایوس، بوجھل اور پژمردہ تھی۔ ایسے میں سرسید نے متحرک تصورِ حیات دیا اور متحرک تصورِ حیات "تہذیب الاخلاق" میں شائع کردہ مضامین کے ذریعے عوام تک پہنچایا۔ ان

کے کھوکھلے اور مایوس ذہن کو فکرِ جدید عطا کی۔ سرسید نے رچرڈ اسٹیل اور جوزف ایڈیسن کے رسالوں The Tatler اور The Spectator سے استفادہ کیا اسٹیل The Tatler کے آغاز پر لکھتا ہے:

"The general purpose of this paper, is to expose the false arts of life, to pull off the disquises of cunning, vanity, and affectation and to recommend a general simplicity in our dress, our discourse, and our behavior."۳

سرسید بھی تہذیب الاخلاق کے ایک سال بعد لکھتے ہیں:

"غرض کہ جو کچھ اس زمانہ میں فرنگستان میں تھا وہی کچھ بلکہ اس سے بھی زیادہ اب ہندوستان میں موجود ہے اور بلاشبہ ایک ٹیٹلر اور ایک اسکیٹیٹر کی یہاں ضرورت تھی سو خدا کا شکر ہے کہ یہ پرچہ جاری ہوا۔ مگر افسوس کہ یہاں کوئی اسٹیل اور ایڈیسن نہیں ہے۔"۴

لیکن تاریخ نے ثابت کیا کہ سرسید نے اسٹیل اور ایڈیسن دونوں کا کردار نبھایا مسلمان اپنا تشخص برقرار رکھنے لگے، اپنی شناخت کرنے لگے یہ ان ہی مضامین کی بدولت ہوا جو سرسید نے خود بھی لکھے اور اپنے رفقائے کار سے بھی لکھوائے..... سرسید مسلمانوں کے اتحاد اور قومی یگانگت پر زور دیتے ہوئے اپنے مضمون ''قومی تعلیم، قومی ہمدردی اور باہمی اتفاق'' میں لکھتے ہیں:

"اس زمانہ میں جو سب سے بڑا سبب ہماری قوم کے تنزل کا ہے وہ یہی ہے کہ اس میں قومی اتفاق کا خیال نسیاً منسیاً ہوگیا ہے کسی کو بجز اپنی ذاتی معفت کے قومی بھلائی اور قومی معفت کا کبھی خیال بھی نہیں آتا۔ اگر کچھ بھی کرتا ہے تو اس کو پہلے اپنی غرض مدنظر ہوتی ہے اور قومی بھلائی کے پردہ سے اس کی پردہ پوشی کرنی چاہتی ہے یہی وجہ ہے کہ ہمارے کاموں میں برکت نہیں ہوتی۔"۵

یہ موضوع کتنا اہم اور کتنا وسیع ہے۔ آج بھی اگر ان موضوعات پر نظر ثانی کریں تو احساس ہوگا کہ اب بھی ان موضوعات کے حوالے سے فکری مضامین لکھے جاتے ہیں۔ سرسید کے مضامین متحرک اور فعال ہیں۔ آج بھی قومی اتحاد پارہ پارہ ہے۔ سرسید کے مضامین کی عظمت اس میں پوشیدہ ہے کہ ان کے مضامین کے کئی پہلو اور کئی جہتیں اور کئی نئے گوشے ہیں۔ قاری ان کی بصیرت سے اس دور میں بھی استفادہ کرتا تھا اور آج کا قاری بھی ان مضامین کی روشنی میں اپنے کردار کی نشوونما کرسکتا ہے کیونکہ آج کے مسلمان بھی اپنی

اخلاقی پامالی اور اخلاقی کمزوریوں کی وجہ سے رو بہ زوال ہیں۔ کسمپرسی کا شکار ہیں۔ سرسید اور ان کے رفقائے کار کے مضامین میں مجھے خاصیت نظر آئی کہ یہ مضامین اس دور میں غلامی کے طوق میں جکڑے لوگوں کو اس غلامی سے رہائی دلانے میں اہم کردار ادا کرتے رہے اور لوگوں کا شعور جگاتے رہے، نئے نئے مکاتیبِ فکر بناتے رہے۔ سرسید نے مضامین لکھے۔ تاریخ لکھی۔ ''رسالہ اسباب بغاوت ہند'' لکھ کر مسلمانوں کی بے نگاہی ثابت کی۔ ''خطبات احمدیہ'' لکھ کر سر ولیم مور کی کمر توڑ دی۔ حالی نے مقدمہ شعر و شاعری لکھ کر اردو میں باقاعدہ تنقید کا آغاز کیا۔ شبلی نے تنقیدی کتب ''شعر العجم''، ''موازنہ انیس و دبیر'' لکھ کر جذباتی نثر کا آغاز کیا۔ آزاد نے جدید آزاد نظم پر لیکچر دے کر تنقید و شاعری کی نئی راہیں روشن کیں۔ یہ مضامین مکتب فطرت انسانی کے عکاس بھی ہیں اور تہذیب و ثقافت کی علمبرداری کے ساتھ ساتھ اردو زبان و ادب کی تفسیر بھی ہیں۔

سرسید نے اپنے رفقائے کار کے ساتھ مل کر اردو نثر کو سلیس بنایا، عام فہم اور حقیقی نثر میں انسانی شعور کو جگایا۔ اردو نثر عہد سرسید سے ہر قسم کے مطالب ادا کرنے میں مشاق ہوگئی۔ ''رومانوی تحریک سرسید کی عقلی تحریک کے ردِعمل میں سامنے آتی ہے۔ یوں رومانوی موضوعات کو فروغ ہوا۔ رومانوی تحریک جو فرانس و برطانیہ سے برصغیر پاک و ہند میں دبے پاؤں داخل ہوئی یہاں کے نوجوانوں عبدالحلیم شرر، سجاد حیدر یلدرم، عبدالقادر آزاد و دیگر ادیبوں نے اسے لبیک کہا۔ یہ نثار جدید مغربی ذہن رکھتے تھے یوں رومانوی تحریک اور رومانوی اسلوب نے اردو زبان و ادب میں جگہ بنائی۔ اسی تحریک کے تحت جس اسلوب میں ادیبوں نے اپنا مافی الضمیر بیان کیا وہ اسلوب جمالیاتی اسلوب تھا۔ ان نثاروں کے مضامین میں ندرت، لفاظی، نازگی، قدرے مبالغہ، موسیقیت و ترجم کے ساتھ دلی جذبات کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔

Peter Widdowson اپنی کتاب "Literature" میں ادب لطیف کے حوالے سے لکھتا ہے:

"One may bee a poet without versing and 'there have been may most excellent poet, that never versified."[۲]

ادب لطیف کے نثار اپنی تحریروں اور نثری مضامین میں شعری رویے اختیار کرتے ہیں مثلاً شرر، یلدرم، ابوالکلام آزاد، خلیقی دہلوی، فلک پیما، نیاز فتح پوری، مجنوں گورکھپوری و دیگر ارباب نثر کے نثر پارے

شعری ٹکڑے نظر آتے ہیں اور ان کا لب و لہجہ شعری لوازمات سے بھرپور ملتا ہے۔ ترقی پسند تحریک نے ضرورتوں اور حسرتوں کو ادب میں سمو دیا اور یوں بھوک اور افلاس، غریبی، ناانصافی حق تلفی پر بات کی اور آج بھی اکیسویں صدی میں ادیب تیسری دنیا کے حق میں ادب لکھ رہے ہیں۔ مضامین میں تحقیق کا جو باقاعدہ سلسلہ حافظ محمود شیرانی سے شروع ہوا وہ آج بھی زور وشور سے جاری و ساری ہے کیونکہ تحقیق وجستجو سے علم و فن کے نئے امکانات اور نئے انکشافات منظر عام پر آتے ہیں۔ آج بھی کئی نامور محقق، تحقیق کے میدان میں اپنے اپنے تئیں سرگرم عمل ہیں۔

رشید حسن خاں کا نام معروف نام ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر ایسے ہی نقاد اور محقق ہیں جن کی تحقیق وتنقید نے نوآموز نقاد و محقق کو نئی گتھیاں سلجھا کر دیں۔ ان کی کتاب ''اردو کی مختصر ترین تاریخ آغاز سے ۲۰۰۰ء تک'' اہم کتاب ہے اور منفرد مقام رکھتی ہے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری ''ادبی تحقیق کے اصول'' بھی اہم ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر خواجہ زکریا، ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار و دیگر محقق زبان اردو کی خدمت کرتے رہے اور کر رہے ہیں۔ ان کی تالیفات یا مرتب شدہ مضامین و کتب آج کے دور میں مضمون نگاری کو مزید تقویت عطا کر رہی ہیں۔ اردو زبان کا تنقیدی سرمایہ آزاد و حالی اور شبلی سے اپنا آغاز کرتا اور آج کے دور میں ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر افتخار صدیقی، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر سہیل احمد خاں، فتح محمد ملک، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر تبسم کاشمیری، ڈاکٹر جمیل جالبی و دیگر ناقدین اپنی تنقیدی بصیرت اور گہرے سماجی وتنقیدی شعور اور ہر قسم کے تنقیدی خیالات سے اردو زبان کو مالا مال کرتے ہیں اور کر رہے ہیں۔

لسانی حوالے سے دیکھیں تو ہر قوم ہر علاقے اور ہر ملک کی اپنی زبان ہوتی ہے اور جو لوگ اپنی زبان کی حفاظت کرتے ہیں وہ ہی ترقی یافتہ قوم بن جاتے ہیں کوریا، چین، جاپان نے اپنی زبان کو ترقی دی تو آج وہ ترقی یافتہ ہیں۔ زبان کی ساخت کے حوالے سے میں نے یہ اندازہ لگایا کہ ہر قوم، ہر ملک، ہر علاقے کی زبان اپنی انفرادیت ہوتی ہے جیسے پرانے لاہور کے لوگ ''ڑ'' کو ''ڑ'' بولتے ہیں یا حیدر آباد دکن کے لوگ ''ق'' نہیں بول سکتے ''قبر'' کو خبر بنا دیتے ہیں۔ زبان کو زبردستی بھی ختم کیا جاتا ہے فاتح قوم مفتوح قوم کی زبان کو ختم کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ جیسے آسٹریلیا میں Aborines کی زبان جو قدیم زبان تھی اس کو ختم کردیا گیا اگرچہ یہ لوگ خانہ بدوش تھے اور ان کی نسل آج بھی وہاں موجود ہے لیکن وہاں اب

زبان بولی جاتی ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

"جب میں ڈنمارک گیا تو وہاں کہیں انگلش نہیں لکھی ہوئی تھی اور شیکسپیئر کا ادب بھی ڈنش زبان میں لکھا تھا۔ بچوں کے لیے جب کہانی کے لیے کیسٹ لینے گیا تو وہ بھی انگلش میں نہیں ملے۔"[۷]

تو اس سے ثابت ہوا کہ اپنی زبان کی حفاظت کرتے ہیں ان کی زبان بھی زندہ اور متحریک رہتی ہے اور وہ قوم بھی ترقی کرتی ہے ڈاکٹر سلیم اختر نے مزید کہا:

"کئی لوگوں نے طعنہ دیا کہ اردو زبان پان کھانے والوں کی زبان ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ اردو زبان کی عزت افزائی ہے۔ پان میں پتا، چھالیہ، چونا، کتھا اور معری شامل ہوتی ہے تو اس مصالحے سے ایک گلوری بنتی ہے اور یوں اردو زبان مختلف زبانوں کے اختلاط سے خوبصورت زبان بن گئی اور مکسچر ہوگئی شہد چھتہ بن گیا۔"[۸]

آج کل اردو زبان کے خد و خال بگڑ رہے ہیں جبکہ اردو زبان دنیا کی چوتھی بڑی زبان ہے ۷۲ فیصد دنیا میں بولی جاتی ہے۔ اگر زبان کو زندہ رکھنا ہے تو نئے نئے خیالات وتصورات اس میں شامل کرنے ہوں گے ورنہ زبان جامد ہوجائے گی۔ آج کل ترجیحات بدل گئی ہیں انگریزی زبان بولنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ احساس کمتری کا شکار ہیں۔ نئی نسل کو اردو کی سدھ بدھ بہت ہی کم ہے اور آنے والی ایک دو نسلیں انگلش میڈیم کے نذر ہوئیں تو پھر یہ اردو زبان کو بھول جائے گی اور اسے یکسر نظر انداز کردے گی۔ میڈیا نے اردو زبان کو بگاڑنے اور دشمنی کرنے میں بہت بڑا کردار ادا کیا ہے ڈاکٹر سلیم اختر اسی گفتگو میں مزید فرماتے ہیں:

"دنیا کے تمام نفسیات دان اس پر متفق ہیں کہ بچے کو بچپن میں تعلیم مادری زبان میں دی جائے تو وہ زبان زندہ رہتی ہے۔ اسرائیل جو سیاسی اور دینی طور پر ہمارا دشمن ہے۔ لیکن اسرائیل میں عبرانی زبان جو کہ مردہ ہوچکی تھی وہ آج کل بولی جاتی ہے۔ وہاں ایک شخص بن یہودا نے سوچا کہ عبرانی کس طرح دوبارہ شروع کی جائے تو اس نے پہلے اپنے بچوں اور بیوی کے نام تبدیل کیے پھر دوستوں کو نام بدلنے پر آمادہ کیا پھر مختلف لفظ جمع کرکے عبرانی ڈکشنری بنائی اور پھر لوگوں کو عبرانی زبان بولنے پر آمادہ کیا اور آج اسرائیل میں عبرانی بولی جاتی ہے وہاں انگریزی نہیں بولی جاتی۔"[۹]

اس واقعہ سے مجھے اس بات کا اندازہ ہوا کہ اسرائیل ہر وقت مسلمانوں کو پوری دنیا میں دھمکیاں

دیتا رہتا ہے اور فلسطینوں پر ظلم ڈھاتا رہتا ہے لیکن اس نے ایک طاقتور عبرانی زبان سے نہ صرف خود کو مستحکم کیا بلکہ ترقی بھی کر رہا ہے۔ ہمارا دشمن ہے لیکن دنیا کے میڈیا پر چھایا ہوا ہے۔ اگر ہم اپنی گفتگو اور رویوں میں انگریزی کا تڑکا نہیں لگائیں گے اردو زبان کو قومی زبان کے طور پر نافذ کریں گے تو نہ صرف زبان مستحکم ہوگی بلکہ پاکستانی قوم بھی مضبوط و مستحکم ہوگی۔ لیکن پھر بھی اردو کے محققین، ناقدین اور اردو ادب سے تعلق رکھنے والے اردو میں کام کر رہے ہیں۔ یوں دہلی کالج سے جو مضمون نگاری کا سفر شروع ہوا تھا آج بھی جاری و ساری ہے۔ مضمون نگاری کی ضرورت اور افادیت کل بھی تھی آج بھی ہے اور کل بھی رہے گی۔ موضوعات میں جدت کے ساتھ ساتھ صداقت کی موجودگی نے نہ تو اردو زبان کو کھوکھلا ہونے دیا اور نہ ہی بنجر۔ ان نثار و محققین و ناقدین کی کوششوں سے اردو زبان ایک حد تو مستحکم و توانا ہو رہی ہے اور انگریزی کے اس دور میں اردو زبان اپنی بقا کی جنگ لڑ رہی ہے۔ رسائل اہم ہوا کرتے ہیں۔ اردو مضمون نگاری کا آغاز ان رسائل سے ہوا۔ یہ رسائل دور جدید کی پیداوار تھے۔

انیسویں صدی کے آغاز میں ان رسائل کی کھیپ نے اپنے آغاز ہی سے عوام کو صحت مند ادب کی جانب راغب کرنے کے لیے نادر اور اچھوتے موضوعات سے اپنے مضامین کو سجایا۔ رسائل اور کتاب انسان کی تنہائی کے رفیق اور درست ہوا کرتے ہیں۔ ان رسائل نے اردو ادب کو ذہین و قابل مصنف و مفکر عطا کئے۔ جن کے موضوعات نے اردو زبان و ادب میں کشادگی پیدا کر دی۔ اردو زبان و ادب فکر و نظر سے روشناس ہوئی۔ ان مضامین میں ماحول، تربیت اور خارجی و داخلی مشاہدات و حالات کا بھرپور تجربہ ملتا ہے۔ یہ رسائل اپنے معیاری موضوعات کے توسط سے مستحکم ادارے کی صورت اختیار کر گئے، یوں یہ رسائل مختلف تحریکات کا سبب بنے۔ ان رسائل نے اردو ادب کو ایک فکر روشن عطا کی۔ معیاری رسائل علم کی توقیر بڑھاتے ہیں، علم و آگہی سے ہمکنار کرتے ہیں۔ اس دور میں نہ ریڈیو تھا نہ ہی ٹی وی اور نہ ہی آج کا کمپیوٹرزد ماحول۔ ان رسائل کی بدولت اس دور میں تحقیقی و تنقیدی بصیرت کے ساتھ ساتھ جدید علوم سے آگہی بھی ملی ان رسائل کے موضوعات طویل ہو یا مختصر لیکن مدلل اور جامع ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپی و تفریح کے عنصر بھی برقرار رکھتے ہیں۔ مقصد، منظر کشی، فنی مطالبات، روایت، فن شناسی، تحقیق و تنقید، تخیل و حقیقت کا امتزاج، سادگی، حسن بیان، جذباتی جوش، ولولہ انگیزی ان رسائل کا طرۂ امتیاز تھا۔ مخزن، اردوئے معلی، زمانہ، الناظر، جامعہ اردو، اورینٹل کالج میگزین، نیرنگ خیال، ہمایوں، ساقی، ادب لطیف و دیگر رسائل

نے مضمون نگاری اور مضمون نگاری کے ساتھ ساتھ تحریکات و رجحانات کو فروغ دیا۔ یہ رسائل رجحان ساز رسائل تھے۔ کچھ رسائل نے رومانوی و تخیلی رجحان کو فروغ دیا۔ کچھ رسائل نے تحقیق و تنقید پر زور دیا۔ کسی رسالے میں مذہبی و دینی فکر غالب رہی کچھ رسائل نے روٹی، کپڑے اور مکان کی بات کی۔ ان رسائل کے توسط سے کسی بھی رجحان نے فروغ پایا لیکن ماحول و قاری کو شعور و آگہی ان رسائل نے عطا کی۔ فن کے سانچے میں ان رسائل کے نثاروں نے اپنی مافی الضمیر بیان کیا۔ قاری کی خوشنودی کو مدنظر رکھا اس لیے ۱۹۰۰ء تا ۱۹۴۷ء کے دوران نکلنے والے رسائل نے فکرِ نو عطا کرنے کے ساتھ ساتھ اسلوب کو جدت و نیا پن عطا کیا ان رسائل میں کہیں رومانوی اسلوب اپنی جھلک دکھاتا ہے تو کہیں تحقیقی انداز نگارش سے کہیں طنزیہ اسلوب کا نکھار ملتا ہے تو کہیں تنقیدی کاوش نظر آتی ہے۔ کہیں دینی و مذہبی بحث و مباحثے کا اسلوب ہے تو کہیں حقیقت نگاری کے اسلوب کو عروج ہے۔ ان رسائل کے نثاروں نے زندگی اور فن پر گرفت حاصل کی۔ ان رسائل نے ماضی، حال، مستقبل کی عکاسی کی۔ ماضی کے مشاہدات و تصورات کے ذریعے حال کا تجزیہ کیا اور مستقبل پر کڑی تنقید بھی کی ان رسائل کی بدولت آج مضمون نگاری اپنے عروج پر دکھائی دیتی ہے۔ مختلف رسائل کے جلو میں آج مضمون نگاری نکھر کر سامنے آئی ہے۔

اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی لاہور کا ''بازیافت'' ہو یا گورنمنٹ کالج یونیورسٹی کا ''تحقیق نامہ'' نمل یونیورسٹی کا ''دریافت'' ہو یا مقتدرہ اسلام آباد کا ''اخبار اردو'' ہو۔ انجمن ترقی اردو کراچی کا ''قومی زبان''، یا مجلس ترقی ادب لاہور کا ''صحیفہ'' ہو یا بزم اقبال کا ''اقبال'' رسالہ ہو، یہ تمام رسائل تحقیقی و تنقیدی معیار کو برقرار رکھے ہوئے ہیں ان کے علاوہ ماہ نو، فنون، مخزن، شام و سحر و دیگر رسائل اپنے اپنے طور پر مضمون نگاری کو فروغ دے رہے ہیں۔ آج کا مورخ جب انیسویں صدی کے حوالے سے اردو ادب کی تاریخ رقم کرے گا تو انیسویں صدی کے ان رسائل سے بچ کر نکلنا اس کے لیے محال ہوگا۔ ان رسائل کے مضامین کا ادراک کیے بنا وہ اردو ادب کا احاطہ نہیں کر سکے گا کیونکہ ان رسائل کے نثار نے علم دوستی کے ساتھ ساتھ آزادیٔ صحافت کا نعرہ مستانہ بھی لگایا اور نو آموز محقق و نقاد کو ایک ولولہ تازہ بھی عطا کیا۔ ان رسائل نے اردو زبان کا تحفظ بھی کیا، نئے اسلوب، نئے الفاظ سے اردو زبان میں اضافہ کیا۔ اردو زبان کے تحفظات کا خیال رکھا اور بندی اردو جھگڑے میں اردو زبان کی آبیاری کے لیے نادر اور اچھوتے مضامین لکھے اور ان ہی مجاہدوں، سالاروں میں مولوی عبدالحق کا نام بھی ہے جنھوں نے بقائے اردو کی جنگ بھی جیتی اور ''بابائے

اردو" کہلائے۔

توانا قلم اپنے زمانے کی متحرک تصاویر دکھاتا ہے۔ان مضامین کے نثار بھی اپنے دور کے صناع کار تھے۔ان کے مضامین گل رنگ گلدستے تھے کہ جدا جدا موضوعات ہیں لیکن تجزیے جنوں، جوش تخیل کی مہک کے ساتھ ساتھ تجربہ وتنقید کا رنگ بھی ان کے مضامین میں جھلکتا ہے۔ادب کیا ہے؟ اور ادبی عمل سے کیا مراد ہے؟ ادبی نظریے کیونکر جنم لیتے ہیں، کیونکر ٹوٹ جاتے ہیں اور کلیشے بن جاتے ہیں۔ادب کیا ہے؟ میرا تو یہ ہی جواب ہوگا کہ ادب کسی بھی ملک کا فطری، علمی و معاشرتی ورثہ ہے۔ Peter Widdson اپنی کتاب "Literature" میں ادب کی تعریف یوں کرتا ہے:

"Literature, the great generic category of written creativity which can all recognise."[۱۰]

ادب کے لیے تخیل کی مضبوطی اور ارفعیت کا ہونا لازمی امر ہے تخیل اعلیٰ ہوگا تبھی فطرت انسانی یا مظاہر فطرت کا عکس بھرپور طریق سے دکھایا جاسکے گا۔ Richard Taylor اپنی کتاب "Understanding the Elements of Literature" میں ادب اور تخیل پر یوں اظہار خیال کرتا ہے:

"Literature, like other arts is essentially an imaginative act, that is, an act of the writer's imagination in selecting, ording and interpreting life experience."[۱۱]

تنقید ادب کا ایک اہم رکن ہے۔تنقید کے ذریعے کسی بھی فن پارے کے حسن وقبیح کا غیر جانبدارانہ نکتہ نظر سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔عملی تنقید کا متن کے ساتھ براہ راست تعلق ہوتا ہے عملی تنقید کے حوالے سے Jonn peck & martincolye اپنی کتاب "Practical criticism" میں لکھتے ہیں:

"Practical criticism, as we are begning to see, concerns it self with the discussion of individual works. It centres of a personal engagement with the text, the oretical principles controlling the mode of annalysis and interpretation are usually left implicit. In other words, the critic starts with the text rather than with a set of

ideas about text."[۱۲]

۱۹۰۰ء تا ۱۹۴۷ء تک کی تنقیدی سرمایے پر نظر ڈالیں تو رومانوی تنقید، مارکسی تنقید، جمالیاتی و تاثراتی تنقید، ادبی تنقید منظر عام پر نظر آتی ہے۔ ان ناقدین کے تنقیدی رجحانات کا منظر نامہ اسی عہد کے رسائل اور کتب میں ابھرتا ہے۔ ان ناقدین کے مضامین یا کتب کا تجزیہ کریں تو احساس ہوگا کہ یہ ناقدین نہ صرف منصبِ تنقید سے واقف تھے بلکہ تنقید کرنے کے فن سے بھی آگاہ تھے کیونکہ تنقید کے لیے ضروری ہے کہ ناقد کو اپنے فن سے مکمل آگاہی ہو۔ ناقدانہ اسلوب میں مہارت رکھتا ہو اور نئے فن پارے کے اصول وقواعد کو بہ احسن طریقے سے جانتا ہو۔ تحقیق کسی بھی ملک کے ادبی سرمائے میں اہم اور نادر فن پاروں کا اضافہ کرتی ہے۔ تحقیق میں خیالات کا تسلسل اساسی و قیاسی نسخہ کی فراہمی پر، شواہد اور ٹھوس مواد کی دستیابی پر ہی قائم رہ سکتا ہے اگر ایسا ممکن نہ ہو تو خیالات بھی منتشر ہو جاتے ہیں اور تحقیقی مواد بھی اپنی قدر کھو دیتا ہے ۱۹۰۰ء تا ۱۹۴۷ء تک جتنا بھی تحقیقی کام ہوا اس پر سرسری نظر ڈالیں تو پچھتر فیصد تحقیقی کام میں جہاں جھول نظر آتا ہے وہاں تحقیقی کام ضرور متاثر ہوا ہے مثلاً شرر بہک جاتے ہیں۔ نیاز فتح پوری کے ہاں تاثراتی لب ولہجہ ملتا ہے وہ غالب پر مومن کو ترجیح دیتے ہیں، حافظ محمود شیرانی، مولوی عبدالحق، مولانا امتیاز علی عرشی و دیگر محققین کے تحقیقی کام تحقیق کو معتبر مضبوط اور مستحکم فضا عطا کرتے ہیں۔ اور تحقیق کی یہ روایت آگے چل کر ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر وحید عشرت، ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر تبسم کاشمیری، ڈاکٹر جمیل جالبی و دیگر ارباب ادب تک پہنچتی ہے۔

انسان کی حسِ ظرافت اسے کبھی اپنے پر اور کبھی دوسری پر ہنسنے ہنسانے کے مواقع فراہم کرتی ہے اردو ادب میں باقاعدہ طنز نگاری کا آغاز ۱۹۰۰ء تا ۱۹۴۷ء سے ہوا۔ اودھ پنچ نے ظرافت کے احیا کے لیے نمایاں کام کیا۔ فرحت اللہ بیگ، رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری، عظیم بیگ چغتائی مایہ ناز ظرافت نگار بن کر ابھرے۔ شگفتگی، بذلہ سنجی اور ظرافت کے کئی رنگ اسی دور میں نمایاں ہوئے۔ اردو ادب کی تاریخ اسی دور میں بنتی رہی۔ اس دور کے مزاحیہ وطنزیہ ادبی عوامل نے ہمیں آگے چل کر کئی مزاحی نثار عطا کئے جن میں شفیق الرحمٰن، ابن انشاء و دیگر ارباب نثر ہمارے سامنے آئے۔ شفیق الرحمٰن کی ''حماقتیں'' اور ابن انشاء کے کئی سفر نامے مثلاً ''دنیا گول ہے''، ''چلتے ہو تو چمن کو چلیئے'' وغیرہ ظرافت کے گل رنگ گلدستے ثابت ہوئے۔ طنز وظرافت انسانی جبلت ہے اور انسان اپنی فطرت سے دور نہیں رہ سکتا اسی لیے ۱۹۰۰ء تا ۱۹۴۷ء تک لکھا

جانے والا طنز وظرافت اپنے دور کا عکس بھی دکھاتے ہیں اور ظرافتی اسلوب کی نشاندہی بھی کرتے ہیں۔

تاریخی عمل اپنے اندر جہاں حقیقی شواہد رکھتا ہے وہاں یہی تاریخی عمل مورخ کے لیے مشکلات بھی کھڑی کر دیتا ہے۔ کسی بھی مورخ کے لیے حقائق کی تلاش اہم اور ضروری سوالات سے شروع ہوتی ہے اور تلخ و خوشگوار نتائج پر ختم ہوتی ہے۔ مورخ کا عمیق مطالعہ و مشاہدہ ہی اس کے تاریخی کام کو بڑھاوا نہیں دیتا بلکہ اس کے Ideas یا خیالات بھی مضبوط و مستحکم ہوتے ہیں تبھی وہ بہتر اور عمدہ نتائج سے ہمکنار ہوتا ہے ۱۹۰۰ء تا ۱۹۴۷ء کے عہد کے مورخ اپنی اپنی بولیاں نہیں بولتے بلکہ مرزا محمد سعید ہو یا شمس اللہ قادری، حسن برنی ہو یا سجاد بیگ یہ لوگ دور کی کوڑی لاتے ہیں اور قارئین ادب کو اہم مطالعاتی فضا مہیا کرتے ہیں۔ یوں اس دور کے تاریخی مضامین ہمیں اپنے دور کی کہانی یوں سناتے ہیں کہ یہ مضامین چلتے پھرتے مرقع نظر آتے ہیں۔ کیونکہ انسان اپنے ماضی کے بارے میں حساس واقع ہوا ہے اور ایک نسل سے دوسری نسل تک گزرنے والے حادثات و واقعات کی نشاندہی کرنے کے ساتھ ساتھ معاشرے کی امنگیں اور جذبات بھی منتقل کرتا ہے۔ تاریخ کا یہ عمل تہذیب و تمدن کو تعمیر و تشکیل کرتا ہے۔

دور حاضر کمپیوٹر کا دور ہے اس جدید دور میں اردو مضمون نگاری کمپیوٹر کے ذریعے بھی ترقی کر رہی ہے مختلف اداروں نے اپنی Web-Site بھی بنالی ہیں۔ حال ہی میں "انجمن ترقی اردو کراچی پاکستان" کی Web-Site کا آغاز ہوا ہے۔ اب ادباؤ نثار کمپیوٹر کے ذریعے اپنے مضامین پوری دنیا میں ای میل کرسکتے ہیں اور کر رہے ہیں۔ اردو زبان و ادب کے حوالے سے سی ڈی (C-D) بھی مل جاتی ہے۔ یہ سب ترقی اسی بات کی دلیل ہے کہ مضمون نگاری اپنے آغاز سے ہی متحرک، فعال اور اہم رہی ہے اور یہ وہ واحد صنف ہے جسے کبھی زوال نہیں آئے گا کیونکہ مضمون ہر دور اور ہر عہد کی ضرورت ہے۔ کچھ لوگ احساس کمتری کا شکار ہو کر اردو کو کمتر جانتے ہیں اور اردو کی توہین کرنے سے نہیں چوکتے تو ان کے لیے عرض ہے کہ اردو نے ہی پورے ملک کو متحد رکھا ہے۔

فورٹ ولیم کالج نے اردو کے ذریعے ہی حکومت کی اور آج بھی ضرورت اسی بات کی ہے کہ سرکاری زبان اردو کے تحفظ سے پاکستان کو مضبوط کرسکتے ہیں۔ کیونکہ مادری زبان کوئی بھی ہو اور اس کا ذخیرہ بھی کتنا ہی زیادہ کیوں نہ ہو ملک کی بقا اور اتحاد کے لیے کارگر ثابت نہیں ہوسکتی۔ پنجابی، سرائیکی، سندھی، بلوچی اور پشتو و دیگر زبانیں بہت میٹھی ہیں اور علاقائی زبانیں ہونے کی بنا پر اہم بھی ہیں جبکہ

انگریزی ہماری ضرورت بھی ہے لیکن ملکی و قومی سطح پر اردو ہی وہ واحد زبان ہے جو اسلوب و الفاظ کے وافر ذخیرہ رکھنے کے ساتھ ساتھ اس قوم کو ترقی و تنزلی کی راہ بتا سکتی ہے۔ جو ملک کو متحد رکھ سکتی ہے۔ اردو ہی وہ زبان ہے جو ضمیر کی آواز ہے۔ انگلش کی احساس کمتری میں مبتلا نوجوان نسل کا علاج کرسکتی ہے اور اردو مضمون نگاری اردو زبان و قومی مسائل کے حل کے لیے اہم کردار ادا کرسکتی ہے۔ انیسویں صدی کے آغاز پر اسی مضمون نگاری نے ہمیں ہمارا تشخص اور شناخت عطا کی تھی اور آج اکیسویں صدی میں بھی کی جانے والی صحت مند مضمون نگاری ایک بار پھر ہمیں ترقی کی راہوں پر گامزن کرسکتی ہے۔ بقول داغ۔

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

حواشی

۱۔ احمد فاروقی، خواجہ، ''دلی کالج اردو میگزین''، قدیم دلی کالج نمبر، دہلی: دلی پرنٹنگ پریس، ۱۹۵۳ء، ص:۱۷

۲۔ مشرف، انصاری، پروفیسر، راوی، جلد، نمبر، ۱۹۸۳ء، لاہور: گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، ص ۲۵۰

۳۔ Richard Steel, "A Short history of English litrature" writer, Pramod.K.Nayar, Delhi..... Foundation, 2009, Page:145

۴۔ سید احمد خاں، ''مقالات سرسید''، (حصہ دہم)، مرتبہ: محمد اسماعیل، پانی پتی، لاہور: مجلس ترقی ادب، طبع دوم جون ۱۹۹۲ء، ص:۴۹

۵۔ ایضاً، (دواز دہم) جون ۱۹۹۳ء، ص:۱۳۶

۶۔ Peter Widdson, "Literature, London and New York, Routledge 11 New fetter Lane, first published, 1999, Page:27

۷۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، ''زبان''، بصری گفتگو، سنڈے برنچ، لاہور: پاکستان ٹیلی ویژن، ۷ نومبر ۲۰۱۰ء، وقت بارہ بج کر ۶۰ منٹ

۸۔ ایضاً، ایک بج کر دس منٹ

۹۔ ایضاً، ایک بج کر بیس منٹ

۱۰۔ Peter Widdson, "Literature, London and New York, Routledge 11 New fetter Lane, first published, 1999, Page:6

۱۱۔ Richard Taylor "understanding the Elements of Literature", London, The Macmillan, Press, L.T-D, 1981, Page:(1)

۱۲۔ John Pack & Martin Coyle "Practical Criticism", Londo, Macillian, first published, 1995, Page:4

ضمیمہ

چند عکس ہائے سرورق (رسائل)

☆ رسالہ انجمن اشاعت مطالب مفید پنجاب

☆ تہذیب الاخلاق

☆ مخزن

☆ اُردوی معلی

☆ زمانہ

☆ الناظر

☆ معارف

☆ کہکشاں

☆ اُردو

☆ شباب اُردو

☆ ہمایوں

☆ نگار

☆ اورینٹل کالج میگزین

☆ نیرنگِ خیال

☆ ادبی دنیا

☆ ساقی

☆ ادب لطیف

کتابیات

BIBLIOGRAPHY

☆ اُردو کُتب

☆ رسائل

☆ غیر مطبوعہ مقالہ

☆ ٹیلی وژن پروگرام

☆ English books

☆ English Magazine

☆ Encyclopedia

کتابیات

۱۔ آدم شیخ، ''انشائیہ''، بمبئی: رائیٹرس امپوریم، پرائیویٹ لمٹیڈ، بار دوم، ۱۹۶۹ء

۲۔ آفتاب عالم مسرور خاں، مسز، ''اردو نثری ادب میں طنز و مزاح کی روایت''، اسلام آباد: ہائر ایجوکیشن کمیشن، ۲۰۰۶ء

۳۔ احتشام حسین، ''روایت اور بغاوت''، دکن: ادارہ اشاعت اردو، طبع اوّل، ستمبر ۱۹۴۷ء

۴۔ احتشام حسین، سید، ''مقدمہ''، ''اُردو انشائیہ''، مرتبہ: صفی مرتضٰی، دہلی: انجمن ترقی ہند، بار دوم، جون ۱۹۴۹ء

۵۔ احسان علی، فصیح، ''اُردو شعر و ادب''، پٹنہ: خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، ۲۰۰۱ء

۶۔ اختر حسین رائے پوری، ''ادب اور انقلاب''، دکن: ادارہ اشاعت اردو، پہلا ایڈیشن، ۱۹۴۳ء

۷۔ اختر انصاری، ''افادی ادب''، دہلی: دلی پرنٹنگ ورکس، نقش اول، ۱۹۴۱ء

۸۔ ارسطو، ''بوطیقا''، عزیز احمد، مترجم، کراچی: انجمن ترقی اردو، پاکستان، اشاعت ششم، ۲۰۰۱ء

۹۔ غالب ''محاسن خطوط غالب''، مرتبہ: غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر، لاہور: بزم اقبال، مارچ ۲۰۰۳ء

۱۰۔ اشرف احمد، خان، ڈاکٹر، (حرفے چند) ''ذکا اللہ حیات اور ان کے علمی کارنامے''، دہلی: ساقی بک ڈپو، نقش اول، ۱۹۹۰ء

۱۱۔ افضل قریشی، ''مولانا ابوالکلام آزاد..... ادبی و شخصی مطالعہ''، لاہور: الفیصل ناشران و تاجران کتب، جون ۱۹۹۲ء

۱۲۔ الطاف حسین حالی، ''کلیات نثر حالی''، (جلد اول) مرتبہ: محمد اسماعیل پانی پتی، لاہور: مجلس ترقی ادب، طبع اول دسمبر ۱۹۶۷ء

۱۳۔ الطاف حسین حالی، مولانا ''حیات جاوید''، لاہور: دوست ایسوسی ایٹس، ۲۰۰۳ء

۱۴۔ الطاف حسین حالی، مولانا، ''حیات جاوید''، لاہور: مطبوعہ آئینہ ادب، ۱۹۶۶ء

۱۵۔ امتیاز علی عرشی، ''مقالات عرشی''، مرتبہ: اخلاق احمد آہن، دلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۷ء

۱۶۔ انور سدید، ڈاکٹر، ''اردو ادب کی تحریکیں''، کراچی :انجمن ترقی اردو، اشاعت چہارم، ۱۹۹۹ء

۱۷۔ انور سدید، ڈاکٹر، ''انشائیہ اردو ادب میں''، لاہور: مکتبہ فکر و خیال، اشاعت اول، جنوری ۱۹۸۵ء

۱۸۔ انور سدید، ڈاکٹر، پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ (ابتداء تا ۱۹۸۸ء)، اسلام آباد:اکادمی ادبیات پاکستان، اشاعت اول، جنوری ۱۹۹۳ء

۱۹۔ انور سدید، ڈاکٹر، ''اردو ادب کی تحریکیں''، کراچی: انجمن ترقی اردو، اشاعت چہارم، ۱۹۹۹ء

۲۰۔ انور علی، ''انور صحافت''، دہلی: اردو اکادمی، فروری ۱۹۸۷ء

۲۱۔ برج نرائن چکبست، پنڈت، لکھنوی، ''گلدستہ بنج''، لکھنو: ہندوستانی پریس، ۱۹۱۵ء

۲۲۔ بشیر سیفی، ڈاکٹر، ''اردو میں انشائیہ نگاری''، لاہور: نذیر پبلشرز، ۱۹۸۹ء

۲۳۔ پریم چند، ''روشنائی''، سجاد ظہیر، سید، دوسری بار، کراچی : مکتبہ اردو، ۱۹۷۲ء

۲۴۔ پطرس بخاری، ''کلیات پطرس''، مرتبہ: شیما مجید، لاہور: بک ٹاک، میاں چیمبرز، ۲۰۰۳ء

۲۵۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، ''ادبی تحقیق کے اصول''، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، طبع اول، ۱۹۹۲ء

۲۶۔ تحسین فراقی، ڈاکٹر، ''عبدالماجد دریا آبادی''، ''احوال و آثار''، لاہور:ادارہ ثقافت اسلامیہ، طبع اول ۱۹۹۳ء

۲۷۔ جابر علی سید، ''تحقیق وتنقید''، ملتان: کاروان ادب، بار اول ۱۹۸۷ء

۲۸۔ جوش ملیح آبادی، ''اشارات''، مرتبہ: .....قزلباش، دلی: نگارستان ایجنسی، سن ن

۲۹۔ جوش ملیح آبادی، ''مقالات جوش''، مرتبہ: سحر انصاری، کراچی: اردو محل پبلشرز، اپریل ۱۹۸۲ء

۳۰۔ حجاب امتیاز علی، ''ادب زریں''، دہلی: عصمت ڈپو، بار دوم، ۱۹۴۳ء

۳۱۔ حمید الدین، شاہد، خواجہ، ''اردو میں سائنسی ادب''، کراچی :ایوان اردو کتاب، اگست ۱۹۶۹ء

۳۲۔ خلیق احمد نظامی، پروفیسر، ''سرسید اور علی گڑھ تحریک''، علی گڑھ :ایجوکیشنل بک ہاؤس، ایڈیشن ۱۹۸۲ء

۳۳۔ خلیقی دہلوی، ''ادبستان''، مرتبہ: اختر شیرانی، لاہور: کتاب منزل، فروری ۱۹۳۰ء

۳۴۔ ذکا اللہ، مولوی، ''مبادی الانشاء'' (حصہ چہارم)، اشاعت دوم، دہلی: مطبع مجتبائی، اپریل ۱۹۰۰ء

۳۵۔ خلیق انجم، مرتبہ: ''سلیمان ندوی''، لاہور:فینس بکس، الوہاب، بار اوّل ۱۹۸۹ء

۳۶۔ راجہ طارق محمود، ''سرسید احمد خاں''، جہلم : بک کارنر، ۱۹۸۸ء

۳۷۔ رشید الدین خان، مرتبہ: ''ابوالکلام آزاد ایک ہمہ گیر شخصیت''، دوسرا ایڈیشن، دہلی: قومی کونسل برائے

فروغ اردو زبان، ۲۰۰۶ء

۳۸۔ رشید احمد، صدیقی، میزان نثر (جلد سوم) مرتبین: مہر الٰہی ندیم (علیگ)،لطیف الزماں، خاں، کراچی: دانیال، جون ۲۰۰۰ء

۳۹۔ رشید امجد، ڈاکٹر، ''میراجی شخصیت اورفن''، لاہور: مغربی پاکستان، اردو اکیڈمی، ۱۹۹۵ء

۴۰۔ رفعت جمال، ڈاکٹر، ''ڈکا اللہ حیات اور ان کے علمی کارنامے''، دہلی: ۱۹۹۰ء

۴۱۔ رؤف پاریکھ، ڈاکٹر، ''اردو نثر میں مزاح نگاری کا سیاسی و سماجی پس منظر''،کراچی: انجمن ترقی اردو، پاکستان، ۹۷۔۱۹۹۶ء

۴۲۔ سید احمد خاں، ''مقالات سرسید''، مرتبہ: محمد عبداللہ، خویشگی، علی گڑھ: نیشنل پرنٹس کمپنی، مارچ ۱۹۵۲ء

۴۳۔ .....، ''مقالات سرسید''، مرتبہ: محمد اسماعیل پانی پتی، مولانا، حصہ پنجم، طبع دوم، لاہور:مجلس ترقی ادب، اپریل۱۹۹۰ء

۴۴۔ .....، ''مقالات سرسید''، مرتبہ: محمد اسماعیل پانی پتی، مولانا، حصہ پنجم، طبع دوم، لاہور:مجلس ترقی ادب، اپریل۱۹۹۰ء

۴۵۔ .....، ''مقالات سرسید''، مرتبہ: محمد اسماعیل پانی پتی، مولانا، لاہور:مجلس ترقی ادب، طبع دوم، اپریل ۱۹۹۰ء

۴۶۔ .....، ''مقالات سرسید''، مرتبہ: محمد اسماعیل پانی پتی، مولانا، حصہ پنجم، طبع دوم، لاہور:مجلس ترقی ادب، اپریل۱۹۹۱ء

۴۷۔ .....، ''مقالات سرسید''، حصہ نہم، مرتبہ: محمد اسماعیل پانی پتی، مولانا، طبع دوم، لاہور:مجلس ترقی ادب، جون ۱۹۹۲ء

۴۸۔ .....، ''مقالات سرسید''، مرتبہ: محمد اسماعیل پانی پتی، مولانا، حصہ دو از دہم، لاہور: مجلس ترقی ادب، طبع دوم، جون ۱۹۹۳ء

۴۹۔ .....، ''مقالات سرسید''، مرتبہ: محمد اسماعیل پانی پتی، مولانا، حصہ پانزدہم، طبع دوم، لاہور: مجلس ترقی ادب، جون۲۰۰۱ء

۵۰۔ .....، ''مقالات سرسید''، مرتبہ: محمد اسماعیل پانی پتی، مولانا، حصہ پانزدہم، طبع دوم، لاہور: مجلس

ترقی ادب، جون ۲۰۰۱ء

۵۱۔ سجاد حیدر یلدرم، ''انتخاب سجاد حیدر یلدرم''، مرتبہ: (مقدمہ) قرۃ العین حیدر، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۰ء

۵۲۔ سجاد انصاری، ''محشر خیال''، بار سوم، لاہور: آئینہ ادب، ۱۹۷۱ء

۵۳۔ سجاد ظہیر، ''روشنائی''، دوسری بار، لاہور: مکتبہ اردو، جنوری ۱۹۷۶ء

۵۴۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، ''اردو کی مختصر ترین تاریخ (آغاز سے ۲۰۰۰ء تک)'' لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء

۵۵۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، ''انشائیہ کی بنیاد''، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء

۵۶۔ سعدیہ شفقت، پروفیسر، ''ترقی پسند تحریک اور حلقہ ارباب ذوق مماثلتیں اور اختلافات''، لاہور: اظہار سنز، اپریل ۲۰۱۰ء

۵۷۔ شاہد حسین، رزاقی، ''سرسید اور اصلاح معاشرہ''، لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، طبع اول، ۱۹۶۳ء

۵۸۔ شبلی نعمانی ''مقالات شبلی''، جلد سوم، مرتبہ: سلیمان ندوی، سید، مولانا، اعظم گڑھ: مطبع معارف، ۱۹۵۵ء

۵۹۔ شہزاد احمد، مشمولہ ''مقالات حلقہ ارباب ذوق'' مرتبہ: سہیل احمد خان، لاہور: پولیمر پبلی کیشنز، جولائی ۱۹۹۰ء

۶۰۔ شمس الہدیٰ، دریا آبادی، ڈاکٹر، ''ہندوستانی نشاۃ الثانیہ میں قدیم دہلی کالج کا کردار، نئی دہلی: شاہد پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء

۶۱۔ صفیہ بانو، ڈاکٹر، ''انجمن پنجاب تاریخ و خدمات''، کراچی: کفایت اکیڈمی، ۱۹۷۸ء

۶۲۔ صفی مرتضیٰ، سید، ''اردو انشائیہ'' بار دوم، دہلی: انجمن ترقی اردو، ہند، ۱۹۶۹ء

۶۳۔ طارق سعید، ''اسلوب اور اسلوبیات''، لاہور: نگارشات، میاں چیمبرز ۱۹۹۸ء

۶۴۔ طیبہ خاتون، ڈاکٹر، ''اردو میں ادبی تاریخ'' (۱۸۵۷ء تا ۱۹۱۴ء) دہلی: گلی گڑھیا، جامع مسجد، اپریل ۱۹۸۹ء

۶۵۔ ظہور احمد، اعوان، ڈاکٹر، ''نگارشات''، اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۱۹۹۳ء

۶۶۔ عابد علی عابد، سید، ''اصول انتقادیات''، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۷ء

۶۷۔ عابد علی عابد، سید، مشمولہ ''اسلوب اور اسلوبیات''، طارق سعید، لاہور: نگارشات، ٹیمپل روڈ ۱۹۹۸ء

۶۸۔ عبادت بریلوی، ''اقبال کی اردو نثر''، لاہور: مجلس ترقی ادب، نومبر ۱۹۷۷ء

۶۹۔ عبدالرحمٰن، بجنوری، ''باقیات بجنوری''، مرتبہ: محمد فاتح فرخ، دہلی، لکھنو، لاہور، بمبئی: مکتبہ جامعہ ۱۹۴۰ء

۷۰۔ عبدالرحمان، بجنوری، ''مقالات بجنوری''، مرتبہ: اشرف صدیقی خلیل صدیقی، اسلام آباد: ڈاکٹر عبدالرحمٰن ٹرسٹ، بار اول مئی ۲۰۰۴ء

۷۱۔ عبدالحلیم شرر ''مضامین شرر''، حصہ اول و دوم، لاہور: مبارک علی اینڈ سنز، سن ن

۷۲۔ عبدالحق، مولوی، ''مرحوم دہلی کالج''، دوسرا ایڈیشن، دہلی: انجمن ترقی اردو، ہند، ۱۹۴۵ء

۷۳۔ عبدالحق، مولوی، مقدمہ، ''باغ و بہار'' از میر امن، ''مقدمات عبدالحق''، مرتبہ: عبادت بریلوی، ڈاکٹر، پہلا پاکستانی ایڈیشن، لاہور: اردو مرکز، ۱۹۶۴ء

۷۴۔ عبدالاسلام، ''عمومی لسانیات''، کراچی: رائل بک کمپنی، ۱۹۹۳ء

۷۵۔ عبدالعزیز فلک پیما، ''مضامین فلک پیما''، مرتبہ: بشیر احمد، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۶ء

۷۶۔ عبدالعلیم، ڈاکٹر، ''ترقی پسند ادب'' (مرتبین) قمر رئیس، عاشور کاظمی، سید، لاہور: مکتبہ عالیہ، ۱۹۹۴ء

۷۷۔ عبدالغفور، خواجہ، ''طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ''، نئی دہلی: ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، جون ۱۹۸۳ء

۷۸۔ عبداللہ، بٹ، ''مضامین آزاد''، لاہور: قومی کتب خانہ، ریلوے روڈ، ۱۹۴۴ء

۷۹۔ عبداللہ، ڈاکٹر سید، ''سرسید احمد خاں اور ان کے رفقائے کار''، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۴ء

۸۰۔ عبداللہ، ڈاکٹر سید، ''ملا وجہی سے عبدالحق تک''، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ل ۱۹۹۶ء

۸۱۔ شیخ عبدالقادر، مشمولہ، ''مقالات عبدالقادر''، مرتبہ: حنیف شاہد، لاہور: مجلس ترقی ادب، فروری ۱۹۸۶ء

۸۲۔ شیخ عبدالقادر، ''انتخاب مخزن''، ترتیب و تعارف: احمد سلیم، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء

۸۳۔ عبدالماجد، دریا آبادی، مولانا، ''انشائے ماجد یا لطائف ادب''، لاہور: ادارہ علم و عرفان، ۲۰۰۰ء

۸۴۔ عبدالودود، ڈاکٹر، ''اردو نثر میں ادب لطیف''، بار دوم، لکھنو: نسیم بک ڈپو، ۱۹۸۰ء

۸۵۔ عبدالقیوم، ڈاکٹر، ''کلیات نثر حالی''، (جلد اول) مرتبہ: محمد اسماعیل پانی پتی، مولانا، لاہور: مجلس ترقی ادب، دسمبر، ۱۹۶۷ء

۸۶۔ عبدالواحد، معینی، سید، محمد عبداللہ قریشی، (مرتبین) ''مقالات اقبال''، (بار دوم)، لاہور: آئینہ ادب، ۱۹۸۸ء

۸۷۔ عزیز احمد، ''ترقی پسند ادب''، ملتان: کاروان ادب، ۱۹۸۶ء

۸۸۔ علی شاہ، ڈاکٹر، سید، ''ادب اور تنقید''، کراچی: مکتبہ اسلوب، ۱۹۶۲ء

۸۹۔ غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر، مرتبہ: ''نیرنگ خیال''، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۷۲ء

۹۰۔ غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر، مرتبہ: ''مضامین سرسید''، لاہور: مکتبہ خیابان ادب، جنوری ۱۹۶۷ء

۹۱۔ فاروق، چڑیا کوٹی، مولانا، ''مقالات شبلی''، مرتبہ: سلیمان ندوی، سید، اعظم گڑھ: مطبع اعظم گڑھ، ۱۹۳۸ء/ ۱۳۵۷ھ

۹۲۔ فرحت اللہ بیگ، ''کلیات فرحت اللہ بیگ''، (جلد اوّل)، لاہور: الاعجاز پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء

۹۳۔ فوق کریمی، ڈاکٹر، ''سرسید کے سیاسی افکار''، علی گڑھ: کریمی بلڈنگ، مسلم یونیورسٹی، دسمبر ۱۹۸۷

۹۴۔ قمر رئیس، عاشور کاظمی، سید، (مرتبین)، ''ترقی پسند ادب''، لاہور: مکتبہ عالیہ، ۱۹۹۴ء

۹۵۔ گارساں دتاسی، ''ہندوستانی اخبار نویسی''، (کمپنی کے عہد میں) محمد عتیق صدیقی، علی گڑھ: انجمن ترقی اردو، ہند، دسمبر ۱۹۵۷ء

۹۶۔ سجاد باقر رضوی، ''مغرب کے تنقیدی اصول''، لاہور: اظہار سنز، طبع دوم، اکتوبر ۱۹۷۱ء

۹۷۔ لیاقت علی، چوہدری، پروفیسر، ''اقبال کی لغوی و لسانی بحثیں''، وزیرآباد: اسد بشارت پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء

۹۸۔ ممتاز منگلوری، ''تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند''، جلد ہشتم (۱۸۵۷ء تا ۱۸۰۳ء) لاہور: جامعہ پنجاب، ۱۹۷۱ء

۹۹۔ ملا رموزی، نکات رموزی (حصہ دوم)، لاہور: دارالاشاعت، ۱۹۶۹ء

۱۰۰۔ محمد اسحاق، ''رسالہ جامعہ کی علمی خدمات''، مشمولہ ''اُردو زبان کے فروغ میں جامعہ ملیہ کا حصہ''، مرتبہ: صغریٰ مہدی، دہلی: مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، پہلی اکتوبر ۱۹۹۷ء

۱۰۱۔ مجیب احمد خان، ''حجاب امتیاز علی حیات اور کارنامے''، نئی دہلی: تخلیق کار پبلشرز، ۱۹۹۶ء

۱۰۲۔ محمد حسین آزاد، مولانا، ''نیرنگ خیال''، مرتبہ: غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، طبع ثانی، ۱۹۷۲ء

۱۰۳۔ محمد حسین آزاد، مولانا، ''مقالات آزاد''، مرتبہ: آغا محمد باقر، لاہور: مجلس ترقی ادب، فروری ۱۹۶۶ء

۱۰۴۔ محمد حسن، ڈاکٹر، ''اردو میں رومانوی تحریک''، ملتان: کاروان ادب، ۱۹۸۶ء

۱۰۵۔ محمد سعید مرزا، ''مقالات مرزا محمد سعید''، مرتبہ: شیما مجید، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۲ء

۱۰۶۔ محمد شفیع، مولانا، ''مقالات محمد شفیع''، (جلد اول)، مرتبہ: احمد ربانی، طبع دوم، لاہور: مجلس ترقی ادب،

اپریل ۲۰۰۷ء

۱۰۷۔ محمد فرمان، پروفیسر، ''تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند''، لاہور: پنجاب یونیورسٹی، فروری ۱۹۷۲ء

۱۰۸۔ محمود اسیر، احمد، ڈاکٹر، ''مولانا صلاح الدین احمد احوال و آثار''، لاہور: مجلس ترقی ادب، جنوری ۲۰۰۹ء

۱۰۹۔ محمود شیرانی، حافظ، مرتبہ: مظہر محمود، شیرانی، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۵ء

۱۱۰۔ مسکین علی، حجازی، ڈاکٹر، ''پنجاب میں اُردو صحافت کی تاریخ''، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۷۷ء

۱۱۱۔ مہدی افادی، سید، ''افادات مہدی''، علی گڑھ: سرسید بک ڈپو، ۱۹۵۸ء

۱۱۲۔ ناظمہ، نقوی، ''فکری زاویے''، لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء

۱۱۳۔ ناصر علی، میر، ''مقالات ناصری''، مرتبہ: انصار ناصری، کراچی: انجمن ترقی اردو، پاکستان ۱۹۶۹ء

۱۱۴۔ نیاز فتح پوری، علامہ، ''انتقادیات''، لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء

۱۱۵۔ سجاد باقر رضوی، ''مغرب کے تنقیدی اصول''، لاہور: اظہار سنز، طبع دوم، اکتوبر ۱۹۷۱ء

۱۱۶۔ یونس جاوید، ڈاکٹر، ''حلقۂ ارباب ذوق''، لاہور: مجلس ترقی ادب، جنوری ۱۹۸۴ء

رسائل

۱۔ آج کل، دہلی، جلد، نمبر ندارد، اگست ۱۹۶۷ء

۲۔ اردوئے معلی، علی گڑھ، جلد ۱، نمبر ۵، نومبر ۱۹۰۳ء

۳۔ اردوئے معلی، علی گڑھ، جلد ۲، نمبر ۶، فروری ۱۹۰۴ء

۴۔ اردوئے معلی، علی گڑھ، جلد ۲، نمبر ۳، مارچ ۱۹۰۴ء

۵۔ اردوئے معلی، علی گڑھ، جلد ۳، نمبر ۶، دسمبر ۱۹۰۴ء

۶۔ اردوئے معلی، علی گڑھ، جلد ۷، نمبر ۶، جون ۱۹۰۷ء

۷۔ ادب لطیف، لاہور، جلد ۱، نمبر ۳، مئی ۱۹۳۵ء

۸۔ ادب لطیف، لاہور، جلد ۱، نمبر ۴، جون ۱۹۳۵ء

۹۔ ادب لطیف، لاہور، جلد ۷، نمبر ۵، جولائی ۱۹۳۸ء

۱۰۔ ادب لطیف، لاہور، جلد ۱، نمبر ۷، مارچ ۱۹۴۰ء

۱۱۔ ادب لطیف، لاہور، جلد ۱۰، نمبر ۱۰، جولائی ۱۹۴۰ء

۱۲۔ ادب لطیف، لاہور، جلد ۱۰، نمبر ۱، ستمبر ۱۹۴۰ء

۱۳۔ ادب لطیف، لاہور، جلد ۱۳، شمارہ ۲، نومبر ۱۹۴۴ء

۱۴۔ ادب لطیف، لاہور، جلد ۲۴، شمارہ ۶، ۱، ۲، سالنامہ، ۱۹۴۷ء

۱۵۔ ادبی دنیا، لاہور، جلد ۱، نمبر ۱، مئی ۱۹۲۹ء

۱۶۔ ادبی دنیا، لاہور، جلد ۱۷، نمبر ۷، جولائی ۱۹۳۹ء

۱۷۔ ادبی دنیا، لاہور، سالنامہ، جلد، نمبر ندارد، جنوری ۱۹۴۱ء

۱۸۔ ادبی دنیا، لاہور، جلد ۱۹، نمبر ۴، اپریل ۱۹۴۱ء

۱۹۔ الناظر، لکھنؤ، جلد ۱، نمبر ۱، جولائی ۱۹۰۹ء

۲۰۔ الناظر، لکھنؤ، جلد ۱، نمبر ۳، ستمبر ۱۹۰۹ء

۲۱۔ الناظر، لکھنؤ، جلد ۲، نمبر ۱۱، مئی ۱۹۱۰ء

۲۲۔ الناظر، لکھنؤ، جلد ۲، نمبر ۱۱، مئی ۱۹۱۲ء

۲۳۔ الناظر، لکھنؤ، جلد ۲۹، نمبر ۱۷۰، اگست ۱۹۲۵ء

۲۴۔ الناظر، لکھنؤ، جلد ۳۷، نمبر ۳، مارچ ۱۹۳۰ء

۲۵۔ اورینٹل کالج میگزین، لاہور، جلد ۱، عدد ۱، فروری ۱۹۲۵ء

۲۶۔ اورینٹل کالج میگزین، لاہور، جلد ۲، عدد ۴، اگست ۱۹۲۶ء

۲۷۔ اورینٹل کالج میگزین، لاہور، جلد ۸، عدد ۴، اگست ۱۹۳۲ء

۲۸۔ اورینٹل کالج میگزین، لاہور، جلد ۱۷، عدد ۱، نومبر ۱۹۴۰ء

۲۹۔ اورینٹل کالج میگزین، لاہور، جلد و عدد ندارد، جنوری ۱۹۴۷ء

۳۰۔ رسالہ اُردو، اورنگ آباد دکن، جلد ششم، حصہ بست و چہارم، اکتوبر ۱۹۲۶ء

۳۱۔ رسالہ اُردو، دہلی، جلد ۱۸، حصہ ۷، اپریل ۱۹۳۸ء

۳۲۔ جامعہ، دہلی، جلد ۷، نمبر ۲، اگست ۱۹۲۶ء

۳۳۔ جامعہ، دہلی، جلد ۲، نمبر ۴، اپریل ۱۹۲۹ء

۳۴۔ جامعہ، دہلی، جلد ۱۳، نمبر ۲، اگست ۱۹۲۹ء

۳۵۔ جامعہ، دہلی، جلد ۲۴، نمبر ۱۱، نومبر ۱۹۳۵ء

۳۶۔ جامعہ، دہلی، جلد ۲۹، نمبر ۶، جون ۱۹۳۸ء

۳۷۔ جامعہ، دہلی، جلد ۳۶، نمبر ۱، جنوری ۱۹۴۲ء

۳۸۔ دلی کالج میگزین، دہلی، قدیم کالج نمبر، ۱۹۵۳ء

۳۹۔ زمانہ، کانپور، جلد ۶۷، نمبر ۳، سن ندارد

۴۰۔ زمانہ، کانپور، جلد ۵۰، نمبر ۲، فروری ۱۹۲۸ء

۴۱۔ زمانہ، کانپور، جلد ۴۰، نمبر ۱۲، دسمبر ۱۹۳۳ء

۴۲۔ ساقی، دہلی، جلد ۱، نمبر ۱، جنوری ۱۹۳۰ء

۴۳۔ ساقی، دہلی، جلد ۱، نمبر ۹، ستمبر و اکتوبر ۱۹۳۰ء

۴۴۔ ساقی، دہلی، جلد ۱، نمبر ۴، اپریل ۱۹۳۴ء

۴۵۔ ساقی، دہلی، جلد، نمبر ندارد، جنوری ۱۹۳۵ء

۴۶۔ ساقی، دہلی، جلد، نمبر ندارد، سالنامہ، ۱۹۳۵ء

۴۷۔ ساقی، دہلی، جلد ۱۵، نمبر ۱، جنوری ۱۹۳۷ء

۴۸۔ ساقی، دہلی، جلد ۲۴، نمبر ۲، اگست ۱۹۴۱ء

۴۹۔ ساقی، دہلی، جلد ۲۶، نمبر ۲، اگست ۱۹۴۲ء

۵۰۔ ساقی، دہلی، جلد ۲۵، نمبر ۳، ستمبر ۱۹۴۲ء

۵۱۔ ساقی، دہلی، جلد ۲۵، نمبر ۳، ستمبر ۱۹۴۲ء

۵۲۔ ساقی، دہلی، جلد ۳۳، نمبر ۶، جون ۱۹۴۶ء

۵۳۔ شبابِ اُردو، لاہور، جلد ۹، نمبر ۳، جون ۱۹۲۴ء

۵۴۔ شبابِ اُردو، لاہور، جلد ۹، نمبر ۴، جولائی ۱۹۲۴ء

۵۵۔ شبابِ اُردو، لاہور، جلد دہم، نمبر ۲، نومبر ۱۹۲۴ء

۵۶۔ شبابِ اُردو، لاہور، جلد دہم، نمبر ۲، نومبر ۱۹۲۴ء

۵۷۔ شبابِ اُردو، لاہور، جلد سیزدہم، نمبر سوم، جون ۱۹۲۶ء

۵۸۔ شبابِ اُردو، لاہور، جلد ۱۵، نمبر ۲۵، اگست، ستمبر ۱۹۲۷ء

۵۹۔ شبابِ اُردو، لاہور، جلد پانزدہم، نمبر ۵۔ ۶، اگست و ستمبر ۱۹۲۸ء

۶۰۔ شبابِ اُردو، لاہور، جلد ۱۹، نمبر ۶، مارچ ۱۹۳۰ء

۶۱۔ شبابِ اُردو، لاہور، جلد ۱۰، نمبر اوّل، اکتوبر ۱۹۳۰ء

۶۲۔ قومی زبان، کراچی، شمارہ ۷، ۲۰۱۰ء

۶۳۔ کہکشاں، لاہور، جلد ۴، نمبر ۱، جنوری ۱۹۲۰ء

۶۴۔ کہکشاں، لاہور، جلد ۴، نمبر ۱، جنوری ۱۹۲۰ء

۶۵۔ کہکشاں، لاہور، جلد ۴، نمبر ۱، جنوری ۱۹۲۰ء



۶۶۔ مخزن، لاہور، جلد ۱، نمبر ۶، ستمبر ۱۹۰۱ء

۶۷۔ مخزن، لاہور، جلد ۸، نمبر ۴، جنوری ۱۹۰۵ء

۶۸۔ مخزن، لاہور، جلد ۷، نمبر ندارد، فروری ۱۹۰۷ء

۶۹۔ معارف، اعظم گڑھ، جلد ۱ نمبر ۱، جولائی ۱۹۱۶ء

۷۰۔ معارف، اعظم گڑھ، جلد ۱ نمبر ۱، جولائی ۱۹۱۶ء

۷۱۔ معارف، اعظم گڑھ، جلد ۱ نمبر ۱، جولائی ۱۹۱۶ء

۷۲۔ نگار، آگرہ، جلد ۱، شمارہ ۱، فروری، ۱۹۲۲ء

۷۳۔ نگار، آگرہ، جلد ۱، شمارہ ۱، فروری، ۱۹۲۲ء

۷۴۔ نگار، آگرہ، جلد ۱، شمارہ ۳، اپریل، ۱۹۲۲ء

۷۵۔ نگار، آگرہ، جلد ۱، شمارہ ۷، اگست ۱۹۲۲ء

۷۶۔ نگار، آگرہ، جلد ۵۲، شمارہ ۵، نومبر، ۱۹۴۷ء

۷۷۔ نقوش، لاہور، شمارہ ۷۲، ۷۱، جنوری ۱۹۵۹ء

۷۸۔ نقوش، لاہور، شمارہ ۱۰۴، جنوری ۱۹۶۶ء

۷۹۔ نیرنگ خیال، لاہور، جلد ۱، نمبر ۱، جولائی ۱۹۲۴ء

۸۰۔ نیرنگ خیال، لاہور، سالنامہ، جلد ۲، نمبر ۸، فروری ۱۹۲۵ء

۸۱۔ نیرنگ خیال، لاہور، جلد ۸، نمبر ۴۶، ۴۵، اپریل، مئی ۱۹۲۸ء

۸۲۔ نیرنگ خیال، لاہور، جلد ۹، نمبر ۶۳، ستمبر ۱۹۲۹ء

۸۳۔ نیرنگ خیال، لاہور، جلد، نمبر ندارد، فروری، مارچ ۱۹۳۰ء

۸۴۔ نیرنگ خیال، لاہور، جلد، نمبر ندارد، فروری، مارچ ۱۹۳۰ء

۸۵۔ نیرنگ خیال، لاہور، جلد ۱۳، نمبر ۱۰۳، جنوری ۱۹۳۳ء

۸۶۔ نیرنگ خیال، لاہور، جلد ۱۳، نمبر ۱۱۱، ستمبر ۱۹۳۳ء

۸۷۔ نیرنگ خیال، لاہور، جلد ۱۹، نمبر ۱۱۳، نومبر ۱۹۳۳ء

۸۸۔ نیرنگ خیال، لاہور، سالنامہ، جلد ۳۶، شمارہ ۱، جنوری ۱۹۴۲ء

۸۹۔ ہمایوں، لاہور، جلد ۱، نمبر ۱، جنوری ۱۹۲۲ء

۹۰۔ ہمایوں، لاہور، جلد ۱، نمبر ۱، جنوری ۱۹۲۲ء

۹۱۔ ہمایوں، لاہور، جلد ۹، نمبر ۶، دسمبر ۱۹۲۵ء

۹۲۔ ہمایوں، لاہور، جلد ۱۸، نمبر ۶، دسمبر ۱۹۳۰ء

غیر مطبوعہ مقالہ

۱۔ روشن آراء راؤ، ''ادبیاتِ اُردو کے ارتقاء میں رسائل کا کردار''، پی ایچ۔ ڈی پنجاب یونیورسٹی، اورینٹل کالج، لاہور، سن ندارد

۲۔ قدسیہ کریم، ''مخزن ایک تحقیقی جائزہ'' (ابتدائی دس سالوں کی تلخیص) مقالہ، اورنٹیل کالج، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۷۰ء

ٹیلی ویژن پروگرام

۱۔ سنڈے برنچ، پاکستان ٹیلی ویژن، لاہور، ۷ نومبر ۲۰۱۰ء

English Books

1- Benson, A-b, "Several Essays", Edited by, G.F.J, Camberige, Oxford University Press, Seventh impression, 1963, Page:1

2- Athur Compion Rickett, "A History of Litrature", London, Thomas Nelson and Sons, L.T.D, 1956, Page: 292

3- Block & Trager, Jhon lysons "Language and Linguistics", London, Cambridge University Press Cambridge, 1981, Page:4

4- Cynthia Ozick, "The best American Essays", Edited, Robert Atwan, Boston, New York, Houghton, Miffin Company, 2008, Page:26

5- Ezra Pound, "ABC of Reding", Faber and faber 24 Russel Square London, Year not Shown, Page: 28

6- George Steiner "Language and Silence", Essays 1958- 1966, London, Boston, Faber and faber, 1985, Page: 352

7- Henry Sweet, "The Practical Study of Language" London, Oxford University, Press, 1989, Page: 4

8- Jennifer Uglow, Walther Pater, "Essay on Literature and Art", Edited by Jennifer Uglow, Rowman and Littlefild, 1973, Page: 71

9- Martin Travers, "Eurpeon Literature from Romanticism of Past Modrnism", London, New York, Contiunom, 2001, Page: 12

10- Peter, J. Kiston, "English Literatures in context", New York, Cambridge Press, 2008, Page: 329

11- Paul Davies, "Romanticism & Exoteric Tradiation", Hudson, United State, Lindis Farne Books, 1998, Page: 18

12- Roger Flower, "Essay On Style and Language", Roultedge and Kegan Paul London and henely, Reprinted in 1981, Page: 3

13- Wallace Stevens, "Essay on Reality and Imagination" London, Boston, Faber and Faber 1960, Page: 138

14- Walter Peter, "essays on Literature and Art" Edited by Jennifer Uglow, rowman and Little Fild, 1973, Page: 69

15- William Hazlit, "Romantic Critical Essays" Edited by David Bromwick, Cambridge University Press, New Rochelle, Melbourne Sydney, 1987, Page:96

16- "Defination of Essay", The Encyelopedia Americana", Volume, 10, Danbury, Grolier Incorporated, 1980, Page:

"English Magazine"

1- Mohammad Muzaffar Mirza, Prof, "Allma Iqbal as a Politician", Journal, Iqbal, Jan, Dec, 2009, Volum 56, N. 1-4 Bazam I- Iqbal, Lahore, Page: 12

2- Mahbud Murshid, Syed (Late) "The Pebbled Shore" Journal Iqbal Bazama Iqbal, Jan, Dec, 2009, Lahore, Page: 26

Encyclopedia

1- The Encyclopaedia Americanna, Grolier in Corporated volume, 10 1980.

Webliography

1- Mrs. Rubina Kamran, Thesis, "The teaching of stylistics at the Post-Graduate, Level in Pakistan Universities", The National University of modren Lanuages Islamabad, Pakistan, May 2001.